U13353 5-12-?

Title - KHUTBAAT-E-ALIYA ; YAANI ALL INDIA MUSLIM EDUCATIONAL CONFERENCE ALIGARH KE CHEHEL SAALA KHUTBAAT SADARAT KA MAJMUA (Part-3).

Creator - Murattibe Anwaar Ahmad Zuberi.

Publisher - Muslim University Press (Aligarh).

Date - 1927-1928.

Pages - 282

Subjects - Khutbaat-o-Taqarees - All India Educational conference Aligarh; Muslim Educational conference Aligarh - Khutbaat.

فیہا کتب قیمۃ

خطباتِ عالیہ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے
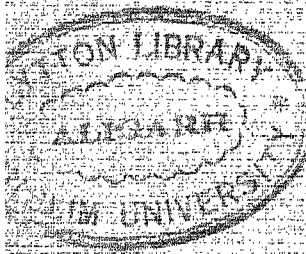
چہل سالہ خطباتِ صدارت کا مجموعہ

حصّۂ سوم

(از اجلاس سی و یکم ۳۱ تا اجلاس چہلم)

جس میں ہر معزز صدر کے قابلِ مطالعہ و سبق آموز حالاتِ زندگی مع فوٹو کے چھاپے گئے ہیں

مُرتّبۂ

مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی)

حسب الارشاد جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئے ۱۹۲۸ء ۱۳۴۷ھ

(صدر دفتر کانفرنس نے شائع کیے)

(اوّل) ۱۰۰۰ جلد

یعنے

فنِ تعلیم و تربیت کے متعلق انگریزی کی ایک مختصر لیکن نہایت مفید کارآمد اور دلچسپ کتاب کا ترجمہ اساتذہ و والدین دونوں کے لیئے اس کا مطالعہ ضروری ہے یہ رسالہ ۶۴ صفحہ کا ہے اور ابھی حال میں کانفرنس نے ترجمہ کرا کر شائع کیا ہے ۔ اولاد کی تعلیم کا معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تمام خاندانوں کی آئندہ ترقی اسی پر منحصر ہے ۔ اس لیئے کسی شخص کو ایسے اہم مقصد پر چار آنے خرچ کرنے میں تامل نہ ہوگا ۔ جب آپ اس رسالہ کو غور سے پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ صرف چار آنے خرچ کرکے آپ نے کس قدر معلومات و تجربہ حاصل کیا ۔ خود بھی خریدیئے اور صاحب اولاد احباب کو بھی خریداری کی ترغیب دیجئے ۔

تاریخ التعلیم

مصنفہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم اے ڈی ایس سی پی ایچ ڈی سی آئی ای
سابق پرو وایس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اس رسالہ میں فنِ تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ نہایت سلیس و شگفتہ عبارت میں بیان کی گئی ہے ۔ اور مختلف اوقات میں ماہرین فنِ تعلیم نے جو تعلیمی اصول قائم کیئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں مختلف ممالک و اقوام کے اصولِ تعلیم میں واقع ہوئیں ان کو نہایت حسن و خوبی سے بیان کیا ہے ۔ جملہ اصحاب جو فنِ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں ۔ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۱۲۴ صفحے
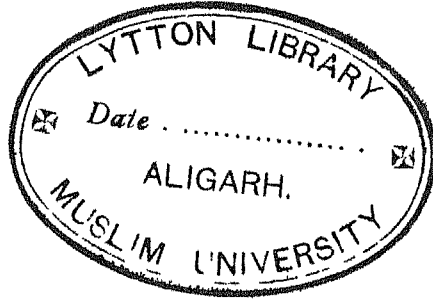
قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ :- صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ
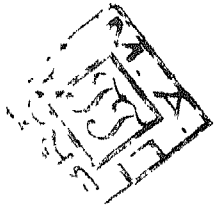
خطباتِ عالیہ

حصہ سوم

(از اجلاس سی ویکم منعقدہ کلکتہ ۱۹۱۷ء تا اجلاس چہلم منعقدہ مدراس ۱۹۲۷ء)
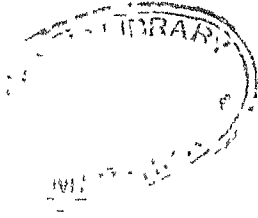
فہرست مضامین

(حالات، خطبات، تصاویر)

(خطبات عالیہ کی اس تیسری جلد میں حسب ذیل بزرگوں کے حالات، خطبات، اور عکسی تصاویر موجود ہیں)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُقَدَّمہ

نوشتۂ مولوی محمد اکرام اللہ خان صاحب ندوی

موجودہ زمانہ میں جب کہ انگریزی تعلیم ہندوستان میں سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے، ہزاروں اسکول اور کالج قایم ہیں اور یونی ورسٹیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اس زمانہ کی حالت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب کہ آپ سے پچاس برس پہلے مسلمان نہ صرف انگریزی تعلیم سے ناآشنا تھے بلکہ اس کے سخت مخالف تھے چنانچہ سرسید مرحوم نے جب اپنی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا تو عام طور پر مسلمانوں کے ہر طبقہ نے اِن کی مخالفت میں آواز بلند کی اور بجز چند افراد کے جو اُن کے ہم آہنگ تھے عام مسلمانوں کی طرف سے سرسید کی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔ لیکن باوجود شدید مخالفت کے سرسید اور اُن کے رفقائے کار استقلال اور مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ مسلسل پچاس برس

کی جد وجہد کے بعد فضا میں اس قدر تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اب کوئی آواز جدید تعلیم کی مخالفت میں بلند نہیں ہوتی۔ اور اگر ہو بھی تو کوئی شخص اس آواز پر لبیک کہنے کے لیئے آمادہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان اپنے ضرب المثل افلاس، تعلیم کی گرانی اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر اب بھی بہ نسبت غیر مسلم اقوام کے جدید تعلیم میں پس ماندہ ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ جدید تعلیم کے مخالف ہیں یا اس کی ضرورت سے انھیں انکار ہے۔ سر سید نے اس مخالفت کے طوفان کا جس طریقہ سے مقابلہ کیا اور آخر کار جن ذرائع سے کامیابی حاصل کی، اس موقع پر اختصار کے ساتھ اس کا تذکرہ کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا۔

(۱) جب سر سید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان مذہبی حیثیت سے انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں اور اُن کا یہ عام خیال ہے کہ ایک غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہبًا جائز نہیں، تو اُنھوں نے مضامین، خطبات، مستقل رسائل، اور اپنے مشہور ماہانہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اوہام وخیالات کی تردید کی اور بتایا کہ مذہب علوم جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے تاریخی حیثیت سے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج وکمال میں غیر قوموں کے علوم سیکھے بلکہ اُن میں خاص فضل وکمال حاصل کیا۔ سر سید کے ان پُرزور مضامین نے اُن کے بہت سے حامی ومددگار پیدا کر دیئے۔ جو اپنے عالمانہ

مضامین اور تصنیفات و خطبات کے ذریعہ سے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرتے رہے یہاں تک کہ مخالفت کا وہ طوفان ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اب لوگوں کو سرسید اور اُن کے احباب کے خیالات سے وہ نفرت نہیں رہی جو پہلے تھی۔

(۲) چونکہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں مُسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیئے مسلمانوں کو عام طور پر انگریزی تعلیم سے وحشت تھی۔ وہ خیال کرتے تھے کہ مذہبی تعلیم نہ حاصل کرنے سے اُن کے بچے اسلام سے بیگانہ ہو جائینگے۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال کچھ بے جا نہ تھا اس لیئے سرسید نے یہ تجویز کیا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کے لیئے اپنی مخصوص درس گاہیں قایم کریں۔ جو خود مسلمانوں کی نگرانی و انتظام کے ماتحت ہوں اور اُن درس گاہوں میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جائے چنانچہ چند سال کی سعی و کوشش کے بعد سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ شیعہ و سُنّی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیئے علحدہ علحدہ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نصابِ تعلیم تجویز ہوا۔ نماز کے لیئے مسجد تعمیر کی گئی۔ اور اخلاقی نگرانی کے لیئے اتالیق و نگراں مقرر کیئے گئے ان انتظامات سے مسلمانوں کو ایک حد تک اطمینان ہوا، اور وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیئے اس کالج میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔

(۳) باوجود مندرجۂ بالا تدابیر کے ابھی مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت ہندوستان میں ایسی موجود تھی جو یا تو سرسید کی تحریک سے قطعاً ناآشنا تھی یا اُن کے مخالف تھی۔ اِس لیئے کالج قایم کرنے کے دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں سرسید نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کوئی مفید تحریک اُس وقت تک سرسبز و کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک مسلمانوں میں ایک مستقل و مضبوط جماعت ایسی نہ موجود ہو گی تا اس تحریک کے متعلق تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دیتی رہے۔ بلکہ ملک کے مختلف صوبوں میں دورہ کر کے اور لوگوں کو جمع کر کے اپنے خیالات اُن کو سنائے۔ سرسید کے اِس تخیل کا نتیجہ وہ مشہور و معروف انجمن ہے جس کا نام مختلف تبدیلیوں کے بعد آج کل آل انڈیا مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے اور جس کا صدر دفتر مُسلم یونی ورسٹی کے پہلو میں بمقام علی گڑھ قایم ہے۔ اس موقع پر کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی تفصیل بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ گزشتہ چالیس سال میں کانفرنس نے اپنے مقاصد کے متعلق اس قدر کثرت سے لٹریچر شائع کیا ہے اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر اتنے اجلاس منعقد کیئے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا مسلمان نہ صرف کانفرنس کے نام سے واقف ہو چکا ہے بلکہ اجمالی طور پر اس کے اغراض و مقاصد سے بھی باخبر ہے۔

کانفرنس مسلمانوں کی سب سے پہلی باقاعدہ انجمن ہی جو ایک خاص قانون اور دستورالعمل کے ماتحت کام کرتی ہی اور موجودہ تہذیب وتمدّن نے قومی مجالس کے متعلق جو تہذیب وضابطہ لازم قرار دیا ہی اُس کی پابند ہی۔ یہ کانفرنس ہر سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں اپنا اجلاس ہندوستان کے کسی خاص شہر میں منعقد کرتی ہی جو اکثر تین روز تک رہتا ہی۔ اجلاس کی رہ نمائی کے لئے پہلے سے ایک صدر کا انتخاب ہوتا ہی۔ صدر اجلاس کے نظم کو باقاعدہ قایم رکھنے کے علاوہ اپنا خطبۂ صدارت بھی پڑھتا ہی جو عموماً لکھا ہوا ہوتا ہی۔ چوں کہ صدارت کے لیئے اکثر ملک کے قابل وممتاز اصحاب کا انتخاب ہوتا ہی جو علاوہ تعلیم یافتہ ہونے کے اپنی قوم کی حالت کے متعلق وسیع تجربہ رکھتے ہیں (بلکہ پہلے سے قومی خدمت میں مصروف ہوتے ہیں) اِس بنا پر وہ اپنا خطبۂ صدارت خاص توجّہ اور محنت سے تیار کرتے ہیں اور اپنے تجربہ و وسیع معلومات کے لحاظ سے جن چیزوں کو مسلمانوں کے لیئے مفید سمجھتے ہیں بیان کرتے ہیں۔ اس لیئے یہ خیالات و افکار درحقیقت اس لائق ہیں کہ قوم ان پر عمل کرے اور آیندہ نسلوں کے لیئے اُن کو محفوظ رکھے۔ گزشتہ چہل سالہ مدّت میں کانفرنس کے اُنتالیس اجلاس ہندوستان کے مختلف صوبہ جات میں منعقد ہوئے اور ہر اجلاس کی رپورٹ سال بہ سال شایع ہوتی رہی جن میں یہ خطباتِ صدارت بھی شامل تھے۔ لیکن آج یہ رپورٹیں ناپید ہیں۔

اِس لیئے اگر کسی شخص کو ان خطبات کے پڑھنے کا شوق بھی ہو تو اُن کا مُہیا کرنا ممکن نہیں۔ البتہ کانفرنس کے صدر دفتر میں ایک ایک جلد محفوظ ہے۔ لیکن اس سے ہر شخص مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے کانفرنس کا یہ کارنامہ لایق تحسین و ستایش ہے کہ اُس نے اِن پراگندہ خطبات کو ایک جا کر کے شایع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

جو اصحاب ابتدا سے کانفرنس کے شریک و مددگار رہیں اُنھوں نے آہستہ آہستہ چالیس سال میں یہ خطبات سُنے ہیں اور اس طرح سے سنے ہیں کہ ان کے لیئے سفر کی زحمتیں اُٹھائی ہیں، روپیہ صرف کیا ہے، اور بسا اوقات آرام و راحت کی قربانی بھی کی ہے۔ لیکن خطباتِ عالیہ کے ناظرین خوش نصیب ہیں کہ جو داستان دوسروں نے چالیس سال میں بصرفِ دولت و راحت سُنی وہ آج مکمل صورت میں اُن کے سامنے موجود ہے جس کو وہ چند گھنٹے میں اِس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ نہ سفر کی ضرورت ہے نہ صرفِ زر کی حاجت۔

قوم میں ہر خیال کے لوگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے بعض اشخاص ایسے بھی ہوں جن کے نزدیک کانفرنس کی یہ خدمت مفید و لایق ستایش نہ ہو اور اُن کے خیال میں اس داستانِ کہن و افسانہ پارینہ کا شایع کرنا تحصیل حاصل سمجھا جائے۔ لیکن یہ غنیمت ہے کہ ملک میں اہلِ نظر بھی ہیں جو اِس کام کی اہمیت بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مختلف حیثیات سے یہ مجموعہ نہایت مفید و دلچسپ ہے۔ اجمالاً بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) اس کتاب کے چالیس ابواب (خطبات) ہیں۔ لیکن ان ابواب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ چالیس سال میں لکھے گئے۔ چالیس اصحاب نے تصنیف کیے اور شایع کرنے سے پہلے ہندوستان کے مختلف چالیس موقعوں پر سنائے۔ ہزاروں سامعین دور و دراز مقامات کا سفر کر کے آئے تاکہ خود مصنفین کی زبان سے سنیں۔ اخبارات نے ان کو شایع کیا، اور ہندوستان کے ہر گوشہ گوشہ تک پہونچایا۔ اور آخر کار چالیس سال بعد یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ کیا یہ خصوصیت اُردو کی کسی اور کتاب کو بھی حاصل ہے؟

(۲) عام طور پر ہر کتاب زبان و طرز ادا کے لحاظ سے ابتدا سے انتہا تک ایک شان رکھتی ہے۔ اگر مصنّف صاحبِ ذوق ہے اور اُس کو زبان پر قدرت حاصل ہے تو اُس کی کتاب اپنے عہد کی زبان کا بہتر نمونہ ہوتی ہے۔ لیکن خطباتِ عالیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ زبان کے لحاظ سے اس کا ایک باب دوسرے سے مختلف ہے۔ چوں کہ اس کی ترتیب و تکمیل چالیس سال میں انجام پزیر ہوئی ہے، لہذا زبان میں تدریجاً جو انقلابات و تبدیلیاں ہوتی رہیں اور طریقۂ ادا، طرزِ استدلال،

اسلوب بیان، اور ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے زبان میں جو ترقی ہوئی اُن سب کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔ ابتدائی خطبات مختصر اور سادہ ہیں۔ اُن میں مضامین کی کوئی خاص ترتیب یا تقسیم نہیں، نہ مختلف تعلیمی مسائل پر بحث ہے۔ بلکہ سادہ زبان میں کانفرنس کی ضرورت کا اظہار کر کے مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسی ذیل میں کہیں کہیں اُن نکتہ چیں اشخاص کا جواب بھی ہے جو کانفرنس اور انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں۔ زبان میں مغربیت کا اثر مطلق نہیں پایا جاتا۔ البتہ وہ سادہ طرزِ بیان ضرور موجود ہے جو سرسید نے واقعات و مسائل کے بیان کے لیئے اختیار کیا تھا۔ ابتدا میں لوگ زیادہ تر سرسید نوّاب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لکچر یا کلام سُننے کے لیئے آتے تھے۔ خطبۂ صدارت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ صدر قاعدہ کے مطابق اجلاس کا نظم قایم رکھتا۔ مگر سرسید کی زبردست شخصیت سے مرعوب ہو کر اُن کی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا۔ لیکن جب چند سال بعد آہستہ آہستہ اس کانفرنس نے مستقل و مضبوط حیثیت اختیار کر لی، اور تعلیمی کام کے تجربہ کی بدولت بہت سے مسائل بحث و نظر کے لیئے سامنے آ گئے تو خطبۂ صدارت

نے بھی ایک خاص حیثیت اختیار کرلی۔ اب صدر کا کام صرف اجلاس کے طریقۂ کار کی رہ نمائی کرنا نہ تھا۔ بلکہ لوگ اُس سے یہ توقع بھی کرتے تھے کہ وہ موجودہ تعلیمی مسائل اور زیرِ بحث مضامین پر مسلمانوں کو اپنے تجربہ و خیالات سے فائدہ پہونچائے گا۔ اُن کی تمام ضرورتوں کے متعلق مفید تدابیر بتا کر اپنی قابلیت کا ثبوت دیگا۔ کانفرنس کے سات ابتدائی اجلاس خطبۂ صدارت کے لحاظ سے کچھ ممتاز نہیں ہیں۔ لیکن ۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اور **نواب محسن الملک** صدر منتخب ہوئے تو خطبۂ صدارت میں ایک خاص وسعت و شان پیدا ہو گئی۔ یہ سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوشش پایا جاتا ہے اور انشا پردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینوں کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

"مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا۔ مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیئے یہ بتا دیں کہ انھوں نے

اپنی قوم کے لیئے کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے
بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے
لیئے دیر و کنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمائیے کہ اُن کا
بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جاکر ہم سجدہ کریں؟
اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم
کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا، مگر ہمارے
دوست براہِ مہربانی یہ فرماویں کہ اُنھوں نے قوم کے حال
پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مُصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی
مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جاکر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟
ہم اگر مُضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار رہیں تو قوم کو
مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے؎

گردِ سرِ تو گشتن و مُردن گناہِ من
دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہِ کیست
گیرم کہ وقتِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

غرض نواب صاحب کی صدارت کے بعد خطبۂ صدارت آہستہ آہستہ
وسعت و جامعیت اختیار کرتا گیا۔ جدید مباحث پیدا ہو گئے۔

انگریزی زبان کے اثر سے اُردو کے ذخیرۂ مفردات و مُصطلحات میں اضافہ ہوتا گیا۔ طریقہ استدلال اور طرز ادا میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ آج اگر ان خطبات کو مُسلسل طریقہ پر پڑھا جائے تو زبان کے یہ تمام ارتقائی مدارج صاف طور پر نظر آتے ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان نے گزشتہ چالیس سال میں اسالیب بیان اور ذخیرۂ الفاظ کی حیثیت سے کس قدر ترقی کی اور مغربی تعلیم کا خیالات و زبان پر کیا اثر پڑا۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی یہ خطبات ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں جو کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

۲) قدامت اور امتداد زمانہ نے ان خطبات میں ایک تاریخی حیثیت بھی پیدا کر دی ہے۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا تعلق ہے یہ خطبات تمام تعلیمی مباحث پر حاوی ہیں۔ اگر بحث کا کوئی پہلو ایک خطبہ میں رہ گیا ہے تو دوسرے میں موجود ہے۔ اِن خطبات سے مسلمانوں کی گزشتہ چہل سالہ تعلیمی تاریخ اجمالی طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً ابتدا میں جب مسلمان جدید تعلیم کے مخالف ہیں تو تعلیم کے جواز اور اُس کی ضرورت پر عقلی و نقلی دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مُسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلیم کے متعلق بہت سے جزئیات پر بحث کی جاتی ہے۔ اور طریقہ کار تجویز

کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مسلمان تعلیم شروع کر دیتے ہیں تو اس راہ میں مشکلات و دشواریاں پیش آتی ہیں۔ کہیں افلاس زنجیر پا بن جاتا ہے کہیں خاص خاص قوانین سنگِ راہ ثابت ہوتے ہیں، کبھی برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری تعلیم میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اِس لیئے مشکلات کے حل کرنے پر توجہ کی جاتی ہے۔ غربا کی تعلیم کے لیئے وظائف مانگے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ سے تعلیم میں آسانیاں بہم پہونچانے کے لیئے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ برادرانِ وطن کی بے مہری پر اظہار رنج و افسوس ہوتا ہے۔ مگر ان سب مشکلات کے باوجود تعلیمی کام برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مُسلمان تعلیم پا پا کر اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔ اور گورنمنٹ کی کچھ ملازمتیں اُن کو حاصل ہو جاتی ہیں۔

جب تعلیم اس حد تک پہونچ جاتی ہے تو مسلمان ایک قدم اور بڑھاتے ہیں، یعنی اب تعلیم نسواں کی ضرورت سامنے آتی ہے اور مُسلمانوں کو خطبۂ صدارت میں بتایا جاتا ہے کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہونگی بچّوں کی تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے ممکن نہ ہو گی۔ کیوں کہ تعلیم کی ابتدا آغوشِ مادر سے شروع ہوتی ہے۔ چند سال کی پیہم تبلیغ کے بعد مسلمان تعلیم نسواں کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کانفرنس

میں ایک مستقل شعبہ قایم ہوتا ہے۔ اور ایک زنانہ اسکول کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

اِس کے بعد بالغ العمر مُسلمانوں کی تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اب چند سال سے کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس پر بحث کی جاتی ہے۔ اور یورپ میں اس کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے اُس کو بطور مثال بیان کیا جاتا ہے۔ اِسی سلسلہ میں شبینہ مدارس کے قیام کا معاملہ ہے جس کی ضرورت شدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ جبریہ و مفت تعلیم کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آگیا ہے اور اس کی ضرورت پر خاص طریقہ سے زور دیا جاتا ہے اور چوں کہ حالات کی تبدیلی اور برادرانِ وطن کی ہمہ گیری اور تنگ نظری کی وجہ سے ملازمت کا دروازہ مسلمانوں کے لیئے بند ہو رہا ہے، اس لیئے اب اُن کو صنعتی و تجارتی تعلیم کے حاصل کرنے کی ترغیب بھی دی جاتی ہے کیوں کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر مسلمان صنعت و حرفت پر متوجہ نہ ہوئے تو کسبِ معاش کے زرخیز وسایل سے محروم رہ جائینگے۔ علاوہ خطبۂ صدارت کے یہ مسایل مختلف تجاویز کی صورت میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں۔ غرض حالات کی تبدیلی اور زمانہ کی ترقی پزیر رفتار نے بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے اس لیئے دائرہ بحث بھی وزافزوں

وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس بنا پر کانفرنس کے صدر کا یہ فرض ہو گیا ہے کہ وہ اپنے خطبہ میں مسلمانوں کی تمام ضروریات کا استقصا کرے اور اُن کے متعلق مفید تدابیر بتائے۔ خطباتِ عالیہ کے مطالعہ سے یہ سب باتیں اجمالی طور پر معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ چہل سالہ دور میں نظامِ تعلیم و طریقۂ تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں، اور مسلمانوں پر ان انقلابات کا کیا اثر پڑا۔ اس سلسلہ میں مسلم یونی ورسٹی کی تحریک اور اُس کے انجام کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ غرض سیکڑوں تعلیمی مسائل ہیں جن کی اجمالی تاریخ خطبات کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے اور وہ طریقِ کار بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بہ حالتِ موجودہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔ اگر آپ اِن خطبات کا غور سے مطالعہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تعلیم کے متعلق کتنے جدید مسایل پیدا ہو گئے اور ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت نے مسلمانوں کی تعلیم پر کیسا زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ چیزیں آپ کو کسی دوسری کتاب سے معلوم نہیں ہو سکتیں لہٰذا اس پہلو سے بھی خطبات کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے مفید و سودمند ہے۔

۴) یہ خطبات درحقیقت علی گڑھ تحریک کی تاریخ کے چند اجزا یا ابواب ہیں اور ایک اہم ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے علی گڑھ تحریک

کے متعلق کوئی مستقل کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ ایسی متعدد کتابیں و رسائل شائع ہو چکے ہیں جن کا مطالعہ علی گڑھ تحریک کے متعلق صحیح معلومات بہم پہونچاتا ہے۔ مثلاً سرسید، نواب محسن الملک وغیرہ کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپا کرتے تھے اب مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو گئے ہیں، اسی طرح سرسید، نواب محسن الملک اور شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے تمام لیکچر مدت ہوئی چھپ گئے۔ سرسید کی مکمل سوانح عمری مولانا حالی کے قلم سے حیاتِ جاوید کے نام سے اسی صدی کے اوائل میں شائع ہو گئی جس سے علی گڑھ تحریک کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں کانفرنس نے نواب وقار الملک کی مکمل لائف وقار حیات کے نام سے چھاپی ہے جس میں علی گڑھ تحریک کے متعلق بڑا ذخیرہ معلومات کا موجود ہے۔ ان سب کتابوں کے علاوہ سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے مکاتیب بھی شائع ہو چکے ہیں، جن میں علی گڑھ تحریک کے متعلق بہت سے اہم واقعات ملتے ہیں۔ یہ سب چیزیں کالج کی تاریخ کے اجزا اور ابواب ہیں اور اب خطباتِ عالیہ نے اس سلسلہ کو بڑی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ان سب

کتابوں کا مطالعہ کرے تو علی گڑھ تحریک کے متعلق اُس کو کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایک سلیقہ مند شخص ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھ کر علی گڑھ تحریک کی ایک دل چسپ و مفصّل تاریخ مرتب کر سکتا ہے۔ جو کمی تھی وہ خطبات نے پوری کردی۔ غرض مختلف وجوہ سے یہ خطبات نہایت دل چسپ و سبق آموز ہیں اور جتنا زمانہ گزرتا جائیگا اِن کی قدر و قیمت بڑھتی جائیگی۔

یہ خطبات بجائے خود دل چسپ تھے لیکن ہر صدر انجمن کے مختصر حالات و تصاویر نے اُن کو اور زیادہ دل چسپ بنا دیا ہے۔ ابھی چوں کہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے اس لیئے کوشش کرنے سے یہ حالات فراہم ہو گئے ورنہ چند سال بعد تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہ آتے۔ تصویروں کا ملنا تو اور زیادہ دشوار تھا۔ اب بھی ایک سال کی تلاش و خط و کتابت کے بعد یہ حالات و تصویریں فراہم ہوئی ہیں۔ **نواب صدر یار جنگ بہادر مولٰنا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی** آنریری سکرٹری ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کے لیئے جن صاحب کو منتخب کیا اُن کی موزونیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ **مولوی انوار احمد صاحب** زبیری مارہروی (جو ان حالات و خطبات کے جامع ہیں) موجودہ صدی کے اوایل سے کانفرنس سے وابستہ ہیں۔ اُنھوں نے زمانہ دراز تک

نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے ساتھ کانفرنس کا کام کیا ہے اور کانفرنس کے اجلاسوں کے انتظام میں خاص حصہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ گویا کانفرنس کی زندہ تاریخ ہیں۔

گزشتہ چالیس سال میں جس قدر اصحاب کانفرنس کے صدر ہوئے اُن میں سے بجز دو صاحبوں کے مولوی انوار احمد صاحب نے سب کو دیکھا ہے، اکثر سے ملاقاتیں کی ہیں اور اُن کی باتیں سُنی ہیں اور بہت سے لوگوں کے خطبہائے صدارت خود اُن کی زبان سے سُنے ہیں۔ بہت سے بزرگ ایسے ہیں جن کے حالات زندگی دیکھنے کا اُن کو خاص موقع ملا ہے۔ ان حالات کے لحاظ سے اس کام کے لیئے اُن سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا؟ اور شاید اب علی گڑھ میں اور کوئی شخص ایسا موجود بھی نہیں جو ایک رُبع صدی سی کانفرنس سے مستقل تعلق رکھتا ہو، جس نے کانفرنس کے اتنے اجلاس دیکھے ہوں، اور کانفرنس کے مقاصد کے سلسلہ میں ہندوستان کے قریباً ہر صوبہ کا ہزاروں میل سفر کیا ہو۔

چنانچہ جیسی توقع تھی مولوی انوار احمد صاحب نے اس خدمت کو نہایت دلچسپی اور ذوق کے ساتھ انجام دیا۔ حالات کے سلسلہ میں بہت سی چیزیں اُنھوں نے ایسی لکھی ہیں جن کے وہ چشم دید راوی ہیں۔ یہ واقعات ہم کو

صرف اُن ہی سے معلوم ہو سکتے تھے۔ اب جو شخص آیندہ علی گڑھ تحریک کی تاریخ مرتب کرنا چاہے اُس کے لیئے مولوی انوار احمد صاحب کی یہ کتاب بہت مفید و کار آمد ہے اور عام ناظرین کے لیئے بھی جو قومی تحریکات سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں نہایت دلچسپ ثابت ہوگی، اور حُسنِ قبول حاصل کرے گی
اُمید ہے کہ کانفرنس کی چالیسویں سالگرہ (اجلاس) کے موقع پر (جو امسال مدراس میں ہے) اس کتاب کا شایع ہونا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور مدراس کا چالیسواں خطبہ صدارت کانفرنس کی تاریخ کو ۱۹۲۷ء تک مکمل کر دیگا۔

خاکسار

محمد اکرام اللہ خاں ندوی
شاہجہاں پوری

سلطان جہان منزل،
علی گڑھ

۲۷ مئی ۱۹۲۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ جلد سوم

معذرت میں آل انڈیا مسلم (سابق محمڈن) ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کی کارروائیوں کے ساتھ گزشتہ چونتیس سال سے دل چسپی رکھتا ہوں، بائیس سال سے اس کے اکثر اجلاسوں میں شریک ہوا ہوں، اور بیس سال سے مسلسل اس کا باقاعدہ ممبر ہوں۔ تاہم جو بات اس کے خطبات صدارت کے یک جا بشکل کتاب (خطبات عالیہ) پڑھنے سے حاصل ہوئی وہ نہ اُن کے بالاقساط دیکھنے سے ہوئی تھی اور نہ بر سرِ اجلاس سُننے سے۔ خدا اس تجویز خیر کے دال و فاعل دونوں کو جزائے خیر دے۔ کیا اچھا ہو اگر ان چہل سالہ اجلاسوں کے متعلق اور لٹریچر بھی اسی اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے۔

لیکن یہ سارا لطف و سرور جو ان خطبوں کو فرصت و اطمینان کے اوقات میں مطالعہ کرنے سے حاصل ہو رہا تھا مکدّر ہو گیا جب قطعی طور پر یہ معلوم ہوا کہ تیسری جلد کا دیباچہ مجھے لکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ اوّل تو اس نظر سے ان خطبوں کو کبھی دیکھا تھا نہ سنا ؎

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا　　　یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا

دوسرے اس سلسلہ میں جو مفید باتیں بتائے جانے کے لائق تھیں وہ مولانا محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی اپنے ایک مقدمہ میں اور حاجی انوار احمد صاحب (مؤلف خطبات) اپنے دو دیباچوں میں بہت قابلیت کے ساتھ بتا اور سمجھا چکے - مگر خیر مامور معذور کی حیثیت سے جو کچھ ممکن ہے میں بھی پیش کئے دیتا ہوں ؎

نظر چوں بریں جام صہبا گماشت ۔۔۔ ستد صافی و دُرد بر ما گزاشت
من ارچہ بداں مے گراں سر شوم ۔۔۔ کجا با حریفاں برابر شوم
چو گوہر ہمہ سفت گوہر پذیر ۔۔۔ من از بہرہ سفتن ندارم گزیر
زداناھر آں در کہ ناسفتہ ماند ۔۔۔ فشانم بنوعے کہ دانم فشاند
ترا ہر چہ در شے نماید محال ۔۔۔ گنہ بر کسے نہ کہ بست ایں خیال

کانگرس کا جنم

انیسویں صدی عیسوی کا آخری چوتھائی حصہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم عام ہو چلی تھی اور اس کے ساتھ ہندوستانیوں کا افق نظر روز افزوں وسعت حاصل کر رہا تھا - بنگالیوں کے لئے Timid (بزدل) اور Crafty (کیّاد وشیّاد) کے الفاظ اگرچہ کلاسکل اور مسٹاریکل بن چکے تھے تاہم کم از کم پریس کے میدان میں اور پلیٹ فارم کی بلندی پر اُن کی سیف زبان و تیغ قلم کے جوہر نمایاں ہو چلے تھے اور ؎

جراحات السنان لہا التیام
ولا یلتام ماجرح اللسان

اسی کاٹھ اور چمڑے کی تلواروں والی جماعت نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک فلائنگ کور (اڑان کمپو) قائم کر کے گویا وار (باقاعدہ ٹرینگ)

کی طرح ڈالی جس کے علم پرداری اور دل نوازوں میں نہ صرف سر سیندر ناتھ بنرجی اور پنڈت اجودھیا ناتھ اور اس زمانہ کے دوسرے ہندو اکابر ہند تھے، بلکہ نواب سیّد محمد اور جسٹس بدرالدین طیّب جی حتیٰ کہ مذہب سلطنت کے پیرو (عیسائی)، مسٹر ڈبلو سی بونرجی اور اُن سے بھی بڑھ کر خود شہر کا سلطنت میں سے مسٹر اے او ہیوم اور سر ولیم وڈربرن جیسے سرفروش و آزمودہ کار رہبر و آزما شریک تھے۔

مسلمانوں کی حالت ان حالات کے مقابلہ میں ادھر وہ کے مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف تو گورنمنٹ اُن سے بدگمان تھی، دوسری طرف وہ تعلیم جدید سے نہ صرف نابلد بلکہ دور و نفور تھے اور سلطنتِ رفتہ کا خمار ان کے دماغوں میں باقی تھا۔ ان وجوہ موجبہ کی بنا پر سرسید اور اُن کے رفقا رکار اپنے خام کار و نوگرفتار ہم قوموں کو بجا طور پر ہندوستان کی سیاستِ جدید کے مادہ آتش گیر کے لئے فی الوقت نائرہ بلا خیز سمجھتے اور اُن کو اس شجرۂ ممنوعہ سے چندے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔ "لَا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظلمین۔"

اس سے یہ ہرگز و زنہار نہ سمجھنا چاہیئے کہ سرسیّد کی پالیسی مسلمانوں کو مستقلاً سیاست سے الگ رکھنے کی تھی۔ اُن کی کانگرس تحریک سے بہت قبل اور آخر تک بعد کی زندگی اس وہم کی پُرزور تردید کرتی ہے جس پر کسی تفصیلی گفتگو کا یہ محل نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سرسید کا یہ حُسن تدبیر اُس حکمت و دانائی کا نتیجہ تھا جو صرف ان لوگوں کے حصّہ میں آتی ہے جن سے خدائے قدوس کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔ یہ غرض مدنظر رکھ کر سرسیّد نے ۱۸۸۶ء میں یعنی کانگرس سے تقریباً چند ہی ماہ بعد

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی جس کے اندر بعد میں لفظ "آل انڈیا"

کا اضافہ ہوا اور اب "محمڈن" "مسلم" سے بدلا ہوا ہے۔ پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ہوا اور حسب ذیل دس مقاصد قرار دئے گئے جو گویا توریت جدید کے "احکام عشر" تھے۔

۱۔ مسلمانوں میں یورپین سائنس ولٹریچر کے پھیلانے اور وسیع حد تک ترقی دینے اور اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک اُن کے پہنچانے پر کوشش کرنا اور اُس کی تدبیروں کو سوچنا اور اُن پر بحث کرنا۔

۲۔ مسلمانوں نے جو قدیم زمانہ میں علوم میں ترقی کی اُس کی تحقیقات کرانا اور اُس پر اُردو یا انگریزی میں رسالہ جات تحریر کرنے یا لکچر دینے یا ایسے (Essay) لکھنے پر لوگوں کو آمادہ کرنا۔

۳۔ نامی علماء اور مشہور مصنفین اسلام کی لائف کو اُردو یا انگریزی زبان میں لکھوانا۔

۴۔ مسلمان مصنفوں کی تصنیفات جو نایاب ہیں اُن کے بہم پہونچانے کی تدبیر کرنا یا پتہ لگانا کہ وہ کس جگہہ موجود ہیں۔

۵۔ تاریخانہ واقعات زمانہ قدیم کی تحقیقات پر رسالہ جات تحریر کرنا یا لکچر دینے یا ایسے (Essay) لکھنے پر لوگوں کو آمادہ کرنا۔

۶۔ دنیاوی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکچر دینے کی تدبیر۔

۷۔ فرامین شاہی کو بہم پہنچا کر اُن سے ایک کتاب انشاء کا مرتب کرنا اور ان کے مواہیر وطغرا کے نمونے فوٹو گراف سے قائم رکھنا۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوا

ان میں مذہبی تعلیم کی حالت کو دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام میں کوشش کرنا۔

۹۔ جو لوگ کہ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے علما سے پاتے ہیں اور اس کو انھوں نے اپنا مقصد قرار دے لیا ہے اُن کی حالت کی تفتیش کرنا اور ان میں اس تعلیم کے قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدابیر کا عمل میں لانا۔

۱۰۔ (الف) عام لوگوں میں جو عام تعلیم قدیم مکاتب کے ذریعہ سے جاری تھی اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور عام لوگوں میں عام تعلیم کی مناسب وسعت کی تدابیر کا اختیار کرنا۔ یا

(ب) جو مکاتب عام لوگوں کے لڑکوں کے لئے قرآن مجید پڑھنے کے ہیں اور جو سلسلہ قرآن مجید کے حفظ کرنے کا تھا اور جن کا اب بہت کچھ تنزل ہو گیا ہے اُن کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدابیر کا اختیار کرنا۔

اجلاسوں کی تعداد سنہ ۱۸۸۶ء سے سنہ ۱۹۲۷ء تک کی بیالیس ۴۲ سالہ مدّت میں کانفرنس کے چالیس ۴۰ اجلاس ہوئے۔ دو سال کے فرق کا سبب یہ ہے کہ سنہ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد کے انتقال کے افکار لاحقہ اور سنہ ۱۹۲۱ء میں نان کوآپریشن کے فتنہ و آشوب کے سبب سے اجلاسوں کا اہتمام نہ ہو سکا، اور ان حالات میں ایسا ہونا یقیناً ناگزیر تھا۔

مقامات اجلاس مقامات اجلاس کے لحاظ سے کانفرنس برٹش انڈیا کے

اکثر صوبوں میں اور ہندوستان کے بائیس ۲۲ بڑے بڑے شہروں میں گشت کر چکی ہے۔ البتہ ریاستوں میں صرف رام پور (نواب) اور خیر پور (سندھ) میں حاضر ہو سکی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ کانفرنس اپنے مرکز میں گوشہ گیر ہو بقیہ صوبوں اور دوسری مرکزی (کم از کم اسلامی) ریاستوں میں بھی دورہ کر آئے جس کے منافع کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

جن مقامات پر کانفرنس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اجلاس کئے وہ یہ ہیں:۔

لاہور	کلکتہ	مدراس	بمبئی	لکھنؤ	دہلی	علی گڑھ
۲	۲	۲	۲	۳	۴	۱۰

علی گڑھ میں سب سے زیادہ اجلاس منعقد ہونے کا فلسفہ آنریبل خان بہادر میاں سر فضل حسین نے اپنے ایڈریس (۱۹۲۲ء) میں یہ بیان کیا تھا۔

"دو تین اہم سنین کے بعد صنم کدۂ تعلیم کے پرستاروں کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور اس سے بڑھ کر اور کون سا اقتضاء قدرت ہو سکتا تھا کہ یہ تمام پرستار علی گڑھ کی طرف کھنچ آئیں جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا تھا۔

تاثیر ہے کیا خاک میں اس نجد کی کہہ دے
تو مجھ سے تو یا رے
ہر پھر کے جو آ نکلے ہے یاں ناقۂ لیلیٰ
اے جذبۂ محبت"

بلاشبہ قوم کا یہ فرض اور حق اور علی گڑھ کی مرکزیت کا یہی اقتضا ہے کہ

علی گڑھ جو سبق دے سکتا ہے وہ اس سے حاصل کیا جائے اور جو استفادہ اس نے کیا ہے اس سے اس کا جائزہ لیا جائے۔

خصوصیات صدر چالیس[۴۰] اجلاسوں کی صدارت تینتیس[۳۳] نہایت سربرآوردہ ماہران تعلیم نے فرمائی جن میں بعض بزرگ ایک سے زیادہ مرتبہ انتخاب میں آئے۔ ان تینتیس[۳۳] میں دو صاحب (جسٹس باڈم اور سرتھیوڈور ماریسن) غیر مسلم تھے جس سے ثابت ہے کہ مسلمان ایک غیر متعصب قوم ہیں۔ اور اگر وہ اپنے مذہب کے احکام پر پورے طور پر کاربند ہوں تو انھیں علم کے لئے چین تک جانے (اطلبوا العلم ولو کان بالصین) اور حکمت کو جہاں کہیں وہ ملے لے لینے میں باک نہ ہونا چاہئیے (الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا فھو احق بھا) اور اسی اصول پر یقیناً نامناسب نہ ہوگا اگر آیندہ بھی وقتاً فوقتاً ہمدرد غیر مسلم ماہران تعلیم کے آرار و افکار سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے ؎

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جتنے صدر ہوئے ان کی بہت بڑی اکثریت (وللاکثر حکم الکل) ایسی تھی جس نے نیشنل کانفرنس کے بانی اور اس کے شرکار کار کے ٹھیٹ مشرقیت کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور یہی سبب اُن کے مشرق اور روایات مشرق کے ساتھ شیفتگی و گرویدگی کا تھا۔ مولوی سمیع اللہ خاں، منشی امتیاز علی، سردار محمد حیات خاں، خان بہادر برکت علی خاں، نواب محسن الملک، خلیفہ محمد حسین، مولانا حالی مرحومین ومغفورین، سر رحیم بخش، نواب

سر عبدالقیوم وغیرہم مدظلہم کو چھوڑ کر بھی (جو مشرقیت کے پس خیمہ کہے جاسکتے ہیں) یا نواب عماد الملک و نواب سر سید شمس الہدیٰ وغیرہم مرحومین سے قطع نظر (جن کو مشرق و مغرب کے مابین برزخ قرار دیا جاسکتا ہے) ایسے اصحاب بھی ہیں جیسے نواب اسحاق خاں، مولوی حشمت اللہ، جسٹس شاہ دین، رائٹ آنریبل امیر علی، جسٹس شرف الدین، مسٹر عبداللہ یوسف علی، سر فضل حسین، سر عبدالرحیم، سر عبدالقادر (جو گویا مغربیت کے مقدمۃ الجیش ہیں) اسی مشرقیت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں بہت سوں کے ایڈریس اُردو میں ہیں اور جن کا نغمہ مغربی ہے، لے اُن کی بھی وہی مشرقی ہے۔ جسٹس شاہ دین مرحوم ۱۸۹۴ء کے اجلاس میں باوجود چھبیس سالہ نوجوان گریجوایٹ اور بیرسٹر اور تازہ ولایت ہونے کے ایڈریس اُردو میں پڑھتے ہیں، نواب عماد الملک انگریزی ادب کے پتلے ہونے پر بھی ایک سے زیادہ ایڈریس اُردو میں دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایڈریس خواہ اُردو میں ہوں یا انگریزی میں ان سب سے ان اصحاب کے علمی وادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

ہر ایڈریس اپنے مصنف کے نہاں خانہ دل کا گویا مجلّیٰ آئینہ اور رجحانات طبع کا ورق کشادہ ہے جسٹس بدرالدین طیب جی معلوم ہوتے ہیں کہ کانفرنس کا خطبہ مُسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پڑھ رہے ہیں۔ مولانا حالی بدستور شعر و شاعری میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خلیفہ محمد حسین رفع اختلاف عقاید کے درپے ہیں۔ نواب عماد الملک فرماتے ہیں جب وعدہ کرو تو پہلے دیکھ لو کہ اُسے ضرور پورا کرکے رہنا ہے۔

ہر صدر کی سیرت سے اس کا خود ساز اور اس زرّین قول کا پابند ہونا

ثابت ہے ؎

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ایک اور سبق آموز واقعہ یہ ہے کہ سرسیّد اور اُن کے مُشیر صدر کے انتخاب میں عمر اور درجہ اور سابقہ اور شہرت یا کسی اور خارجی و نمائشی وجہ وجاہت کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ محض جوہر قابل کی تلاش میں رہتے اور حال کو مستقبل کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں نواب اسحاق خاں صاحب سنہ ۱۸۹۲ء میں مولوی حشمت اللہ اسکوائر اور سنہ ۱۸۹۴ء میں جسٹس شاہ دین اپنے اپنے تقرر صدارت کے وقت کوئی مابہ الامتیاز تفوق اپنے سامعین پر سوائے اس کے نہیں رکھتے تھے ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

یہی اصول سرسید کا کالج کے لئے ٹرسٹیوں کے انتخاب میں تھا۔ مثلاً آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں، نواب صدر یار جنگ مولوی محمد حبیب الرحمن خاں، حاجی محمد موسیٰ خاں، خان بہادر حاجی سیّد زین الدین کا علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کے زمرہ میں شامل ہونا اسی اصول کے ماتحت تھا جس کی درستی و کامیابی پر اُس وقت سے اس وقت تک کے واقعات اور قومی تاریخ کے انقلابات شاہد عدل ہیں کہ اپنے اپنے زمانہ میں یہی اصحاب اور اُن کے امثال سرسیّد اور اُن کے معاصر جانشینوں کے دست و بازو بنے اور اُن کے بعد اُن کی قومی امانت و وراثت کے امین و وارث ہوئے۔

خطبوں کی زبان

ایک معتد بہ عرصہ تک اردو رہی۔ اس کے بعد جب ایک طرف مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا چرچا ہو گیا اور پریسیڈنٹوں کو انگریزی سمجھنے والے سامعین ملنے لگے اور دوسری طرف کانفرنس کی آواز نے قوت پکڑی اور اس کے حکام تک پہونچانے کی ضرورت سمجھی گئی تو بجز چند مستثنیات کے اصولاً ایڈریس انگریزی میں لکھے اور پڑھے جانے لگے۔ لیکن بسا اوقات مغربیت میں بھی مشرقیت کی چاشنی قائم رہی۔ اور نہ صرف عربی و فارسی کی تعلیم قایم رہنے بلکہ اردو زبان کی ترقی کی کوشش کی ترغیب ان انگریزی ایڈریسوں میں دی گئی۔ اور جہاں تک ان خطبات کا میں نے تتبع کیا ہے سب سے پہلے اس پر حشمت اللہ اسکوائر مرحوم نے زور دیا تھا جو خود انگریزی زبان کے فاضل تھے اور تو اور سر تھیوڈور ماریسن نے عربی اور اردو کی تعلیم و ترویج کی اتنی ہی حمایت کی ہے جتنی کسی مسلمان سے توقع ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "علی گڑھ کی توسیع میں ہی دو باتیں خیال کرتا ہوں کہ فی الحال ہونے والی ہیں۔ پہلے ایک فیکلٹی عربی کی اور پھر سائنس کی......
> مسلمان مجھ سے جھگڑنے کو تیار ہیں کہ میں نے عربی کو سائنس سے پہلے کیوں رکھا۔
>
> ....اگر آپ اپنی کتابیں اردو ہی میں چھاپیں تو وہ لوگ (یعنی جرمنی اور انگلستان، فرانس اور جاپان کے علمار) اردو زبان کو اس غرض سے پڑھیں گے کہ آپ کی کتابیں سمجھ سکیں اور اُن کو تمام یورپ کے فائدہ کے لئے ترجمہ کریں۔ یہ ہی علما تھے جنھوں نے

قبل اس کے کہ جاپان بذریعہ کسی عہدنامہ کے مہذّب قوموں میں شمار کیا گیا ہو، نوجوان جاپانی ماہر علم کیمیا کی کتابوں کا نہایت جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آج یورپ کے علما ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کو میزان میں تولا اور ہلکا پایا ۔"

صدر کی آزاد رائے

ان تمام خطبات صدارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی صدر نے اپنے زمانہ کی عام رائے کو کبھی اپنی ذاتی رائے پر غالب نہیں ہونے دیا ۔ اور اگر یہی واقعہ ہے (جیسا کہ یقیناً ہے) تو اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہر صدر نے اپنے مافی الضمیر کے مطابق قوم کی رہنمائی کی کوشش کی ۔ ہز ہائنس آغا خاں نے دبی زبان سے اور جسٹس طیّب جی نے صفائی کے ساتھ پردہ کی مخالفت کی ۔ جسٹس طیّب جی نے نہایت بلند آہنگی سے سیاست کا وعظ کہا ۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے ایک ہی اجلاس میں ہز ہائنس آغا خاں اور نواب عماد الملک بہادر نے اپنے اپنے خطبات میں جبری مفت ابتدائی تعلیم کی تحریک کو دو مختلف الزوایا نظروں سے دیکھا ۔ سر تھیوڈور ماریسن نے عربی تعلیم کی تحریک یہ کہہ کر کی کہ "اس بارہ میں مسلمان مجھ سے جھگڑنے کو تیار رہیں ۔"

کانفرنس اور پالٹیکس

فلسفۂ مذہب کے بعد اگر کوئی دوسرا ہمہ گیر فلسفہ ہے تو غالباً وہ فلسفۂ سیاست ہے ۔ اسی بنا پر اگرچہ سر سید نے کانفرنس کی بنا ہی مسلمانوں کو اس وقت سیاست سے الگ رکھنے کے لئے ڈالی تھی، گو اس کا نظام محض تعلیمی تھا، اور کہنے کو اس کے مقاصد کے اندر سیاست

کا شائبہ تک نہ تھا۔ حتیٰ کہ بعض ابتدائی خطبات صدارت میں نہایت بلند آہنگی سے
اس کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء کے خطبہ صدارت میں تھا:

"ہماری محمڈن ایجوکیشنل کانگرس میں (جس کے مقاصد محض متعلق تعلیم
مسلمانان ہیں) کوئی پولیٹیکل معاملہ پیش نہیں ہوگا"

(نیشنل کانگریس کے مقابلہ میں ایجوکیشنل کانگرس کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں)
پھر ۱۸۸۹ء کے خطبہ صدارت میں ہے کہ

"اس جلسہ کو کوئی تعلق صراحتہً یا کنایۃً کسی پولیٹیکل اور مذہبی مباحثہ سے
ہرگز ہرگز نہیں ہے"۔

اس کے بعد ایک دور وہ آیا کہ ۱۹۰۱ء میں گورنمنٹ پبلک سروس میں مسلمانوں
کی کمی کی شکایت کسی کانگرسی یا کانفرنسی مسلمان نے نہیں بلکہ ایک رکن حکومت (مسٹر
جسٹس باڈم) نے (بحیثیت صدر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے) کی اور فرمایا:

"بلحاظ اعداد مذکورۂ بالا کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ گورنمنٹ
سروس میں اہل اسلام باوصف اپنا پروپوزشن پورا رکھنے کے کم
خدمات پر ہیں"

اس کے بعد واقعات نے ایک اور کروٹ بدلی اور ۱۹۰۳ء میں مسٹر جسٹس بدرالدین
طیب جی نے زعمائے کانفرنس کے علی الرغم اور گورنر بمبئی کی موجودگی میں کانفرنس
کے پلیٹ فارم پر کانفرنس کے ایڈریس میں اپنے مذہب کا اعلان کیا کہ

"یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ایسے پولیٹکل مسائل پیدا ہوں جو صرف
ایک ہی قوم پر اثر کریں اس لئے میں ہمیشہ اس اصول کا پابند رہا ہوں کہ

جہاں تک عام پولٹیکل معاملات کا تعلق ہے مسلمانوں کو ہندوستان
کی دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے .... میں
ایسے مسئلہ یا مضمون کے اختیار کرنے کو بالکل بُرا سمجھوں گا جس سے
ہمارے دوسرے ہم وطنوں کے دلوں کو رنج یا اُن کے فیلنگ کو صدمہ
پہونچے .... ہرطرح اس امر کی وجہ موجود ہے کہ ان دو بڑی
انسٹی ٹیوشنوں یعنی (کانفرنس وکانگریس) کو مل کر کام کرنا چاہیئے"۔

اگرچہ اس صاف گوئی کو اس وقت مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے عام طور پر ناپسند کیا، لیکن درحقیقت یہی گویا مسلم لیگ کا سنگ بنیاد تھا۔ اور اسی وقت سے مسلمانوں میں ایک خاص سیاست پیدا ہوئی جس کو "تعلیمی سیاست" کے نام سے پکارنا شاید ناموزوں نہ ہو۔ کیوں کہ مسلمانوں کی مخصوص ضروریات گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا، سرکاری نظام تعلیم میں مسلمان اساتذہ اور افسران تعلیمی کا متناسب تقرر، سرکاری مدارس میں مسلمان طلبہ کے لئے داخلہ اور وظائف کی تعداد و مقدار کی تعیین، سرکاری یونی ورسٹیوں میں عربی، فارسی، و اردو زبانوں کی تعلیم کی نگہداشت، اسلامی نقطۂ نظر سے نصاب تعلیم کی نوعیت کی جانب گورنمنٹوں کو زور اور اصرار کے ساتھ متوجہ کرنا، اگر یہ سب سیاست نہ تھا تو کیا تھا؟

اب سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ باقاعدہ قایم ہو جاتی ہے تاہم کانفرنس اپنی خاص سیاست کی طرف ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء کی کانفرنس کے صدر مرحوم نواب صاحب ڈھاکہ ہوتے ہیں جو گویا اُس زمانہ کی ہمہ گیر سیاست (تقسیم بنگال) کی روح رواں تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ

"اس کو بھی تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ کوئی قوم بغیر پالٹیکس کے زندہ نہیں رہ سکتی اور فی الحقیقت ہماری کانفرنس تمام پولیٹیکل مجامع کا مخزن ہے"۔

۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے کانفرنس کی سیاسی روح کو ان الفاظ میں سراہا تھا:

"ذرا نظر اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسی کانفرنس کی بدولت اسلامی ہندوستان میں کس قدر انقلاب وقوع پذیر ہوا ہے .... مسلم لیگ جو اس وقت بہت اچھا کام کر رہی ہے اسی تحریک کے نتائج میں سے ہے ...... میں آپ کو ہرگز یہ رائے نہیں دوں گا کہ گورنمنٹ کے انتظام میں جو کچھ نقائص ہوں ان کی طرف سے آپ دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرلیں اور مثل ریاکار اور منافقین کے ہر سرکاری کارروائی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوں"۔

ڈھنگرا نامی ایک ہندوستانی طالب علم ولایت میں ایک ریٹائرڈ انگریز افسر کو قتل کر دیتا ہے اس پر کانفرنس میں اظہار نفرت ہوتا ہے' لارڈ ہارڈنگ وسیرائے پر گولا پڑتا ہے کانفرنس اس قسم کے افعال شنیعہ پر لعنت کرتی ہے۔ یہ سب سیاست نہیں تو کیا ہے ؟ ہاں یہ امر آخر ہے کہ نواب وقار الملک بہادر مرحوم کی تفریق "صحیح پالٹیکس" اور "غلط پالٹیکس" کو تسلیم کر کے کانفرنس کی ان کارروائیوں اور ازیں قبل دوسری کارروائیوں کو "صحیح پالٹیکس" قرار دیا جائے۔ ولامناقشة

فی الاصطلاح۔"

اور اس میں شبہ نہیں کہ جدید تعلیم کی ترقی اور نئی حدود نظر کے قیام کے ساتھ مسلمانوں (بالفاظ دیگر کانفرنس) کا سیاسی جمود ممکن بھی نہ تھا۔ اور اگر سر سید مرحوم بقید حیات ہوتے تو وہ بھی اقتضائے زمانہ کے سیلاب کو یقیناً اسی رُخ پر بہنے دیتے، یہی سیاستوں کی سیاست ٹھیرتی، اسی میں مسلمانوں کی عافیت قرار پاتی۔ اور کون ہے جو سر سیّد کے سیاسی کارناموں کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کے بعد دیانۃً ان کے متعلق کسی سیاسی بدگمانی کو ایک لمحہ کے لئے بھی جائز رکھے گا؟! ؎

ہر اک وقت کا مقتضا جانتے تھے
زمانہ کے تیور وہ پہچانتے تھے

کانفرنس اور تحریک اتحاد

جس اصل مقصد کے ساتھ کانفرنس قایم ہوئی خلاصۃً وہ یہی تھا کہ مسلمانوں کو سیاسی تحریکات میں شامل ہونے سے پہلے بذریعہ تعلیم جدید ان کے اندر کافی صلاحیت پیدا کر لی جائے۔ اس مقصد کی شروع ہی سے کبھی مخلصانہ اور اکثر معاندانہ حیں طور پر تاویل کی گئی اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کانفرنس نے حقیقی و صحیح اتحاد فرق کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھا۔ ۱۸۹۵ء میں گنگا جمنا کے سنگم کے مقام پر جو اڈریس پڑھا گیا اُس کے الفاظ یہ تھے:

"ہندو مسلمانوں کے باہم چولی دامن کا تعلق ہے جو کسی طرح جدا نہیں ہو سکتے .... آرزو ہے کہ تمام قیصری رعایائے ہند صرف اپنے مذہبی معبدوں میں ممتاز ہو سکیں۔"

جسٹس طیب جی کانفرنس میں اس وقت شریک ہوئے جب انھوں نے اطمینان کر لیا کہ کانفرنس کانگریس کی مخالف نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ غیر مسلم ماہران تعلیم کا اس مسلم انسٹی ٹیوشن کا صدر بننا اس کی سچی خواہش اتحاد کا نتیجہ تھا۔ غیر مسلم ماہران تعلیم و محبان وطن کی موت پر کرسی صدارت سے اظہار تاسف ہوتا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۱۵ء کے خطبہ میں (سر عبد الرحیم نے) مشورہ دیا کہ

"اس کانفرنس کا فرض ہے کہ وہ دونوں جماعتوں کے مسائل پر بحث کرے۔ اور اس سے زیادہ کوئی مہلک غلطی نہ ہوگی کہ ہم اپنے آپ کو مطلق یا زیادہ ان ہی مسائل کے اندر محدود رکھیں۔ جو خاص طور پر مسلمانوں سے وابستہ ہیں"۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے ایڈریس میں اس امر پر اظہار مسرت کیا گیا کہ

"پچھلے دس سال کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں ہم نے ہمسایہ قوموں سے تعاون کی کوشش کی ہے"۔

سنہ ۱۹۲۳ء کے اجلاس کے صدر کا دعویٰ تھا کہ

"میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ہمیشہ صدق دل سے حامی رہا ہوں اور اس کو ملک کے بہترین فوائد کے لئے ضروری سمجھتا ہوں"۔

اور درحقیقت کانفرنس کے بانی (سر سید) سے جو ہندوستان کے اندر نہ صرف اصلاح شدہ کونسلوں اور نام نہاد سوا راج کے بلکہ حقیقی جمہوریت کے خواہاں و کوشاں تھے اور ہندو مسلمانوں کو "ہندوستان کی دلہن کی دو خوبصورت آنکھیں" سمجھتے تھے یہ بات حد درجہ مستبعد تھی کہ وہ کانفرنس کو آلۂ شقاق و نفاق بناتے۔ بلکہ کانفرنس کی بنیاد بھی

اس غرض اتحاد کے حصول کا ایک زبردست آلہ قرار دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ نے بھی اس نظریہ کی تائید کی ہے:

"اعلیٰ التعلیم کے لئے مسلمانوں کی جدید تحریک میں وہ ذہنی اتحاد مضمر ہے جو ان شگافوں کو جو اختلافات اور تہذیبی روایات کی بنا پر پیدا ہوچکے ہیں اگر بالکل بند نہ کر سکے تو کم یقیناً کر دے گا"

اور نا شدنی بدگمانیوں اور شاعرانہ خیال آفرینیوں کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے ؎

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارہ میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت بھی تو ہوتا ہے گماں اور

کانفرنس کی ابتدا

جیسا کہ ہر بڑے کام کا عموماً دستور ہے مثل خود کانفرنس کے اس کے خطبوں کی ابتدا بھی نہایت سادہ طریقہ سے ہوئی۔ صدر چند مختصر الفاظ میں اپنے انتخاب کا شکریہ ادا کرکے آغاز کارروائی کی اجازت دیتا اور کارروائی شروع ہوجاتی اور اس کارروائی میں بھی بہت زیادہ پھیلاؤ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ سوائے تشویق ترویج تعلیم کے دوسرے مہمات امور تعلیم اس وقت مسلمانوں کے سامنے نہ تھے۔ اس کے بعد کانفرنس کی ضرورت پر بحث شروع ہوئی۔ پھر اس کے فوائد بیان ہونے لگے، اس کے بعد رد اعتراضات کی احتیاج لاحق ہوئی۔ زاں بعد سال بسال ترقی تعداد ممبران پر اظہار مسرت کی نوبت آئی جو کانفرنس کے ساتھ عام مخالفت کا ثبوت تھا، یہاں تک کہ وسیع مسائل پر نظر ڈالی جانے لگی۔ ان مسائل کے لحاظ سے تجاویز پاس ہونے لگیں تو اب کہا جانے لگا کہ کانفرنس صرف باتیں بنانے کے لئے ہے۔ اس طعن کا ۱۸۹۲ء میں سرسید

نے بحیثیت سکرٹری کانفرنس اپنی سالانہ رپورٹ میں یہ جواب دیا کہ

"اس کانفرنس کا کام یہ ہے کہ آپس میں صلاح و مشورہ سے باتفاق جم غفیر مسلمانوں کے اس بات کو قرار دے کہ کیا امر مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی قومی ترقی کے لئے مفید ہو اور سب پر ظاہر کرے اور اُن کے فوائد کو قوم کے دل نشین کرے۔ اُن کی تعمیل ہونی کانفرنس کی قدرت اور اختیار سے باہر ہے۔ یہ خود قوم کا کام ہے کہ جس تجویز کو خود انھوں نے قوم کے لئے مفید قرار دیا ہے اس کے عمل درآمد میں کوشش کریں"۔

پھر ۱۸۹۵ء میں نواب محسن الملک بہادر مرحوم نے اس اعتراض کے اسی جواب کو اپنی مخصوص شان ادب کے ساتھ اس طرح دُہرایا:

"لوگ جمع ہوتے ہیں اور اپنی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور جو کچھ باتفاق قرار پاتا ہے وہ رزولیوشن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں تمثیلاً اس طور پر سمجھنا چاہیئے کہ کانفرنس ایک مجمع ہے قومی بیماریوں کی تشخیص اور اس کے لئے دوا تجویز کرنے والوں کا اور رزولیوشن نسخہ جو باتفاق اطبا لکھا جاتا ہے مگر 'حضرات' افسوس ہو کہ اس نیک کام پر بھی کبھی بے دردی سے ملامت کی جاتی ہے۔ کوئی ہمیں بوالہوس کہتا ہے، کوئی ہماری کارروائی کو فضول اور لغو بتلاتا ہے، ہماری اسپیچیں بیہودہ بکواس سمجھی جاتی ہیں اور ہمارے لکچروں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور عملی نتائج نہ ظاہر ہونے کا تو عموماً ہم پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

صاحبو ہم خود جانتے ہیں اور اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اب تک ہمارے کاموں کا کوئی نمایاں نتیجہ ظاہر نہیں ہوا اور کوشش تحریر و تقریر کی حد سے باہر نہیں نکلی مگر صاحبو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم منادی کرتے ہیں اور جوش دلانے اور سمجھانے اور تدبیریں بتانے کے سوا قوم سے کام لینے کا اور کیا ذریعہ رکھتے ہیں .... ہم نے قوم کو اُن کے بزرگوں کی شان و شوکت یاد دلائی، اُن کی شان میں قصیدے پڑھے، کبھی دل خوش کن قصہ سنا کر انھیں جوش دلایا اور کبھی پر درد داستانیں سنا کر ان کو رلایا .... مگر افسوس ہے کہ عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اور کانفرنس کے حلقہ سے باہر نکل کر کسی نے اس کا خیال نہ رکھا۔ ہم کو اس پر مایوسی ہی ہوئی مگر کیا کیجیے .... محبت کی آگ سینہ میں بھڑک رہی ہے کہ وہ کسی طرح نہیں بجھتی اور قومی محبت کا درد دل میں سما گیا ہے کہ وہ کسی طرح نہیں جاتا، ملامتیں سنتے ہیں طعنے سنتے ہیں، ناامیدیاں دیکھتے ہیں مگر جو سودا سر میں سما گیا ہے وہ نہیں جاتا ؎

چوں محبت شعلہ در خرمن زند — شوق خاکستر شدن دامن زند

فال بے تابی چو بسمل می زنند — دست در دامان قاتل می زنند"

لیکن ایثار اور سعی و استقلال کا خدا نے یہ پھل دیا اور کانفرنس کو وہ ہر دل عزیزی حاصل ہوئی کہ ایک "ہندگیر" (آل انڈیا) تحریک قرار پائی اُس کے ارکان کی تعداد کا شمار درجنوں سے گزر کر ہزاروں تک پہونچا، اس کی آواز کل قوم کی متفقہ آواز

سمجھی جانے لگی۔ گورنمنٹ (یا جس کسی) کو کانفرنس نے مخاطب کیا اُسے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور اس سارے مجموعہ کا نتیجہ قوم کے حق میں جس درجہ مفید و منفعت بخش نکلا اس کی شاہد مسلمانان ہند کی گزشتہ سی ۳۰ سالہ تاریخ ہے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

کانفرنس کی خدمات کا اجمال

کانفرنس کے اس اثر و نفوذ سے جو حسب دل خواہ نتائج مترتب ہوئے ان کی تفصیل بجائے خود ایک دفتر چاہتی ہے۔ ماقل و دل اجمال یہ ہے کہ مسلمانوں کو چار دانگ ہند میں تعلیم کی طرف متوجہ کیا، قوم کے ہونہار بچوں کے لئے وظائف کا انتظام کیا، قومی تعلیم گاہیں قائم کیں، تعلیمی مصارف کی بہم رسانی کی سبیلیں نکالیں، مسلمانوں کے جمود میں تحرک و سیلان پیدا کیا۔ مسلمانوں کو تعلیم نسواں و بالغان و معذورین، مدارس شبینہ، صنعت و حرفت، تجارت وزراعت اور پیشوں کی تعلیم اور تربیت جسمانی کی جانب توجہ دلائی۔ ہر جدید تعلیمی تحریک (مثلاً مفت جبری ابتدائی تعلیم، کلکتہ یونیورسٹی کمیشن وغیرہ وغیرہ) کے متعلق قوم کو صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کی۔ گورنمنٹ کو ہمیشہ مسلمانوں کے ہر قسم کے جائز تعلیمی حقوق و ضروریات کی جانب متوجہ کیا، حتیٰ کہ اس باب میں بعض دیسی ریاستوں کا دروازہ بھی بار بار کھٹکھٹایا۔ دوسری اسلامی درس گاہوں کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مساعی جمیلہ میں سب سے زیادہ حصّہ لیا۔ ہر صوبہ کے مختص حالات کے اعتبار سے وہاں کے مسلمانوں کے اندر ترویج و ترقی تعلیم کی ایسی راہیں نکالیں جن تک خود اس صوبہ والوں کی

نظر و دسترس نہ تھی۔ مسلمانوں کو ترتیب مجالس کے نئے ڈھنگ سکھائے۔ یہ واقعہ ہے کہ قوم کے اندر بعض جوہر قابل ایسے تھے کہ اگر کانفرنس ان کو قعر گمنامی سے نہ نکالتی تو ان کی استعداد ہرگز ظاہر نہ ہوتی اور دنیا اُن کے فیض سے محروم رہتی، وہ درخشاں ستارے تھے جو کانفرنس کے افق سے بلند ہوئے اور عالم کو اپنی روشنی سے بھر دیا۔ اب بھی کتنے گوہر نایاب اور در یتیم ایسے ہوں گے جن کے لئے کان کنی کی جاں کنی برداشت کرنا اور غواصی کی مصیبت جھیلنا اس کانفرنس کے اعوان و انصار کا مقدس ترین فرض ہوگا ؎

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہونگے — کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دست دور میں ایسے کھلے ہونگے — کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

اس نے جس قسم کا لٹریچر شایع کیا (اور کر رہی ہے) وہ ادب اُردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کی تعلیمی لائبریری بر اعظم ہند میں اپنی نظیر آپ ہے۔ کانفرنس کے فوائد کے متعلق نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپنے ۱۹۱۱ء کے ایڈرس میں جو کچھ فرمایا تھا اس کا خلاصہ یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"ذرا نظر اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کانفرنس کی بدولت اسلامی ہندوستان میں کس قدر انقلاب و توقع پذیر ہوا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کانفرنس نے ہماری قوم کے سوائے دیگر اقوام کی کوششوں میں ایک نمایاں تحریک پیدا کی ہے۔ جس وقت تک اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے منعقد کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، کیا اُس وقت صوبہ سندھ پر ایک بے حسی کا عالم طاری نہ تھا؟ کیا اسی

کانفرنس کی مساعی جمیلہ سے مشرقی بنگال اور بہار اس خواب گراں سے جو بظاہر لاانتہا معلوم ہوتا تھا، بیدار نہیں ہوئے۔ مدراس، بمبئی، اور سنٹرل انڈیا کے مسلمان یکے بعد دیگرے سب کے سب اس سے فیض حاصل کر چکے اور متاثر ہو چکے ہیں اور ان دونوں صوبوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جن کو اس تحریک کے جائے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے یا نہیں تاہم میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ میری رائے میں مسلم لیگ بھی اسی تحریک کے نتائج میں سے ہے اور بالآخر میں اتنا اور عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ یہ زیادہ تر اسی کانفرنس کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا خیال جو مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے کے وقت ہی سے پیشوایانِ قوم کے دلوں میں آرزوئے دیرینہ کی مانند جاگزین تھا، اب عملی صورت میں نمودار ہو گیا ہے حتیٰ کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک تمام مسلمانان ہند کی قومی آرزوؤں اور خواہشوں میں سب سے بڑی یہی خواہش و آرزو ہے۔

اس کانفرنس اور لیگ کی بدولت ہمارے ہم مذہب برادران ہند کا رشتۂ اتحاد و اتفاق روز بروز زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔"

سنہ ۱۹۱۳ء کے ایڈریس میں جسٹس شاہ دین مرحوم نے کانفرنس کی کارگزاری کے متعلق کہا تھا کہ

"میری پہلی صدارت (۱۸۹۴ء) کے بعد جو زمانہ گزرا ہے اس میں مسلمانانِ ہند نے بہت کچھ تعلیمی ترقی کی ہے۔ مغربی طریقۂ تعلیم کے خلاف تعصب قوم میں قریب قریب ہر جگہ مفقود ہو گیا ہے اور قوم تعلیمی معاملات میں بہت کچھ اولوالعزمی دکھانے لگی ہے اور بہ حیثیت مجموعی یہ زمانہ سابق کی نسبت مسلسل ترقی کا زمانہ رہا ہے اور قوم میں ایک خاص درجہ تک شعورِ نفس اور احساسِ اتحاد پیدا ہو گیا ہے۔"

گزشتہ چہل سالہ اجلاس (مدراس ۱۹۲۷ء) کے موقع پر جو گویا کانفرنس کے کمالِ عقل و شعور کا سال تھا اس کے پختہ کار و جہاں دیدہ صدر سر شیخ عبدالقادر نے تصدیق کی کہ

"زمانہ حال میں ہماری قوم نے جو کچھ بھی ترقی کی ہے یہ سب سرسید کی سرگرم مساعی کا نتیجہ ہے۔ مرحوم اس کانفرنس کے اولین بانی اور سکرٹری تھے اور اس سے انھوں نے یہ کام لیا کہ مسلمانوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا ہو اور وہ اپنی آپ مدد کرنے کا بلند خیال پیشِ نظر رکھیں۔ اس اہم مقصد کی اشاعت اس مرحوم رہ نمائے قوم کی زندگی بھر جاری رہی ہے اور اُن کے انتقال کے بعد اس کام کا بیڑا ان کے دوست اور رفیق نواب محسن الملک مرحوم نے اٹھایا اور اُن کے بعد ان کے دوسرے ان تھک رفیق نواب وقارالملک مرحوم نے اس مفید کام کو جاری رکھا۔

یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس جماعت کی کارگزاری اور

اس کے دل چسپ دور ترقی کا ذکر بہ تفصیل آپ کے روبرو کیا جائے یا ان سب بزرگان ملت کے نام لئے جائیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً کانفرنس کی کامیابی میں مدد دی ہے بس اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ گزشتہ چالیس سال میں جس قدر بھی بڑے بڑے آدمی مسلمانان ہند میں ہوئے ہیں جنھوں نے اچھی اچھی خدمات قومی انجام دی ہیں انھیں بالعموم اس کانفرنس سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔"

غرض کا ایک زمانہ تھا کہ قوم ترقی کے زینوں کو اس طرح طے کرنے لگی تھی کہ خود مسلمان نازاں تھے تو اغیار ششدر و حیراں ؎

ویصعد حتی یظن الوری

بان لہ حاجۃ فی السّماء

لیکن کانفرنس کی بنا اور ترقی اور چہل سالگی کے درمیان ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں پر جو مخالف

انقلاب عظیم

طاری ہوا ہے اس نے حالات یک قلم منقلب کر دئے ہیں۔ گزشتہ صدی کے آخر ربع میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو میں اپنے سنہ ۱۹۲۵ء کی مسلم پریس کانفرنس کی استقبالی جماعت کے خطبہ صدارت سے نہایت اختصار کے ساتھ اخذ کر کے ذیل میں درج کرتا ہوں:

"مجموعی طور پر جس چیز کا نام علی گڑھ تحریک ہے وہ ایسی کامیاب ہوئی کہ باید و شاید۔ جس زمانہ میں علی گڑھ تحریک شروع ہوئی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کا شیرازہ جس درجہ منتشر تھا اس کا اعادہ آپ حضرات کے روبرو طول فضول اور "لقمہ بہ لقمان"

ہے۔ لیکن آپ صرف ذرا یہ غور فرمائیں کہ اس تحریک کے ذریعہ سے چند ہی روز میں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے مسلمان کس طرح ایک مرکز پر آ گئے کہ اس کے بعد علی گڑھ سے جو تحریک اُٹھی اس پر بیک کلمہ صدائے لبیک بلند ہونے لگی' اور مسلمان جسم واحد ہو کر ہندوستان کی ترازو میں مثل اس وزن کے سمجھے جانے لگے کہ جس پلّے میں پڑجائیں اُسی کو بھاری کردیں اور جھکا دیں۔ وہ مسئلۂ ہند کا جزو لاینفک بن گئے اور باقی اجزاء میں سے ہر فریق یقین کرنے لگا کہ اس کی عافیت مسلمانوں کی اور صرف مسلمانوں کی دلدہی میں ہے۔ ان کے مطالبے بے چون وچرا منظور ہونے لگے۔ مسلمان ایک زمانہ شناس قوم سمجھے جاتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ حالت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ مسلمانوں کے مُنہ سے نکلی ہوئی بات کے اصل منشا کو پانے کے لئے بڑے بڑے مدبروں کو کم از کم تھوڑی دیر کے لئے سر بہ گریباں ہو جانا پڑتا تھا۔

جس زمانہ میں کہ مسلمانان ہند کی یہ روش تھی بیرون ہند کے مسلمانوں میں زندگی اور از سر نو تندرستی کے آثار پائے جانے لگے تھے۔ ٹرکی کے لئے "مرد بیمار" کے لفظ جو استعمال ہوتے تھے وہ معذرت کے ساتھ واپس لئے جانے لگے تھے ٹیونس اور مراکو کے معاملہ میں بھی جان پڑگئی تھی۔ افغانستان کا فرماں روائے وقت اس درجہ کے انسانوں میں تھا جو ملکوں کے مرقعوں کو بدل دیتے ہیں۔ روس کے ظالم زار کو اپنی سلطنت کے اندر اسلامی حکومتوں کی آزادی پر دست تعدی دراز کرنے سے پہلے دوبارہ سوچنا پڑتا تھا۔ مصر میں (جس پر ترکی سیادت بحال تھی) مرحوم مصطفےٰ کامل زمین و آسمان ہلا رہا تھا جس کی وفات نے مصر کے باب سیاست کو یک قلم سربمہر کردیا۔ ایران کے لئے علاوہ "کجکلاہی" کے یہ فخر بھی باقی تھا کہ دنیا میں وہی واحد

سلطنت تھی جو اغیار کی مقروض و مرہون نہ تھی۔ خلیج شاخ زرّیں سے لے کر دیوار چین تک مسلمانوں کے ڈانڈے ملے ہوئے تھے۔ اور اس قول مصدوق کی برای العین تصدیق ہوتی تھی کہ "المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً"۔

ایسے "مدبر مسلمان" دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں موجود تھے جو اپنے ملکوں اور وطنوں کی حمایت کے ساتھ عام اسلامی مسائل کی نسبت بھی کور باطنوں کی خیرہ چشمی و بیبینی کی اصلاح کرتے رہتے تھے۔ مسلمان خود اپنی مقامی حالتوں کی طرف سے اس درجہ مطمئن ہو چلے تھے کہ کم از کم انگلستان اور جاپان کو مسلمان کر لینا تو اُن کو بات معلوم ہوتا تھا۔ حتی کہ یورپ میں جہاں ایسے مدبر موجود تھے جو ٹرکی کو یورپ سے "بدھنا بوریا باندھ کر" چلتا کرنے کے منصوبے کیا کرتے تھے وہاں اُن کو دنداں شکن جواب دینے کے لئے ایسے لوگ بھی تھے جن کا (ذاتی تجربہ اور عام مشاہدہ کی بنا پر) یہ مستحکم عقیدہ تھا کہ سارا یورپ مل کر بھی ٹرکی کی چند بیرونی و دور دست فوجی چوکیوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ حالات تھے کہ یکایک واقعات نے پلٹا کھایا ؎

زمانہ دگرگونہ آئیں نہاد

شد آں مرغ کو خایہ زرّیں نہاد

۱۹۰۸ء میں سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کے عزل نے خلافت کو باسفورس میں غرق کر دیا۔ یہ گویا پیش خیمہ تھا اسلامی سیاست کی شکست کا۔ مصر کی واپسی کجا؛ بوسنیا اور ہرزیگوینا بھی ٹرکی سے چھن گئے۔ طرابلس پر اٹلی کا استیلا ہوا۔ ٹیونس و مراکش اغیار کے قبضہ میں پہونچے۔ "گریہ ایران" کا گلا گھونٹا گیا۔ ٹرکی کے دست و پا

ایک ایک کرکے قطع کئے گئے، گویا ترکی کی ترکی تمام ہوگئی۔ عرب، شام، عراق وغیرہ کی جو حالت ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ حتیٰ کہ بقاع مقدسہ (زاد اللہ شرفاً وتعظیماً وشرفنا ببقائہا) کے متعلق جو واقعات پیش آئے ان کا نہ دہرایا جانا ہی بہتر۔ سنہ ۱۹۰۹ء تک مسلمانوں کا ہندوستان کی اور ہندوستان سے باہر کی سیاست پر جو اثر تھا اس کی ادنیٰ مثال یہ واقعات ہیں :۔

لارڈ سالیبری (وزیر اعظم انگلستان) نے ایک بار کہا تھا کہ

"ٹرکی کے مخالفوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ترک ملکہ معظمہ کی مسلمان ہندوستانی رعایا کے ہم مذہب ہیں"

لارڈ مارلے (وزیر ہند) نے تقسیم بنگال کے مخالفوں کو متنبہ کیا تھا کہ

"یاد رکھئے ہندوستان کے مسلمان ترکوں کے ہم مذہب ہیں"

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد کیجئے کہ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء میں برادران وطن نے مسلمانوں کو تفاہمت کے لئے اس مقام پر مدعو کیا تھا جہاں گنگا اور جمنا ملتی ہیں لیکن اب مسلمان مثل ایک ایسی ناکارہ شئے کے ہیں جس کی کہیں بھی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ اور اکبر مرحوم کا قطعہ (جو مولویوں کے متعلق ہے) تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مسلمانوں پر پورے طور پر منطبق ہوتا ہے۔ وہو ہذا ؎

نئی روشنی کا ہوا تیل کم	حکومت نے ان سے کیا میل کم
مسلمان اب کس مپرسی میں ہیں	نہ آفس میں ہیں اور نہ کرسی میں ہیں
نئی روشنی کا ہے سب یہ ظہور	خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور"

کانفرنس کے سنہ ۱۸۸۸ء کے صدر نے بیان کیا تھا کہ

"اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ ہماری قوم میں بعض بعض اہل کمال موجود ہیں، خاص کر مشرقی علوم کے استاد اکثر پائے جاتے ہیں۔ تاہم علوم جدیدہ کے فاضلوں کی تعداد ہماری قوم میں بہت کم ہے۔"

آنکھ اٹھائیے اور بتائیے کہ کیا اب بھی ہم میں بعض بعض اہل کمال موجود ہیں خاص کر مشرقی علوم کے استاد اکثر پائے جاتے ہیں؟ کیا اس وقت ہم میں کوئی مفتی لطف اللہ، مفتی صدر الدین، مولوی عبدالحق، مولوی فضل حق، مولوی عنایت رسول، ملا نظام الدین، مولانا عبدالحی اور ان جیسے صدہا علمائے اہل کمال کا ہم پلہ کجا پاسنگ بھی نظر آتا ہے؟ پھر غور کیجئے کہ ہم میں ایسے کتنے ہیں جو علوم و فنون جدیدہ ہی میں اس پایہ کے شمار ہو سکیں جیسے وہ بزرگ (رحمہم اللہ) "مشرقی علوم" میں تھے؟ ؎

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
ورنہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

سنہ ۱۸۹۲ء کے ایڈریس میں علی رؤس الاشہاد بیان کیا گیا تھا کہ

"قوم میں اس وقت جتنی دشواریاں پڑ رہی ہیں نہ دولت کی کمی سے ہیں نہ علم سے نہ جسم سے، بلکہ آدمیوں کی کمی سے ہیں۔"

اس وقت کی حالت کا اس وقت کی حالت سے موازنہ کیجئے۔ کیا اب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں نہ دولت کی کمی ہے، نہ علم کی، نہ جسم کی؟ کیا اب بھی ہم میں کانفرنس کے ہزاروں ممبر بنتے ہیں؟ کیا اب بھی ہم کسی مسلم یونیورسٹی کی اسکیم پر چند مہینوں کے اندر پچاس لاکھ روپیہ جمع کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اب بھی کسی خلافت فنڈ کے جھولے میں ایک کروڑ روپیہ ڈال سکتے ہیں؟ لا واللہ ؎

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد
شد آں مرغ کو خایہ زرّیں نہاد

ذرا گریبان میں سر ڈالیئے اور "جسم" کی کمی بیشی کو دیکھئے جس سے مراد جسمانی قوت اور اخلاقی رعب ہے۔ ۱۸۹۲ء میں (جب کہ یہ ریمارک کیا گیا تھا) مسلمانوں میں باوجود روز افزوں ہزال بدن و زوال قوٰی کے اتنی سکت باقی تھی کہ برادرانِ وطن اُن سے آنکھ ملانے کی شاذ و نادر ہی جرأت کرتے تھے، گورنمنٹ بھی اُن سے چوکنی رہتی تھی، اور اُن کو ہمیشہ اس طرح روکا جاتا تھا جس طرح سخت مُنہ زور گھوڑے کو روکا جاتا ہے، ان میں سپاہیانہ جوش اور جنگ جویانہ روح باقی تھی، ہندوستان میں مردانہ و ورزشی فنون کا چرچا صرف اُنھیں کے دم سے قایم تھا۔ حتی کہ بنگالی استاد (جن میں جدید تعلیم کا رواج سب سے زیادہ ہے) مسلمان بچّوں پر اثر تک قائم نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ سر ولیم ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب "دی انڈین مسلمانس" میں اسے خصوصیت سے بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"His gentle and timid character unfits him to maintain order among muslim boys."

(یعنی بنگالی استاد اپنی لینت پسند اور بزدلانہ فطرت کے باعث اس قابل نہیں ہوتا کہ مسلمان بچّوں میں نظم قایم رکھ سکے)

آگے چل کر وہ ایک مسلمان دیہاتی کاشتکار کا مقولہ نقل کرتے ہیں کہ

Nothing on earth would induce

me to send my boy to a Ben-
galee teacher"

(یعنی روئے زمین پر کوئی شے مجھے ترغیب نہیں دے سکتی کہ میں
اپنے بچّہ کو ایک بنگالی اُستاد کے پاس بھیجوں)
۱۹۰۵ء کے ایڈریس میں ہو کہ
"وہ کسی نوجوان مرد سے یہ سوال ہونا بھی کہ تم گھوڑے پر چڑھنا
جانتے ہو یا نہیں ایسا ہی موجب شرم ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے یہ
معنی ہیں کہ تم اوصاف مردانگی سے معرّا ہو"

گویا اس وقت بھی ہم میں مردانہ اور سپاہیانہ عادات اس درجہ عام تھیں کہ ہر نوجوان
مرد کا گھوڑے کی سواری (اور ازیں قبیل دیگر فنون) سے واقف ہونا مسلّمات سے
تھا لیکن افسوس اب نہ وہ قوت ہو اور نہ وہ دھاک نتیجہ وہ صدہا واقعات ہیں جو
مسلمانوں کی مظلومیت و مغلوبیت کے ہر حصّہ ملک میں ہر روز دیکھنے اور سُننے میں آتے
ہیں۔ "یُفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین"

باعزّت قومی وجود کے لئے جو دو چیزیں ضروری ہیں یعنی علم و جسم (بسطۃً فی العلم
والجسم) جب وہی مفقود ہیں تو پھر مسلمانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ اسی کے ساتھ فقدان
دولت کے واقعہ کو ملائیے اور نتیجہ خود اخذ کیجئے ؎

قوم کا مبتذل ہے جو انساں	بے حقیقت ہو گرچہ ہو سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز	ہو فقیری میں بھی وہ با اعزاز
ذات کا فخر اور نسب کا غرور	اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

اب نہ سیّد کا افتخار صحیح ۔۔۔ نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
اب نہ خانی رہی نہ خانوں کی ۔۔۔ کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی
قوم کی عزّت اب ہُنر سے ہے ۔۔۔ علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں یہ دور آئے گا ۔۔۔ بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات

"کون ہم میں ایسا قوم کا طرف دار ہے جو یہ کہنے کو تیار ہو کہ ہم میں سلف ہیلپ کی بالکل طاقت نہیں ہے یا یہ کہ ہم دوسری قوموں کے مقابلہ میں بالکل بیٹھے ہیں" (ایڈریس ۱۸۹۴ء)

"کون کہتا ہے کہ ہمارے پاس نہ زمین ہے، نہ سرمایہ نہ ثروت نہ دماغی اور جسمانی قوت۔ کون کہتا ہے کہ ہم میں چلنے کی طاقت نہیں"۔ (ایڈریس مذکور)

"ہمارا علی گڑھ کالج مسلمانان ہند کا مرکزی قومی درس گاہ ہے اور ہمیشہ رہے گا اور بلحاظ ان عظیم الشان روایات اور اس بے انتہا اثر کے جو یہ قوم کی تمام بڑی بڑی تحریکات پر ہمیشہ ڈالتا رہا ہے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس درس گاہ کی عام حالت جملہ مسلمانانِ ہند کی اخلاقی اور دماغی ترقی کا اندازہ لگانے کے لئے شاید بہترین معیار کا کام دے گی کچھ شک نہیں کہ علی گڑھ کی طاقت بھی بڑی طاقت ہے"۔ (ایڈریس ۱۹۱۳ء)

کیا یہ دعوے جو اپنے اپنے وقت پر بالکل صحیح تھے، موجودہ واقعات کے ساتھ

منطبق ہوتے ہیں ؟

خلاف ازیں اس زمانہ کے حالات دائرہ یہ ہیں کہ

گورنمنٹ کا رویہ مسلمانوں کے متعلق یک قلم بدل گیا ہے، اول تو اس زمانہ کے ذمہ دار برٹش مدبر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسلمان کسی خاص حق کے مستحق نہیں ہیں؛ دوسرے اگر وہ اس کے خلاف رائے بھی رکھیں تو جدید نظام حکومت کے ماتحت اس رائے کو عملی شکل دینے کی وہ مطلق قوت و آزادی نہیں رکھتے۔

بہت سے سرکاری صیغے، صیغۂ منتقلہ کی ضمن میں آ گئے ہیں اور ان پر اکثر غیر ہمدرد ابنائے وطن کا قابو ہوتا ہے۔

قومی کشاکش پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

مسلمان خود اندرونی طور پر شاخ در شاخ ہو رہے ہیں اور میدان سیادت و قیادت میں ایسے لوگ آئے ہوئے ہیں کہ مثلاً اگر وہ معاملات تعلیم پر بحث کرتے ہیں تو بقول ایک بہت بڑے مسلمان لیڈر کے

"ایسے لوگ جو ہندوستان کے تعلیمی مسئلہ کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں، اخبارات میں ایسی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ جن سے ان اصحاب کے بھی ہوش اڑ جائیں جنھوں نے خود یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی ہے"

غرض یہ منقلب شدہ اور روز افزوں انقلاب پذیر حالات ہیں جن سے اس وقت مسلمان دوچار ہیں، ان حالات میں یہ مسئلہ نہایت غور طلب ہے کہ

کانفرنس کا آئندہ نظام عمل

کیا ہونا چاہیئے۔ یہ مسئلہ کچھ آج نیا نہیں چھڑا جا رہا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی جانب اکابر قوم

کی توجہ بہت پہلے سے مبذول ہو اور کیوں نہ ہو تغیرات حالات کا مقابلہ اگر مناسب تغیرِ عمل سے نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی نظام خوبی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ ٹھنڈے موسم میں ٹھنڈے کپڑے کام نہیں دے سکتے۔ گرم موسم میں گرم کپڑے اتار دینے پڑتے ہیں۔ "در مع الدھر کیف ما دار" ؎

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

سنہ ۱۹۱۳ء میں جسٹس شاہ دین مرحوم نے (بحیثیت صدر) تحریک کی تھی کہ

"بہت سی اہم ضروریات میں سے جن کی طرف ہم کو فوراً متوجہ ہونا چاہیئے سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے نظام کی اصلاح کریں اور اس کو تقویت دیں .... اور اسی اصول کو مدنظر رکھ کر کانفرنس کو بھی اپنی طاقت وحلقۂ اثر کو تقویت پہونچانا چاہیئے"

سنہ ۱۹۲۰ء کے صدر اجلاس کی رائے تھی کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ کانفرنس کو اب اپنے پروگرام میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے نہ صرف اس لئے کہ حالات بدل گئے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ صیغۂ تعلیم خود تمھارے ہاتھ میں دے دیا گیا .... آل انڈیا کانفرنس کے جلسے اس شان اور نوعیت کے ساتھ منعقد کرنے کی ضرورت نہیں جیسے اب تک ہوتے آئے ہیں اس کانفرنس نے اپنا بڑا کام بخوبی انجام دے دیا اب جو کام ہے اکسپرٹ لوگوں کے باہمی مشورہ کے بعد ضروریات قوم پر اظہار رائے کا طویر کیا جائے۔ اور اُس کے لئے کسی عام اژدحام کی نہ

ضرورت ہے اور نہ حاجت - میں امید کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر خاص توجہ
کی جاوے گی اور آیندہ کے لئے ایک معین پروگرام پیش نظر رکھا جائے گا"۔

۱۹۲۷ء کے اڈریس میں کانفرنس کے متعلق "بعض لوگوں کی رائے کے میلان"
کا اظہار تھا جس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہے کہ اب مختلف دماغ کانفرنس کے نظام عمل
کی تبدیلی کے خواب دیکھنے لگے ہیں :

"کچھ عرصہ سے بعض لوگوں کی رائے کا یہ میلان ہے کہ اب اس
تعلیمی کانفرنس کی بہ حیثیت ایک ایسی جماعت کے جو سارے ہندوستان
کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی علم بردار ہو ضرورت نہیں رہی - کہا جاتا ہے
کہ وہ پُر زور مخالفت جو ایک زمانہ میں تعلیم جدید اور انگریزی پڑھنے سے
متعلق تھی اور جس کا مقابلہ سر سید مرحوم کامیابی سے کرتے رہے اب
باقی نہیں رہی بلکہ حضرات علما بھی موجودہ تعلیم یا کم از کم تعلیم جدید اور
مذہبی تعلیم کو یک جا کرنے کے موافق ہوگئے اور اس لئے ہمیں اس کانفرنس
کے مقاصد کی اشاعت پر خرچ کرنے اور اس کے لئے تکلیف اُٹھانے
کی ضرورت نہیں - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اب ملک کے مختلف حصوں میں
صوبہ وار تعلیمی کانفرنسیں پیدا ہوگئی ہیں اور وہ اپنے اپنے صوبہ کی تعلیمی
ضروریات کی اچھی طرح نگرانی کرتی ہیں اور اس صورت میں آل انڈیا
اجتماع کی اور اُس کے مصارف کثیر برداشت کرنے کی حاجت نہیں رہی"۔

مندرجۂ بالا اقتباسات سے ثابت ہے کہ قبل اس کے کہ کوئی خارجی قوت
کانفرنس کو اس نظام عمل کے تبدیل کرنے پر مجبور کرے اُس کا خود ہی اس باب میں پیش قدمی

کرنا اولیٰ ہے۔ اپنی عمر کی چالیس منازل طے کرنے کے بعد اُسے جو تجربات حاصل ہوئے ہیں اوّل اُن کو کام میں لائے، اس کے بعد حسب ضرورت دوسرا قدم اُٹھائے۔ غالباً آیندہ کامیابی کے لیے مقدم شرط یہ ہوگی کہ کانفرنس لامرکزیت کے دائرہ سے نکل کر اپنی مرکزیت قایم کرے اور تمام صوبوں میں اپنی شاخیں پھیلائے جو اپنی نوبت میں سہل العمل طریقہ سے اپنی تجزی کریں اگر اس تنظیم میں کانفرنس نے کافی کامیابی حاصل کرلی تو یقین ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہر دوسری تجویز و تحریک میں کامیابی ہم رکاب ہوگی

اس کے بعد کانفرنس کو چاہیے کہ اپنے مقاصد اور منظور شدہ تجاویز کا الی الان جائزہ لے اور جو مقاصد اب تک اچھوتے رہے ہیں اور جن تجاویز پر اب تک بالکل عمل نہیں ہوا یا ناکافی عمل ہوا ہے (اور اب بھی اُن کے متعلق کسی مزید کارروائی کی گنجایش باقی ہے) اُن کی طرف توجہ کی جائے۔

کانفرنس کے مقاصد ہم اوپر (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۲ و ۲۳) نقل کر چکے ہیں۔ اُن کے بارہ میں جہاں تک ہمیں علم ہے کانفرنس نے اب تک اپنی تمام تر قوت صرف پہلے مقصد (اشاعت علوم جدیدہ) پر صرف کی ہے۔ مقاصد نمبر ۲ و ۴ و ۵ و ۶ و ۸ تشنہ ہیں اور باقی نمبر ۳ و ۷ و ۹ و ۱۰ ہنوز معرض التوا میں ہیں۔ مقصد چہارم کی نسبت موجودہ آنریری سکرٹری (نواب صدر یار جنگ بہادر) کے اوائل عہد میں کچھ کارروائی ہوئی تھی مگر (غالباً نامساعدت زمانہ کے سبب سے) اُس نے کوئی قابل ذکر مرحلہ طے نہیں کیا۔

گزشتہ چالیس بیالیس سال کے اندر جس قدر تجاویز کانفرنس کے ایڈریسوں میں آئیں یا اجلاسوں میں منظور ہوئیں ان کا استقصا یا ان پر مفصل بحث کرنا طوالت سے خالی نہیں، اس لیے صرف ان میں سے بعض کی جانب اشارۃً کچھ عرض کرنے پر اکتفا

کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے سر تھیوڈ ور ماریسن نے (سنہ ۱۹۰۴ء میں) مسلمانوں کے مالی افلاس کے دفعیہ کی ضرورت ظاہر کی تھی اور اس کو انھوں نے دماغی افلاس پر ان الفاظ میں مقدم کیا تھا:

"جس مرض کا ہم کو علاج کرنا ہے وہ دو قسم کا ہے اوّل مالی افلاس دوسرے دماغی افلاس و اخلاقی پستی .... ان دو امراض میں مالی افلاس کی طرف ہم کو سب سے اوّل توجہ کرنی چاہئے کیوں کہ وہ سب سے اہم ہے۔ یورپ میں بھی تعلیم کا عموماً یہی مفہوم ہے۔ اکثر متوسط الحال لوگ (اور یہی جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوتی ہے) اپنی اولاد کو بہتر سے بہتر تعلیم اس لئے دلاتے ہیں کہ وہ عزت سے روٹی کما سکیں .... مجھے یقین ہے کہ آپ کے نزدیک بھی اس کانفرنس پر تعلیمی کانفرنس کا لقب عاید نہ ہو سکے گا اگر ہم ایسی تجاویز پر بحث نہ کریں جن سے متوسط درجہ کے مسلمانوں کا افلاس دور ہو۔"

اس تعلیم سے مراد اُن کی آزاد پیشوں کی تعلیم تھی جس میں صنعت و حرفت، زراعت، تجارت، وکالت، طبابت اور اسی قسم کی تمام تعلیمیں شامل ہیں۔ جس سرعت سے مسلمانوں کا افلاس بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی ترقی میں روز بروز زیادہ پیچھے ہوتے جاتے ہیں اور جس تیزی اور اہتمام کے ساتھ ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کئے جا رہے ہیں اس کا اقتضا یہ ہے کہ اس ام المسایل پر بلا تضیع وقت توجہ کی جائے کہ "الفقر سواد الوجه فی الدارین" ہے۔

شب چو عقد نماز بربندم
چہ خورد بامداد فرزندم

مسلمانوں میں اس وقت بھی خدا کے فضل سے کروڑوں روپیے سالانہ آمدنی کے اوقاف موجود ہیں اور آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اگر یہ کسی قابل اطمینان نظام کے ماتحت آجائیں تو مسلمانوں کی بہت سی مشکلات یک قلم دور ہوسکتی ہیں۔ اسی قبیل سے ایک یہ تحریک ہے کہ جو مسلمان اپنی امانتوں پر بنکوں سے سود نہیں لیتے وہ اس کو اسلامی انسٹی ٹیوشنوں کی طرف منتقل کردیں۔

کانفرنس نے اب تک قرض حسنہ پر غالباً لاکھوں روپیہ صرف کیا ہے اور چند سال سے وہ اس کی واپسی کی بھی کوشش کرتی ہے۔ لیکن ابھی اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی حالاں کہ اگر اس سلسلہ کا نظام درست ہوجائے تو غریب ہونہار مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے معقول و مستقل امداد حاصل ہوسکتی ہے۔

علاوہ بریں مسلم یونیورسٹی کے حالات کی جانب اعتنا بھی کانفرنس کے فرائض اولیہ سے ہونا چاہئے۔ یونیورسٹی کی تخلیق میں کانفرنس کا جو حصہ ہے اس سے کانفرنس خود واقف ہے۔ پھر جاہ ملاصق اور ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی تعلیم گاہ ہونے کی حیثیت سے اس کے جو حقوق ہیں وہ بھی اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے بعد کوئی وجہ نہیں ہے کہ کانفرنس یونیورسٹی کی اصلاح حال میں معین نہ ہو ؎

دوست آں دانم کہ گیرد دستِ دوست | در پریشاں حالی و در ماندگی
دوست مشمار آں کہ در نعمت زند | لاف یاری و برادر خواندگی

کانفرنس کے موجودہ آنریری سکرٹری نواب صدر یار جنگ بہادر کے دور پر

اس کے چالیسویں اجلاس کے صدر سر شیخ عبدالقادر نے جن الفاظ میں تبصرہ کیا ہے وہ درحقیقت حق بحق دار ہے:

"ان کی اسلامی محبت، اور مسلمانوں کی مذہبی علمی ترقی سے اُن کی گہری دلچسپی آپ صاحبان سے پوشیدہ نہیں۔ اُن کی کوشش سے وہ روایات جو اس کانفرنس سے مخصوص تھیں قائم رہیں وہ اعلیٰ تخیل جو کانفرنس کے ممتاز بانی نے پیش کیا تھا قوم کی نگاہ میں جچا رہا جنگ عظیم کے حوصلہ فرسا زمانہ میں اور ان تغیر حالات میں جو جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوئے کانفرنس جیسی محض ایک تعلیمی جماعت کی مشعل کو روشن رکھنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے واقعات کے بعد جو سیاسی جوش ملک ہند میں پیدا ہوا اُس کی موجودگی میں لوگ سوائے سیاسیات کے کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور ہماری قوم اس قاعدہ کلیہ سے کچھ مستثنیٰ نہ تھی۔ دیگر ابنائے وطن کی طرح اُن میں بھی ہیجان تھا اور اُن کے دماغ بھی سیاسی امور کے متعلق کوئی فوری تغیر پیدا ہوتے کے خواب دیکھ رہے تھے کوئی مشورہ جو دور اندیشانہ ہوتا نہیں جاتا تھا۔ اگر کوئی اُن سے کہتا تھا کہ تعلیم وسیع پیمانے پر پھیلانی چاہئے اور بہت گہری ہونی چاہئے اور اس کے بعد سیاسی ترقی کی امید رکھنی چاہئے تو اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں کرتا تھا بلکہ بعض لوگ اس رائے پر ہنستے تھے اور اسے دقیانوسی اور پارینہ بتاتے تھے مگر ہمارے باہمت سکرٹری صاحب ان نامساعد حالات سے خوف زدہ نہ ہوئے اور انھوں

نے خاموشی مگر استقلال کے ساتھ اس کام کو جو اُن کے سپرد ہوا تھا
جاری رکھا۔"
شاعر کہتا ہے ؎

نشاط عمر باشد تا بہ سی سال
چو چل آمد فرو ریزد پر و بال

لیکن قوی امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ نواب صاحب ممدوح کی مسلمہ قابلیت و حُبّ
قومی و شغف خدمت کانفرنس کو واقعی بے بال و پر یا بے دست و پا ہونے سے قبل اپنے
سن (چہل سالگی) کے دوسرے پہلو (کمال قوائے عقلیہ) سے بیش از بیش مستفید ہو سکنے
کا موقع بہم پہونچائے گی۔ والتوکل علی اللہ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ۔

دعا ہے کہ خداوند قادر و قیوم عام مسلمانوں اور ممبران کانفرنس کمیٹی کو ایسی توفیق عطا
فرمائے کہ وہ اس عہد اور اس زمانہ کو بھی مغتنم سمجھیں اور اس نظام سے (جو مسلمانان ہند کا
واحد تعلیمی مرکزی نظام ہے) مسلسل و بیش از بیش فوائد حاصل کرنے کی سعی
مشکور کریں ؎

اقول لصاحبی والعیس تھوی | بنا بین المنیفۃ والضمار
تمتع من شمیم عرار نجد | فما بعد العشیۃ من عرار

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

علی گڑھ:
ربیع الآخر ۱۳۴۷ھ
(اگست ۱۹۲۸ء)
دوشنبہ

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر
صدر اجلاس سي و یکم (کلکتہ سنہ ۱۹۱۷ ع)

اجلاس سی ویکم

(منعقدہ کلکتہ سنہ ۱۹۱۷ء)

صدر نواب حیدر نواز جنگ بہادر محمد اکبر نذر علی حیدری

حالات صدر

محمد اکبر نذر علی حیدری کے آبا و اجداد عرب سے بغرض تجارت پہلے کھمبائت (Leambay) اور بعد میں بمبئی میں آکر آباد ہوئے۔ مسٹر حیدری سیٹھ نذر علی مرحوم کے فرزند ہیں۔ یہ ۸ رنومبر سنہ ۱۸۶۹ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اپنی والدہ اور نانی سے پائی بعد ازاں کھیت واڑی بمبئی کے اینگلو ورنیکولر اسکول میں داخل کئے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد الفنسٹن ہائی اسکول میں تعلیم پاکر چھ مہینے کے بعد سینٹ زیویر ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ جہاں سے میٹرک پاس کیا اور بعد ازاں سینٹ زیویر کالج سے سترہ برس کی عمر میں بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی۔ ابتدا ہی سے ان کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ شروع سے آخر تک ہر امتحان میں انھوں نے شاندار کامیابی حاصل کی اور انعامی وظائف پاتے رہے اسکول اور کالج میں خاص طور پر ان کو تاریخ خصوصاً تاریخ ہند، معاشیات (اکنومکس)، انگریزی ادب اور لاطینی زبان سے دلچسپی تھی اور انھیں مضامین کا انتخاب انھوں نے اپنے امتحان کے لئے کیا تھا۔ بی اے آنرس کے امتحان میں کامیابی کے بعد ایل ایل بی کی جماعت میں شرکت کی اور اس کا پریویس امتحان پاس کرلیا مگر اسی اثنا میں انڈین فینانس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا نے اُن کا انتخاب کیا اس لئے قانونی ڈگری کی تکمیل نہ کرسکے۔ انڈین فنانس ڈپارٹمنٹ کے امتحان مقابلہ میں سب سے اول آئے اس کے بعد ان کا تقرر انڈین فینانس ڈپارٹمنٹ میں سنہ ۱۸۸۸ء میں عمل میں آیا اور اسسٹنٹ کنٹرولر کی حیثیت سے ناگپور میں مقرر ہوئے۔ وہاں ان کی کوشش سے انجمن حامی اسلام کی بنیاد ڈالی گئی جس کے یہ لائف پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اسی انجمن کی کوشش سے ایک اسلامی اسکول قائم کیا گیا جو اب ترقی کرکے ہائی اسکول کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔

جولائی ۱۸۸۹ء میں لاہور کے کرنسی آفس میں تبادلہ ہوا مگر وہاں قیام صرف چار مہینے رہا اور وہاں سے کلکتہ تبدیل کئے گئے یہاں بھی صرف چار مہینے رہے۔ اس کے بعد بحیثیت اسسٹنٹ اکونٹنٹ جنرل کے الہ آباد بھیجے گئے۔ جہاں محمڈن بورڈنگ ہاؤس الہ آباد کی تعمیر میں دلچسپی کا موقع ملا اور محمڈن بورڈنگ ہوس میور سنٹرل کالج کی نشوونما میں آپ نے بڑی مدد دی۔ جب اپریل ۱۸۹۳ء میں الہ آباد سے بمبئی کو تبادلہ ہوا تو الہ آباد کے ہندوؤں نے بھی آپ کو ایک وداعی جلسہ دیا۔ قیام بمبئی کے زمانہ میں مسٹر حیدری کی شادی اُن کے ماموں نجم الدین طیب جی مرحوم کی پانچویں لڑکی سے ہوئی جو ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں جن کا اثر حیدری صاحب کی زندگی پر گہرا پڑا ہے۔

۱۸۹۷ء میں مسٹر حیدری بحیثیت ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل کے مدراس گئے۔ جہاں اُنھوں نے انجمن اسلامیہ اور محمڈن لٹریری سوسائٹی کے فروغ میں حصہ لیا۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں ہندوستان اور برہما کے سرکاری مطابع کے حسابات کی تنقیح اور جانچ کا کام خاص طور پر اُن کے تفویض ہوا جس کے اثنا میں اُن کو ہندوستان اور برہما کے بڑے بڑے شہروں کے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ کام ختم کرکے تمام سرکاری پریسوں کے متعلق اُنھوں نے مبسوط اور مکمل رپورٹ اور ایک اسکیم جو "حیدری اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی جس پر حکومت ہند نے اظہار خوشنودی کیا۔

۱۹۰۵ء میں فینانس کے تجربہ کے لحاظ سے اُن کی خدمات اکونٹنٹ جنرل کے عہدہ کے لئے سرکار عالی نظام خلداللہ ملکہ میں گورنمنٹ ہند سے حاصل کی گئیں۔ اُنھوں نے اس عہدہ کا چارج لے کر دفتر صدر محاسبی میں مناسب اصلاحیں کیں۔ ۱۹۰۷ء میں معتمد فینانس مقرر ہوئے۔ اُن کی خدمات کا اعتراف معین المہام فینانس سر کیس واکر نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"گزشتہ نو سال کے فنانس کے کاموں سے جو منافع مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں۔ اُن میں گزشتہ پانچ سال تک اول بحیثیت صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) ازاں بعد من حیثیت معتمد (سکرٹری) فنانس مسٹر حیدری نے نمایاں اور موثر حصہ لیا۔"

اس زمانہ میں یورپین اور ایشیائی تعلیمی وظائف کے لئے کمیٹی کے ذریعہ سے اُمیدواروں کا انتخاب سول سروس کلاس کے دوبارہ قائم ہونے اور محبوبیہ گرلز اسکول کی ترقی میں مسٹر حیدری نے خاص حصہ لیا۔ جولائی ۱۹۱۱ء میں معتمد عدالت و کوتوالی و تعلیمات وطبابت و امور عامہ مقرر ہوئے۔ مسٹر حیدری کی تحریک پر حکومت ہند سے ایک ماہر تعلیمات مسٹر میہو کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مسٹر میہو نے بحیثیت مشیر تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی دورہ کیا۔ تمام مدارس کو دیکھا اور دو برس کے بعد ایک مبسوط رپورٹ پیش کی جس میں آیندہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں تعلیم کو ترقی دینے اور دیہات، قصبات اور شہروں میں مختلف درجوں کے مدارس قائم کرنے کے متعلق تجاویز اور تحریکات تھیں۔ مسٹر حیدری نے اس رپورٹ کو اپنی رائے کے ساتھ

سرکارعالی میں پیش کیا جو منظور ہوئی اور ان تجاویز پر بتدریج عمل شروع کیا گیا۔ مسٹر حیدری نے اردو عثمانیہ یونیورسٹی (جامعہ عثمانیہ) میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کے سوا اور بھی مفید عام خدمات اس زمانہ میں انجام دیں۔
۱۹۱۵ء میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اولین کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں مسلمانان جنوبی ہند نے اپنی تعلیمی کانفرنس منعقدہ وانمباڑی کی صدارت کے لئے منتخب کیا۔ اسی سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے اجلاس کلکتہ کے صدر نشین مقرر ہوئے۔ حیدری صاحب کا تعلق ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں سے ہے۔ چنانچہ آپ بمبئی، مدراس، ڈھاکہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ کے فیلو ہیں اور ان میں سے آخر الذکر تین یونیورسٹیوں کے انتظامی کونسل اور کورٹ اور مجلس اعلیٰ کے رکن بھی ہیں۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں سرکار عالی کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر حکومت ہند کی ملازمت پر واپس ہوئے اور صوبہ بمبئی کے اکونٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ہندوستانی کو درجہ اول کی اکونٹنٹ جنرل کی خدمت دی گئی۔ چند ماہ کے بعد حکومت ہند کی سرکار سے وظیفہ پاکر حیدرآباد واپس آئے اور معتمدی عدالت وغیرہ پر دوبارہ متعین ہوئے۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں مسٹر گلانسی صدر المہام فینانس حکومت ہند کی ملازمت پر واپس ہوگئے تو مسٹر حیدری کا تقرر اس عہدہ پر ہوا جس کی خدمات اب تک انجام دے رہے ہیں۔ بحیثیت صدر المہام فینانس معزز باب حکومت کے رکن بھی ہیں۔ سر کیسن واکر کے انتقال کے بعد آپ کو دولت آصفی کی ریلوے کا سرکاری ڈائرکٹر حضور پرنور نے مقرر فرمایا۔
بہ تقریب جشن سالگرہ مبارک حضور پرنور ۱۳۴۱ ہجری میں آپ کو حیدر نواز جنگ بہادر کا خطاب بارگاہ خسروی سے عطا فرمایا گیا۔

۱۹۲۵ء میں شملہ میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کی ایک کمیٹی منعقد کی گئی جس میں مسٹر حیدری عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے نیابت کے لئے بھیجے گئے۔ وہاں جو جلسہ ہوا اُس میں تمام یونیورسٹیوں کے مندوبین نے جلسہ کا اُن کو صدر مقرر کیا۔ اسی جلسہ میں یہ طے ہوا کہ ایک انٹر یونیورسٹیز بورڈ بنایا جائے اور اُس کا اجلاس ہر سال مختلف یونیورسٹیز میں ہوا کرے۔ چنانچہ سب سے پہلے پریسیڈنٹ اس بورڈ کے حیدری صاحب ہی مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۵ء کے دسمبر میں پنجاب یونیورسٹی نے آپ کو کانوکیشن ایڈریس دینے کو لاہور میں مدعو کیا جس کو آپ نے قبول فرمایا۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم کے انتقال کے بعد مجلس دائرۃ المعارف کے صدر مقرر ہوئے اور اب تک اپنی گوناگوں قابلیتوں کے لحاظ سے سرکار عالی کی خدمت میں مصروف ہیں۔

خطبۂ صدارت

حضرات! مجھے کم و بیش ایک چوتھائی صدی سے اپنی بساط کے موافق تعلیمی معاملات سے خاص دلچسپی اور شوق رہا ہے اور اس مدت میں میں نے تعلیم کی مختلف تحریکات اور مدارج پر کچھ غور کیا ہے۔ نیز اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے بھی میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست میں ترویج و ترقی تعلیم پر مامور ہوں۔ مجھے اس عرصے میں مختلف حیثیتوں سے یہ ثابت ہو گیا ہے اور میرے دل پر اس کا گہرا نقش ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی ترقی و فلاح کا دار و مدار صرف تعلیم پر ہے اور ملک کی سب سے بڑی خدمت جہالت کے مٹانے اور اشاعت و حمایتِ تعلیم میں ہے۔ اس لئے میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مسرت اور اس سے زیادہ کوئی فخر نہیں ہو سکتا کہ میں اس معزز کانفرنس کا (جو مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی تعلیمی جماعت ہے) صدر انتخاب کیا جاؤں میں آپ کا دلی احسان مندی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس عزت کے قابل سمجھا میں اپنی زندگی کے اس دن کو ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد کروں گا۔ لیکن جب میں اس کام کی اہمیت اور ذمہ داریوں کو دیکھتا ہوں اور اُن قابل اور فاضل حضرات کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں جو اس سے قبل اس کرسی صدارت کو زینت دے چکے ہیں تو اپنے آپ کو اس جگہ پر دیکھ کر اپنے دل میں محجوب ہوتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس سلسلۂ زریں میں شاید سب سے کمزور کڑی میں ہی ہوں۔ مجھے اپنے ضعف کا اعتراف ہے۔ اور اگر میں اس خدمت کو کامل طور پر انجام نہ دے سکوں جو آپ نے میرے سپرد کی ہے اور مجھ سے وہ توقعات پوری نہ ہوں جو آپ نے خیال کر رکھی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تنگیٔ وقت کا عذر آپ کی نظرِ کرم اور میرا دلی خلوص اس قصور کی تلافی کر دیں گے۔

حضرات! یہ زمانہ نفسانی کارستانیوں کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاک کا پتلا ہوا و ہوس کے جنون میں سارے عالم کو تہ و بالا کر دینے میں دریغ نہیں کرے گا۔ اسی نفسانیت کی بدولت آج تمام دنیا میں سیاسی، اخلاقی اور اقتصادی تہلکہ مچا ہوا ہے۔ اور کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جہاں اس مصیبت کا رونا اور جہاں اس آفت کا ماتم نہیں ہے۔ اور باوجود تین سال گزرنے کے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ کوئی نہیں بتا سکتا کہ مشیتِ ایزدی کیا ہے؟ اور اس تاریکی کے پیچھے جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے کیا پنہاں ہے؟ لیکن ایک امید ہے کہ جس پر ہم قایم ہیں اور جو حاکم و محکوم اور راجا اور پرجا دونوں کے دلوں میں یکساں موجزن ہے۔ جس طرح طوفان کے بعد سکون اور تاریکی کے بعد روشنی کا ہونا یقینی ہے اسی طرح اس سیاسی اور اقتصادی ہیجان کے بعد ایک اطمینان کا زمانہ آنے والا ہے جو انسانی ترقی کا جدید دور ہوگا

اور جس کا سب سے ممتاز جزو تعلیم کی نئی تحریک ہوگی +

یادِ رفتگاں | قطع نظر اِس عالمگیر مصیبت کے ہم جب اپنے ملک پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال ہمارے لئے کچھ کم مصیبت انگیز نہ تھا۔ افسوس کہ ہم میں سے چند ایسے بزرگ اُٹھ گئے کہ جن کی رہنمائی، جن کا علم و فضل اور جن کی نیک نفسی ہمارے لئے باعث فخر اور موجب تسکین تھی۔ سب سے اوّل میں اُس بزرگ قوم کا ذکر کرتا ہوں جو ہندوستان کا سچا فدائی تھا۔ اس کی زندگی پاک اور سادہ تھی اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی سے اُس نے اپنی ساری زندگی مُلک کی خدمت میں بسر کر دی۔ میں اس چھوٹے قد کے گورے چٹے بزرگ کو جو اکثر سُرخ ریشمی پاجامہ پہنے رہتا تھا لڑکپن سے جانتا تھا اور جب ہم مدرسہ جاتے اور وہ کہیں راستہ میں نظر آجاتا تو آپس میں کہتے تھے کہ "وہ دادا بھائی ماسٹر جا رہا ہے"۔ اس نے اپنی زندگی مدرّسی سے شروع کی اور یہی نہیں کہ اس نے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کی یا وہ کالج میں پروفیسر تھا بلکہ وہ ہمارا حقیقی مُعلّم تھا اور آخر دم تک ہمارا معلّم رہا۔ اِس زمانہ میں حُبّ وطن کا سبق اُسی نے ہمیں سکھایا۔ اُس کی ساری زندگی ابتدا سے آخر تک ابنائے وطن کے لئے سبق آموز ہے۔ ہندوستان اُس کا اوڑھنا بچھونا اور اس کی ترقی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ جدید ہندوستان کے بنانے میں سب سے زیادہ اسی محترم بزرگ نے حصہ لیا۔ اور جب ہندوستان کے دورِ جدید کی تاریخ لکھی جائے گی تو دادا بھائی نوروزجی کا نام سب سے اوّل آئے گا +

میں سچ کہتا ہوں کہ میرا دل بھر آتا ہے جب کبھی میں اپنے دوست مولانا سیّد کرامت حسین مرحوم کا ذکرِ خیر کرتا ہوں۔ ان کا علم و فضل اور تبحّر، اُن کی پاک صاف اور سادہ زندگی، ان کا ایثار، اُن کی صداقت یہ ایسی خوبیاں ہیں کہ ہمیں اپنی قوم میں ڈھونڈھے نہیں ملتیں۔ وہ اپنے خیال میں نہایت پختہ اور اپنی دُھن کے پکّے تھے۔ انہوں نے درویشانہ زندگی بسر کی اور اپنا تمام اثاثہ تعلیم نسواں کے نذر کر دیا جس کے وہ ہمیشہ سے بڑے حامی اور دل دادہ تھے۔ وہ اپنے علم و فضل ہی میں نہیں بلکہ اخلاقی خوبیوں میں بھی جامع کمالات مشرق و مغرب تھے۔ میں نے اُن کی صحبت سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور میرے دل میں اُن کی اس قدر وقعت ہے کہ میں اُنہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ افسوس کہ اُن کی وفات سے ہماری قوم میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے کہ اب اُس کا پُر ہونا دشوار نظر آتا ہے +

پرنسپل ورڈس ورتھ کے نام سے ہندوستان کے دُوسرے صوبوں کے لوگ اس قدر واقف نہیں جس قدر اہل بمبئی اور وہاں بھی اب نوجوان تعلیم یافتہ غالباً پرنسپل موصوف کے حالات سے زیادہ تر واقف نہ ہوں گے۔ اس نے اپنے علم و فضل اور اپنے اعلیٰ خیالات کا یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے پر اور اُن کے ذریعے سے

تمام ملک پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ مسٹر تلنگ اور مسٹر گوکھلے جیسے نامور بزرگ یا وہ سرگرم نوجوان لوگ جو جمشید جی ٹاٹا کمپنی کے دست و بازو اور دل و دماغ ہیں، اُسی کی تعلیم کے خوشہ چیں ہیں۔ پرنسپل ورڈس ورتھ نے اپنے فرائض بہ حیثیت ایک تعلیمی افسر کے محدود نہیں کر رکھے تھے بلکہ اس نے ملک کی تمام اہم تحریکات میں اپنی قلم اور زبان سے ہمیشہ مدد دی۔ وہ درحقیقت ہندوستان کا ہمدرد اور ہماری ترقی کا خواہاں تھا۔ اس شخص کے ملنے سے انگریزی قوم کی وقعت دل میں پیدا ہوتی تھی۔ یہی وہ نیک باطن، ہمدرد اور روشن خیال انگریز ہیں جو انگریزوں کے لئے باعثِ فخر ہیں اور جنہوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں رشتۂ اتحاد و مودت کو مستحکم کیا اور ہمارے دلوں پر اپنی خوبیوں کا گہرا نقش چھوڑا۔ اگر سررشتۂ تعلیم میں ایسے ہی فاضل، مخلص اور ہمدرد انگریز آتے رہتے۔ اور نوجوان طلبہ کو ایسے شریف النفس انگریزوں سے سابقہ پڑتا رہتا تو شاید ہندوستان کی موجودہ نسل پر بدنامی کا وہ داغ نہ لگتا جس سے ہمیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو ہمیں اُس کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پرنسپل ورڈس ورتھ کی وفات سے ہمارا ایک محسن دنیا سے اُٹھ گیا اور ہمیں اس پر حقیقی رنج و افسوس ہے۔

تحقیق واقعات کی ضرورت

حضرات! مُسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل پر بحث کرتے وقت سب سے بڑی مشکل میں نے یہ محسوس کی کہ اس بارے میں صحیح اور مکمّل اعداد و شمار و واقعات ایسے موجود نہیں جن سے ضروری مدد مل سکے۔ افسوس ہے کہ کانفرنس کی طرف سے مجھے ایسے تنگ وقت میں اطلاع ملی کہ میں یہ تمام اعداد و شمار فراہم نہ کر سکا۔ ورنہ میں اس بات کے دکھانے کی کوشش کرتا کہ اولاً مختلف صوبوں کے مُسلمانوں نے تعلیم کے مختلف مدارج اور شعبوں میں کہاں تک ترقی کی ہے۔ دوم دوسرے اقوام کے مقابلے میں ان کی رفتارِ ترقی کیا رہی ہے؟ اور ان میں اور دوسرے اقوام میں جہالت نے جو تفاوت پیدا کر رکھا ہے وہ کم ہو رہا ہے یا زیادہ؟ یا اُسی قدر ہے جو پہلے تھا؟ کیا وہ فی الحقیقت میدانِ تعلیم میں دوسرے اقوام سے قریب ہوتے جاتے ہیں تاکہ اپنے عزیز وطن کے معاملات و مسائل کے طے کرنے میں برابری کے دعوے سے شریک ہو سکیں؟ مجھے اس کے متعلق زیادہ زور دینے اور تاکید کرنے کی ضرورت نہیں کہ جب تک کانفرنس کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے صحیح اور مکمّل اعداد و شمار اور واقعات شایع نہ ہوتے رہیں گے اُس وقت تک ہم صحیح طور سے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ہماری حالت کیا ہے اور کون سے ایسے مسائل ہیں جن پر ہمیں فوری توجہ کرنی چاہیے اور کونسی ایسی تجویزیں ہیں جو ہمارے مرض کی دوا ہو سکتی ہیں اور کونسی ایسی تدبیریں ہیں جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہیں۔ کانفرنس کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے ہر شعبے، ہر پہلو اور تمام جزئی اور تفصیلی امور کے اعداد و شمار اور واقعات کمال احتیاط و صحت، صبر اور دقتِ نظر کے ساتھ مہیا کرتی رہے۔ بلکہ مناسب ہوگا کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو اسی کام پر لگا دیے جائیں

اور ہر شخص خاص خاص مسئلے کو لے لے اور اپنا تمام وقت اُسی پر صرف کرے اور یہ تحقیقاتیں ملک میں عام طور پر شائع ہوتی رہیں۔ کانفرنس کو اس فرض کے ادا کرنے میں اب کچھ عذر نہیں ہو سکتا جب کہ فخر رؤسائے ہند اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی شاہانہ امداد نے اسے مالی حالت کی طرف سے بے نیاز کر دیا ہے +

مسلمان اور اُردو مختلف صوبوں کی تعلیمی اور مردم شماری کی رپورٹوں کے پڑھنے اور عام حالات و واقعات کے دیکھنے سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ایک خاص مناسبت ہے جن جن مقامات میں اُردو زیادہ رائج اور شایع ہے اُسی قدر وہاں کے مسلمان زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ شایستہ اور ترقی یافتہ نظر آتے ہیں اور قومی اور ملکی معاملات میں زیادہ سرگرم اور مستعد معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح جس نسبت سے اردو مختلف مقامات میں داخل ہوتی جاتی ہے اُسی نسبت سے وہاں کے مسلمانوں کا جمود ٹوٹتا جاتا اور اُن میں وسعت نظر اور احساس قومی پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بہت قابلِ غور ہے اور چوں کہ اس سے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی وابستہ ہے اس لئے میں کسی طرح اسے نظر انداز نہیں کر سکتا اور نہ سرسری بحث پر اکتفا کر سکتا ہوں +

اگر ہم ہندوستان کے مختلف صوبوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اگرچہ اُردو زبان کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن مختلف مقامات پر اس کی حیثیت مختلف ہے۔ اوّل وہ مقامات ہیں جہاں کی مادری زبان اُردو ہے۔ وہاں کسی قسم کی دقت نہیں دُوسرے وہ مقامات جہاں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے اور تحتانیہ مدارس میں اُن کی تعلیمی زبان اُردو ہے۔ مثلاً صوبۂ پنجاب جہاں مسلمانوں نے اس زبان کو اختیار کر لیا ہے اور مثل مادری زبان کے ہو گئی ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی یہی زبان استعمال ہوتی ہے۔ یہاں بھی کوئی دشواری نہیں۔ لیکن اصل دشواری وہاں پیش آتی ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے اور اُردو اُن مقامات میں عام زبان نہیں مثلاً بمبئی اور مدراس میں۔ ان مقامات میں بھی ایسے مسلمان موجود ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے اور خواہ وہ کیسی ہی غیر فصیح کیوں نہ ہو وہ کسی حالت میں اُسے ترک کرنا گوارا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مقامی طور پر **اُردو** کا نام یہاں **ہندوستانی** یا **مسلمانی** ہے اور اس سے اُس تعلق کا پتہ لگتا ہے جو مسلمانوں کو اس زبان سے پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے مقامات پر اُردو کا مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ جب ہم اُن مقامات پر نظر ڈالتے ہیں جہاں مسلمانوں کی وہی زبان ہے جو اُن کے ہندو بھائیوں کی تو یہ پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ دشواری اور پیچیدگی وہاں پیش آتی ہے جہاں کی زبان **دراوڑی** ہے۔ مرہٹی، گجراتی زبانیں اردو سے اقرب ہیں کیوں کہ **آریائی** ہونے کے لحاظ سے اُن کی اصل ایک ہے۔ لیکن **دراوڑی** زبانوں کو ترکیب و ساخت اور اصلیت کے لحاظ سے اُردو سے کوئی تعلق نہیں +

جب ہم ہندوستان کے مختلف صوبوں کی تعلیمی رپورٹوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ خواہ ان مقامات کی اُردو زبان کے لحاظ سے کچھ ہی حیثیت ہو۔ لیکن مسلمان یکساں طور پر اس بات کے خواہشمند ہیں بلکہ ان کا اصرار ہے کہ ان کے بچوں کے لئے کسی نہ کسی شکل میں اُردو تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اور اُن کا یہ اصرار بالکل بجا ہے۔ کیوں کہ اس سرزمین مقدس کی دوسری اقوام کی طرح مسلمانو کو بھی اپنا مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور اسلامی مذہب و اخلاق کا سرمایہ جس قدر اُردو میں ہے ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ اور چوں کہ مسلمانوں کے بچے ہر جگہ ابتدا میں قرآن شریف پڑھتے ہیں اور اس کی اور اُردو کی تحریر اور اسلامی مذہب و اخلاق کی اکثر اور مستند کتابیں اُردو میں ہیں اس لئے مذہبی اور اُردو زبان کی تعلیم باہم اس طرح وابستہ ہو گئی ہیں کہ ان کا جدا کرنا ممکن نہیں اور اس لئے اُردو کی تعلیم کے مطالبہ کا پورا کرنا قوم اور گورنمنٹ کا دونوں کا فرض ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ میرا مطلب اس انتظام سے یہ نہیں ہے کہ ہر جگہ اُردو ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے بلکہ اس کا فیصلہ مقامی حالات پر منحصر ہے۔ خواہ اُردو کی تعلیم بہ حیثیت زبان اوّل کے ہو یا زبان دوم کے مگر مسلمان طلبہ کے لئے اس کا انتظام ہونا نہایت ضروری ہے +

صوبۂ برہما کی تعلیمی رپوٹ میں مفصلۂ ذیل الفاظ قابل غور ہیں اور یہ میرے اُن خیالات کی تائید کرتے ہیں جن پر میں اس وقت بحث کر رہا ہوں :-

"دونوں زبانوں (یعنے اُردو اور برہمی) کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ لیکن کونسی زبان اوّل ہو اس کا فیصلہ بالکل مقامی حالات پر منحصر ہے۔ بعض مدارس نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اپر برہما خصوصاً یا کسی اور یامے تھن اضلاع میں برہمی مسلمان آباد ہیں جن میں سے اکثر سابق شاہان برہما کے ہندوستانی سپاہیوں کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے بچے برہمی ورنکلہ مدارس کا معمولی نصاب پڑھتے ہیں لیکن اُردو اس قدر ضرور سیکھتے ہیں جو اُن کی دینی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ یہ مدارس برہمی ڈپٹی انسپکٹروں کی نگرانی میں ہیں۔ رنگوں میں ہندوستانی مسلمان ہیں جو برہمی زبان بطور مادری زبان کے اور اُردو بطور دوسری زبان کے پڑھتے ہیں۔ اسلامی مدارس اور اُردو مدارس میں برہمی مسلمانوں اور اُردو بولنے والے مسلمانوں میں امتیاز نہ کرنے سے کچھ غلط فہمی واقع ہو گئی ہے۔ کیرن قوم کو کبھی دو زبانوں کا مسئلہ ناقابل حل محسوس نہ ہوا۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان اُن مشکلات کو رفع نہ کر سکیں جو اُن کی تعلیمی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ یہاں یہ اعتراض کیا جائے گا اور میں نے بعض صاحبوں کو یہ اعتراض کرتے سنا ہے کہ اگر مسلمان طلبہ کے لئے اُردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علاوہ مقامی زبان کے جس کا سیکھنا

مقامی ضروریات وتعلقات کے لحاظ سے ضروری ہے مسلمان طالب علموں پر ایک اور زبان کے سیکھنے کا بار بڑھ جائے گا۔ بیشک یہ صحیح ہے اور یہ بار مسلمانوں کو اٹھانا پڑے گا اور اس بار کے اٹھانے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ ہیں۔ کیوں کہ وہ اُردو کو قومی زبان سمجھتے ہیں اور تہذیب ذوق، اسلامی تمدن اور اتحادِ خیال و یک جہتی کے لئے اس کا سیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دنیا میں جو قومیں قلیل تعداد میں ہوتی ہیں انہیں بہت کچھ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے اور تھوڑی بہت قربانی کرنی پڑتی ہے اگر ہمیں اپنی ہستی قائم رکھنا ہے تو ہمیں بھی اس خسارہ اور قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور اگر مقامی لحاظ سے جزئی نقصانات بھی ہوں تو انہیں برداشت کرنا چاہیئے ورنہ مسلمانوں کی قلیل جماعتیں جو مختلف صوبوں اور مقاموں میں منتشر پائی جاتی ہیں وہ اسلامی تمدن وتہذیب اور اسلامی اخلاق ومذہب سے محروم رہ جائیں گی اور ان کی حالت اس قدر ذلیل و پس ماندہ ہو جائے گی کہ اُن میں اور پنچ قوموں میں کچھ فرق نہ رہے گا یا وہ گم نام و بے نشان ہو کر دنیا سے مٹ جائیں گی۔ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ ممکن تھا کہ یہ زبان جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی یادگار اور پراکرت، فارسی اور عربی کی گودوں میں پلی ہے ہندو مسلمانوں اور انگریزوں کی سعی اور ہمدردی سے جنہوں نے اس کی نشو ونما میں برابر کا حصہ لیا تھا، اس سرزمین کی مشترکہ اور عام زبان ہو جاتی، جو قومی ارتقا اور باہمی اتحاد و یک جہتی میں بہت بڑی سہولت پیدا کر دیتی۔ لیکن اگر ایسا ہو جاتا اور ایسا ہونا دشوار نہ تھا تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ انگریزی حکومت اور دانشمندی کی دائمی یادگار رہوتی۔ لیکن افسوس کہ آپس کے حسد ورقابت نے مُلک کو اس نعمت سے محروم کر دیا۔ وہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور اب یہ صرف خواب وخیال رہ گیا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک اور زبان نے لے لی ہے جو سات سمندر پار سے آئی ہے۔

عمل وخدمت لیکن کیا اس عظیم الشان کانفرنس میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے؟ کیا ہم مسلمانوں کی اس خواہش اور مطالبہ کو سُن کر اور سمجھ کر خاموش رہ جائیں گے؟ کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہم اُن کی اس دلی خواہش اور مطالبہ کو پورا کر سکیں؟ اس کی تدبیر **عمل** اور **خدمت** ہے اور ایسے بڑے کام مستقل عمل اور خدمت ہی سے انجام پا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں مسلمانوں کے سیکڑوں اور ہزاروں مکتب موجود ہیں جہاں قرآن شریف اور اُردو کی بُری بھلی تعلیم ہوتی ہے۔ اگر ہم اُن کی ابتدائی تعلیم کے لئے غور و احتیاط کے ساتھ ایک مناسب نصاب تعلیم مقرر کر دیں تو یہی مکتب ہمارے مقاصد کے لئے نہایت مفید و کارآمد ہو سکتے ہیں۔ کانفرنس کا یہ فرض ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کام کرنے والوں کی ایک جماعت قائم کرے۔ ایسی جماعت نہیں جو کبھی کبھی ہندوستان کے کسی تعلیمی مرکز میں یا صوبہ کے بڑے شہر میں اپنے جلسے منعقد کرے بلکہ ایسے کام کرنے والے اشخاص جو ہر قصبے اور گاؤں میں موجود ہوں جو مسلمانوں کی

مقامی ضروریات کا صحیح طور سے مطالعہ کریں اور اپنے مشورہ اور اتحاد سے اُن کی مشکلات کے آسان کرنے میں مدد دیں اور اگر ضرورت ہو تو مجاہدہ کے لئے بھی آمادہ رہیں۔ جب تک مستعد، مخلص اور خاموشی سے کام کرنے والے افرادِ ملک کے گوشہ گوشہ میں نہ پھیل جائیں گے اس وقت تک ہماری عمدہ سے عمدہ تجویزیں اور رزولیوشن، فصیح سے فصیح تقریریں اور پُرزور سی پُرزور درخواستیں اور میموریل بیکار ثابت ہوں گے اور ہم کبھی جہالت کی تاریکی رفع کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے۔ ایسے افراد کے مہیا کرنے میں جو خوشی اور دیانت کے ساتھ کام کرنے پر رضامند ہوں محنت، صبر اور استقلال کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اس کانفرنس کی صوبہ واری اور ضلع واری مجلسوں کو چاہیئے کہ یہ کام فوراً اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ جو لوگ اس مبارک جماعت میں شریک ہوں گے وہ اپنی قوم پر بڑا احسان کریں گے اور اس کا اجر بھی انہیں فوراً مل جائے گا۔ کیوں کہ اس خدمت کو اپنے ذمہ لے لینے سے انہیں اپنے پیشہ اور کاروبار میونسپلٹیوں کے معاملات اور زندگی کے عام مسائل میں بڑی مدد ملے گی۔ اب باتیں اور تقریریں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہندوستان کی آیندہ قسمت کا فیصلہ سچائی سے عمل کرنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ جماعت کمرِ ہمت باندھ کر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حالت ہو گی کہ کوئی مسلمان بچہ ایسا نہ ملے گا جو کم سے کم ایک زبان میں لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

دیسی زبانوں کی یونیورسٹیاں

عثمانیہ یونیورسٹی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اُردو زبان کی وسعت صرف ابتدائی تعلیم تک محدود رہے گی؟ کیا اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے؟ کیا وہ زبان جسے ہم نے زمانہ معصومیت میں شوق سے پڑھا تھا ابتدائی تعلیم کے بعد ہمارا ساتھ چھوڑ دے گی؟ کیا وہ زبان جس کے ذریعہ سے ہم نے اپنے مقدس مذہب و اخلاق کی تعلیم حاصل کی تھی، آگے چل کر ہمارے کام نہیں آئے گی؟ کوئی خوددار قوم اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی مادری یا قومی زبان عمر بھر اس کا ساتھ نہ دے، یا وہ لطیف اور اعلیٰ خیالات کے اظہار میں قاصر ہو یا وہ علمی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے شرماتی ہو۔ اگر کوئی ایسی زبان ہے تو بلاشبہ وہ صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُردو زبان میں آگے بڑھنے، اعلیٰ، لطیف اور علمی خیالات کے اظہار کی کافی صلاحیت موجود ہے، بشرطے کہ ہم میں خودداری اور غیرت ہو۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ ہندوستان کی اُن تمام آریائی اور دراوڑی زبانوں میں جن کے شیدائی لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں ہیں یہ صلاحیت موجود ہے۔ بشرطے کہ اہلِ زبان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو۔ اس بنا پر میں صرف اُن تمام حضرات سے جو اس کانفرنس میں تشریف رکھتے ہیں، نہ صرف اُن

سے جن کی مادری زبان اُردو ہے بلکہ ہر مذہب و ملت کے اصحاب سے خواہ اُن کی کوئی زبان ہو، یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اُس مبارک اور عظیم الشان تحریک کا جس کی بنیاد فرمان روائے دکن اعلیٰ حضرت حضور پر نظام خلد اللہ ملکہٗ نے قائم کی ہے سچّے دل اور جوش کے ساتھ خیر مقدم کریں۔ کیوں کہ یہ صحیح معنوں میں قومی تعلیم کی بنیاد ہے اس تحریک سے میرا مطلب عثمانیہ یونیورسٹی سے ہے جو حضور پُر نور کے فرمان سے حیدرآباد میں قائم کی گئی ہے۔ جس میں انگریزی زبان کی تعلیم بحیثیت زبان کے لازمی ہوگی۔ لیکن تمام علوم و فنون یونیورسٹی کے اعلیٰ مدارج تک اُردو زبان کے ذریعہ پڑھائے جائیں گے۔ یہ نیا اور نادر تجربہ ہے اگر اس میں ہمیں کامیابی ہوئی اور ثابت ہوا کہ ہمارے طالب علم غیر زبان کے الفاظ کے رٹنے سے آزاد ہو گئے ہیں اور بجائے اس کے ان کا میلان اشیا کے حقیقی علم حاصل کرنے کی طرف ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُن میں انگریزی زبان کی قابلیت بھی کافی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ تو اس تجربہ سے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لئے بھی دروازہ کھل جائے گا۔ اور اسی کے ذریعہ سے وہ گوہر نایاب جس کی جستجو میں ہم حیران و سرگرداں ہیں۔ یعنے قومی تعلیم وہ بھی ہمیں مل جائے گا۔ یہی وہ تعلیم ہے جو ہماری قومی خصوصیات و روایات اور ملکی حالات پر مبنی ہے۔ جسے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اجنبی اور غیر نہیں بلکہ اپنی چیز ہے۔ جو ہمیں تعلیم کی کسی منزل میں بھی اپنی تہذیب و شائستگی، اپنی خصوصیات اور اپنے مذہب و اخلاق سے بے گانہ نہیں بناتی بلکہ ان کی تکمیل میں مدد دیتی ہے۔ پھر آپ اُن علوم و فنون اور اعلیٰ خیالات کا خیال کیجئے جن سے ہماری زبان مالا مال ہوگی۔ اور جن تک ہر فرد قوم کی رسائی ہو سکے گی۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ عام تعلیم صرف معمولی شُدبُد تک محدود رہنی چاہیئے اور جس سے آگے بڑھنے کا دعوےٰ مفت اور جبری تعلیم کو بھی نہیں ہے۔ بلکہ علم کی نعمت سے ہر شخص کو متمتع ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اور ابتدائی درجہ سے لیکر آخری منزل تک طے کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ تاکہ اس کی روشنی محلوں سے لیکر جھونپڑوں تک یکساں پہنچے۔ یہ خدمت صرف اسی قسم کی یونیورسٹی انجام دے سکتی ہے جس کا سرچشمہ فیض ہر کہ و مہ کے لئے ہر وقت اُبلتا رہے گا۔

<u>فرقہ داری یونیورسٹیاں</u> حضرات! میں آپ سے سچّے دل سے اور نہایت زور کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ آپ ایک لحظہ کے لئے بھی یہ گمان نہ کریں کہ اس قسم کی تحریک کسی طرح بھی کسی خاص فرقہ یا صوبہ یا جماعت سے مخصوص ہے اور اس کا منشاء آپس میں تفریق پیدا کرنا ہے۔ بلکہ یہ قومی خودداری کا پہلا اصول ہے اور ہر قوم جس میں ذرا بھی غیرت ہے اپنے روایاتِ تہذیب کے ادب و احترام پر مجبور ہے۔ اور یہ ادب و احترام قومی ارتقا کا مخالف نہیں بلکہ اس کا بڑا حامی اور معاون ہے۔ انگلستان کے سب سے نامور سیاسی فلاسفر ایڈمنڈ برک نے

جس کی تصانیف بد قسمتی سے اب ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم سے خارج کر دی گئی ہیں کیا خوب کہا ہے۔
"کسی جتھے یا گروہ کی فلاح میں انہماک ظاہر کرنا، سوسائٹی کی کسی جماعت سے جس سے ہمارا تعلق ہے محبت کرنا جمہور کی محبت کا بیج بونا ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس کے سہارے ہم ملک اور بنی نوع انسان کی طرف بڑھتے ہیں۔ سوسائٹی کی اس جماعت کی فلاح ایک امانت ہے جس میں سوائے بڑے بڑے لوگوں کے کوئی خیانت نہیں کر سکتا۔ اور سوائے غداروں کے کوئی اُسے اپنے ذاتی اغراض کے لئے قربان نہ کرے گا۔"

میں اس قسم کی تمام تحریکات کو بشرطے کہ وہ باہمی نفرت اور حسد و رقابت سے پاک ہوں قومی حیات کی تکمیل کے لئے نہایت مبارک خیال کرتا ہوں۔ مجھے اس امر کی یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس وقت پہلے پہل اس کانفرنس میں مسلم یونیورسٹی کی بحث چھڑی تو مجھے سخت اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اُس تفریق و نفرت کو جو پہلے ہی سے اس بد نصیب ملک کی اقوام میں موجود ہے اور مشتعل کرے اور اس لئے میں فرقہ دار یونیورسٹیوں کے قیام سے ایک مدت تک بدگمان رہا۔ لیکن جدید حالات اور جدید انقلاب خیالات نے میرے دل میں کچھ کچھ امید پیدا کی ہے کہ ہندو مسلم یونیورسٹیاں اتحاد و محبت پیش نظر رکھ کر کام کریں گی۔ اور اُن میں سے ہر ایک یونیورسٹی اپنی اپنی تہذیب و علم اور تاریخی روایات کی خوبیوں کی تحصیل و تکمیل کرے گی۔ ایک دوسرے کے تمدن و علوم اور کمالات پر ہمدردانہ نظر ڈالے گی۔ اس طریقے سے ہندوستان کی ہر جماعت اور ہر قوم کو اپنی خصوصیات اور اپنے اصل تمدن کے لحاظ سے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کامل آزادی ہوگی۔ تاکہ ہم اصلی ہندی قومیت میں اپنے مخصوص تمدنوں کے شایستہ نمونے پیش کر سکیں اور ہند کی قومی مجلس میں اپنی اپنی خوبیوں سے ایک دوسرے کی کوتاہیوں کی تلافی کریں جس طرح اسلامی تمدن نے مختلف صورتوں سے ہندوستان پر اثر ڈالا ہے اور ہندوستان کے تمدن کا اثر مسلمانوں پر ہوا۔ اسی طرح ہم ہندو ہوں یا بدھوی ایرانی ہوں یا مسلمان یا عیسائی اپنی خصوصیات سے جو اب تک ہم میں باقی ہیں ایک دوسرے پر پسندیدہ اثر ڈالتے رہیں گے۔ جس طرح مختلف ندیاں مختلف راستوں سے ہو کر آخر ایک دریا میں آ کر ملتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے مختلف تمدن اور تہذیبیں مختلف طریقوں سے ترتیب پا کر ایک جگہ جمع ہوں گی اور اس اصل ہندی قومیت اور اتحاد کی بنیاد ڈالیں گی جو ہماری تمام جدّ و جہد کی اصل غایت اور ہماری آئندہ ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔ ہمارے پیچھے قدیم ہندو، ایرانی اور اسلامی شاندار اور پُر اسرار تہذیب و علوم ہیں اور سامنے یورپین وسیع اور حیرت انگیز تمدن و سائنس۔ ہم نہ گزشتہ کو ترک کر سکتے ہیں اور نہ موجودہ سے انکار۔ انسانی ذہانت اور دماغ کے یہ دونوں مظاہر ہیں اور مشیّتِ ایزدی ہے کہ ہم دونوں کی خوبیوں سے اپنے حیات اور علم ادب میں استفادہ کریں۔ اس مقدس فرض کو بھی یونیورسٹیاں انجام دیں گی جو اپنے طالب علموں کے دلوں میں

تہذیب ذوق، علم کا سچا شوق، رواداری اور حُبِّ وطن کے ایسے تخم بوئیں گی کہ ہندوستان حقیقی معنوں میں جنت نشان ہو جائے گا۔ اگرچہ یونیورسٹیاں الگ الگ ہیں، اُن کے انتظامات بھی جدا جدا ہیں لیکن اُن کے مقصد اور نصب العین میں کوئی فرق نہیں گو راہیں جدا جدا ہیں مگر منزل مقصود ایک ہے +

جب یہ دونوں یونیورسٹیاں ان اصول اور اس مطمح نظر کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں گی تو اس وقت خود بخود حسد و رقابت، تفریق و منافرت اس ملک سے اُٹھ جائیں گے۔ اور ہندوستان ایک مُلک اور ایک قوم ہوگا۔ ہندوستان اور اُس کی قومیت کے لئے وہ دن نہایت منحوس ہوگا اگر مسلمان اجنٹہ کی حیرت انگیز اور لازوال نقاشی یا ایلورا کی عجیب و غریب سنگ تراشی کے نمونے دیکھیں اور عش عش نہ کرنے لگیں یا وہ جیادیو کے من موہن گیت یا بھگوت گیتا میں سری کرشن کا پُرمعنی اور لطیف کلام پڑھیں اور وجد نہ کرنے لگیں۔ ہندوستان اور اس کی قومیت کے لئے وہ دن نہایت منحوس ہوگا اگر دہلی و آگرہ میں مغلوں کی اور بیجاپور میں عادل شاہیوں کی نادرِ روزگار اور عالیشان عمارتیں دیکھ کر یا شیر شاہ، اکبر یا دکن کی چاند سلطانہ جیسے نامور فرماں رواؤں کے شاندار کارنامے یا محمود گاواں اور ابوالفضل جیسے وزرائے باتدبیر کے کارہائے نمایاں پڑھ کر یا البیرونی و فیضی جیسے حکما و مورخین کی تصانیف مطالعہ کر کے یا خسرو و غالب اور حالی جیسے بلند پایہ شعرا کا حکیمانہ اور پُردرد کلام سُن کر ہندوؤں کے دلوں میں فخر و مسرّت کی لہریں موج زن نہ ہوں۔ ہندوستان کی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر کیننگ، رپن جیسے وائسراؤں یا منرو اور الفنسٹن جیسے مدبّرین یا اڈمنڈ برک اور جان برائٹ جیسے ہندوستان کے بہی خواہوں یا ہیر اور ملر جیسے مشنریوں کی نیک نفسی اور عالی ظرفی سے ہندو مسلمانوں کے دل متاثر نہ ہوں۔ یہ سب ہندوستان کے دوست تھے اور ایسے سیکڑوں تھے جنھوں نے نیک نیتی سے ہندوستان کی خدمت کی۔ یہ سب مادرِ ہند کے سپوت ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ہوں یا عیسائی۔ یہ مہر و آشتی کا دور ہوگا جب کہ مذہب و ملت کی تفریق دلوں میں تفریق پیدا نہیں کرے گی۔ اور یہ ان یونیورسٹیوں کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ اُس وقت انہیں اور ایک کام بھی کرنا ہوگا جو اب تک نہیں ہوا۔ یعنی ہندوستان کی ایک جدید تاریخ لکھنی پڑے گی جس میں ہندوستان کے محسنوں اور خدمت گزاروں کی محنتوں کی داد دی جائیگی اور جو بجائے دلوں میں عداوت پیدا کرنے کے اتحاد اور قومیت کی تکمیل کرے گی۔

ہندوستان کے لئے جدید تاریخ کی ضرورت

اُس تاریخ میں ہمیں وہ واقعات نظر آئیں گے جن پر اس وقت پردہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک واقعہ جس کا تعلق ہندوستان کی گزشتہ علمی مساعی سے ہے، آپ کے مشہور مورّخ مولّف "پروموشن آف لرننگ ان انڈیا" (ہندوستان کی علمی ترقی) نے بیان کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا طفیل تھا کہ بنگالی زبان آج ہندوستان کی زبانوں میں علمی لحاظ سے اس قدر ممتاز ہے مسٹر نریندرا ناتھ لا

کہتے ہیں :-

"بنگال کے فرماں رواؤں کی کوششیں صرف اسلامی علوم کی ترقی ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ اُن کی علمی سرپرستی دوسری طرف بھی منعطف ہوئی جس کا جاننا اہل بنگال کے لئے مخصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہوگا۔ انہیں یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ اُن کی زبان کی ادبی اور علمی ترقی اُن کی کوشش سے نہیں ہوئی بلکہ یہ درجہ اُسے مسلمانوں کی بدولت نصیب ہوا۔ اوّل اوّل اُن کی دلچسپی شوقیہ تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کا تعلق سنسکرت سے ہے جسے ہندو قوم بہت عزیز رکھتی ہے جس سے مسلمانوں کو اکثر تعلق رہتا تھا۔ پہلے پہل بنگال کے مسلمان حکمرانوں نے رامائن اور مہابھارت کی طرف توجہ کی اور اُن کی سرپرستی میں ان دونوں کتابوں کے ترجمے بنگالی میں ہوئے"۔

"ایسی کتابوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے ترجمے فارسی اور سنسکرت سے مسلمان حکام کی سرپرستی میں بنگالی میں ہوئے۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ پہلے سنسکرت کے دلدادہ برہمن اور ہندو راجہ بنگالی زبان کو حقارت سے دیکھتے تھے لیکن اس کے بعد سے یہ بات نہ رہی ہندو راجاؤں نے بھی مسلمان بادشاہ اور حکام کی دیکھا دیکھی بنگالی مصنفین کی قدر کرنی شروع کی پھر درباروں میں بنگالی ملک الشعراؤں کا رکھنا ایک "فیشن" ہوگیا"۔

مسٹر بی چودھری "بنگالی ادب کی داستان" میں لکھتے ہیں کہ بنگالی زبان جو بہ لحاظ اصل کے ہر دلعزیز ہے اور اس میں زیادہ تر جمہوریت کی شان پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بنگالی اہل علم کا تعلق اسلام سے رہا"۔

کبھی کرتے تھے ہم بھی حکمرانی اِن ممالک پر — مگر وہ حکمرانی جس کا سکّہ جان و دل پر تھا
تمھیں لے دے کے اس کل داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ عالمگیر ہندو کُش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

<u>قدیم مدارس کی اصلاح</u> | اس کے علاوہ اس قسم کی یونیورسٹی کا ایک اور کام بھی ہوگا اور میں اس مسئلہ کی طرف آپ کی توجہ اس لئے زیادہ تر مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس کی احتیاج اس صوبہ میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ یہ کام قدیم طرز کے مدارس کی اصلاح ہے۔ اس قسم کی یونیورسٹیوں کی علوم مشرقیہ یا دینیات کی فیکلٹی مشرقی علوم کے اُن مدارس کو جو اب تک نظامیہ نصاب کی تعلیم دیتے ہیں اپنے زیر اثر لا سکتی ہے۔ میں اپنے حیدرآباد کے تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ علما اور طلبہ جو ان مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں ہماری قوم کے مفید اور کارآمد رکن ہیں۔ مذکورۂ بالا فیکلٹی ان مدارس کی تعلیم میں اصلاح کر کے زیادہ خودداری اور زیادہ وسعت نظر پیدا کر سکتی ہے۔ اور خود یونیورسٹی کا اس میں یہ فائدہ ہے کہ وہ ہر قسم کے علوم تہذیب ذوق کی جامع ہوگی اس ضمن میں میں آپ صاحبوں کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات اس قسم کے مدارس کی اصلاح کے خواہشمند ہیں انہیں حیدرآباد جیسی اسلامی ریاستوں نیز مصر کے تعلیمی تجربوں سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ حیدرآباد میں دارالعلوم اور

مدرسۂ نظامیہ موجود ہیں جہاں کے طرز تعلیم اور نصاب سے ضرور اُن کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ مصر کے وزیر تعلیمات کی مطبوعات کے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اُن میں خاص کر دینیات اور لڑکیوں کی تعلیم کے نصاب ہندوستان کے اسلامی مدارس کے لئے بہت مفید معلوم ہوتے ہیں +

سلطانیہ کالج | حضرات! اب میں اسی قسم کی ایک اور قابل قدر تحریک کا مختصراً ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حال ہی میں پیدا ہوئی ہے میری رائے میں یہ بابرکت تحریک مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہوگی یہ پہلا وقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنی تمام آیندہ امیدوں اور دنیاوی مسرتوں کو قربان کر کے قوم کی خدمت کے لئے کمر باندھی ہے۔ ہم میں کونسا مسلمان ہے جس کے دل میں یہ خیال نہ آیا ہو کہ کاش ہم میں بھی گوکھلے، پرنجپے، شاستری اور دیلو دھر جیسے سچے اور بے ریا خادمانِ قوم ہوتے۔ خدا کا شکر ہے کہ سلطانیہ کالج کے محرکوں اور بانیوں نے خلوص اور ایثار کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کی ہے جو ہمارے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید اور ہم سب کے لئے قابل فخر ہوگی۔ ہم زیادہ تر اپنی خود غرضیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ معلم کی قدر دنیاوی مال وجاہ میں نہیں بلکہ اُس کے استغنا، اُس کی پاک اور شریفانہ زندگی اور اُس کے خلوص و ایثار میں ہے، اُس وقت تک ہمیں کسی ترقی کی اُمید نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم معلّمین کی کمی تنخواہ کے متعلق اکثر لوگوں کو شکایت کرتے سنتے ہیں یہ ہماری قدیم روایات کے خلاف ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے ان غریب مدرسین سے ہمدردی نہیں بلکہ میں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ ان کی قدر و قیمت روپیہ پیسے میں نہیں بلکہ اُس ادب و احترام میں ہے جس کا یہ شریف پیشہ ہر طرح مستحق ہے۔ ہم اپنی قدردانی اور عزت سے انہیں وہ کچھ دے سکتے ہیں جو سرکار یا اُن کے افسر نہیں نہیں دے سکتے۔ یہ ملک کی خوش نصیبی ہے کہ سلطانیہ کالج کے اراکین اعلیٰ تعلیم کی خدمت کر کے تعلیمی کارگزاروں کے لئے قدر و قیمت کا سچا اور صحیح معیار قایم کرنے والے ہیں۔ اُن کی بے ریا مساعی اہل ملک کے لئے خود ایک ایسی تعلیم ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم سے جو محض امتحانات میں کامیاب ہونے کے لئے حاصل کی جاتی ہے کہیں افضل و اشرف ہے۔ میں بانیان و محرکین سلطانیہ کالج کو اُن کی مردانہ ہمت پر مبارکباد دیتا ہوں اور روشن خیال و فخر قوم فرماں روائے ریاست بھوپال کے فرزند سعید پرنس حمید اللہ خاں کے جوش و حب قوم اور خلوص کی تعریف کرتا ہوں، جن کی حمایت و سرپرستی میں یہ کالج پھولنے پھلنے والا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ کالج ہر طرح کامیاب و سرسبز ہو اور اس کی تقلید میں ہندوستان کے ہر حصہ اور گوشہ میں اسی قسم کی درسگاہیں ایسے ہی ایثار و خلوص پر مبنی ہوں۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ ہمارے ہم قوم اس کی تکمیل کے لئے دریا دلی کے ساتھ مدد دیں گے۔ اگر ہم نے اس کی اشاعت میں کوتاہی کی اور جلد اس کی تکمیل نہ کر دی تو ہماری خودداری میں نہایت بدنما دھبہ رہے گا اور ہم ایک ایسے جرم کے

مرتکب ہوں گے جو کبھی معاف نہ ہوگا +

تعلیم نسواں | اس خطبہ میں یہ توقع رکھنا کہ میں مسلمانوں کی تعلیم کے ہر شعبہ پر گفتگو کروں امکان سے خارج ہے دوسرے اگر میں کوشش بھی کروں تو محض آپ کی سمع خراشی ہوگی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میں گزشتہ دو تین سال کے اندر اوّل حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں اور پھر ایک سال قبل جنوبی ہند کی ایجوکیشنل کانفرنس میں ان میں سے بعض مسائل پر کافی بحث کر چکا ہوں۔ لیکن میرے اس سکوت سے ہرگز یہ خیال نہ کیا جائے کہ میری اُن راؤں میں کسی قسم کا ضعف پیدا ہو گیا ہے یا میں اُنہیں اُن مسائل سے جن پر میں نے آج بحث کی ہے کم اہم سمجھتا ہوں۔ میری مدّت سے یہ رائے ہے اور اب بھی میں اُسی وثوق اور یقین کے ساتھ اس پر قایم ہوں کہ لڑکیوں کی تعلیم اسی قدر ضروری ہے جتنی لڑکوں کی بلکہ میرے خیال میں بعض حالتوں میں یہ اُس سے زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ اگر آپ نے اپنی لڑکیوں کو معقول تعلیم دیدی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کی بہترین صورت نکال لی۔ جیسا کہ میں نے اُردو کی تعلیم کا انتظام اور مکاتب کی اصلاح کے ذیل میں کہا ہے وہی اس مسئلہ خاص کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں واقعات کا مطالعہ بہت احتیاط، غور اور صبر کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ اور خاص پروگرام تعلیم کا مرتب کر لینا چاہیئے۔ جس میں قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ مدّت تعلیم کیا ہوگی اور اس مدّت میں ہر سال کی تعلیم کا کیا اندازہ ہوگا تاکہ جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے وہ اس عرصہ میں حاصل ہو جائے۔ کام کرنے والی جماعت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان واقعات کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس پروگرام کی پوری پابندی کی جاتی ہے یا نہیں۔ اُستانیوں کی مطلوبہ تعداد مہیا ہو گئی یا نہیں۔ مناسب تعداد لڑکیوں کی مدرسہ میں آتی ہے یا نہیں۔ اور اس کام کے چلانے کے لئے کافی رقم جمع ہو گئی یا نہیں۔ گورنمنٹ کی مدّبرانہ دانشمندی اور تعلیمی ہمدردی پر مجھے اس قدر یقین ہے کہ بطور اصول موضوعہ کے یہ فرض کر لیتا ہوں کہ وہ ابتدائی تعلیم کی توسیع میں کبھی روپیہ کا مُنہ نہیں کرے گی۔ اگر لوکل فنڈ کی رقم کافی نہ ہوئی تو حتی الامکان دوسرے مقامی ذرائع سے اس میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہوا تو صوبہ کی آمدنی یا شاہی آمدنی سے کمی پوری کر دی جائے گی۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم نسواں کی توسیع کے متعلق ہمارا مطالبہ صحیح معلومات پر مبنی اور مناسب صورت میں ہو۔ اور گورنمنٹ ہر طرح سے معین اور کافی تدابیر اس مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے عمل میں لائے +

کتب خانے | کتب خانوں کا مسئلہ لیجئے۔ یہ بھی کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت میں یہ بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ خصوصاً اگر ان کتب خانوں میں دیسی زبانوں کی کتابیں اور اخبارات اور رسالے ہوں کیوں کہ اُن مردوں عورتوں کے لئے جو اپنے مطالعہ اور شوق سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں

اور جنھوں نے ہماری ابتدائی مدارس میں اپنی زبان کی مناسب تعلیم پائی ہے مگر افلاس یا ملکی رسم و رواج کی وجہ سے علمی زندگی سے محروم رہ گئے ہیں، یہ کتب خانے ہائی اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر اس قسم کے کتب خانوں کا انتظام صحیح اصول پر ہو اور تمام ملک میں ہر مقام پر ان کے قیام کا بندوبست کیا جائے تو میرے خیال میں وہ ملک کی علمی اور دماغی ترقی کے لئے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کثرت کے ساتھ ملک میں ایسے مدارس کا ہونا جو صحیح اصول پر عمدہ انتظام اور کافی نگرانی میں ہوں +

مقامی مسائل | کلکتہ یونیورسٹی کی سینٹ اور سنڈیکیٹ میں مسلمانوں کی کافی نیابت! اُن ڈیڑھ ہزار مسلمان طلبہ کی اقامت کا انتظام جو مفصلات سے کلکتہ میں بہ غرض حصول تعلیم موجود ہیں، اور جنھیں اس غدار شہر میں جہاں ہر قسم کی موجبات ترغیب ہیں اپنے رہنے کا خود انتظام کرنا پڑتا ہے! اسلامی نقطۂ خیال سے مختلف نصاب ہائے تعلیم کی نظر ثانی، خصوصاً موجودہ فارسی عربی کا اجتماعی نصاب جسے تقسیم کرکے دو جدا جدا مستقل مضامین بنانے کی ضرورت ہے، اور اُن مدارس اور کالجوں میں جہاں مسلمان طالب علموں کی تعداد معتد بہ ہے، اِن مضامین کی تعلیم کا کافی اور مزید انتظام یہ اور اسی قسم کے دوسرے مقامی مسائل کو لائق مقررین جن کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے زیادہ تفصیل اور خوبی کے ساتھ پیش کریں گے اس لئے میں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے متعلق صرف اس قدر کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کہ یہ امر مخالف و موافق سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمانان مشرقی بنگال کی تعلیمی ترقی کی طرف سے بہت زیادہ اور نامناسب عرصہ تک غفلت کی گئی ہے۔ اُن کی آنکھیں اب اس یونیورسٹی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اور اُن کے مایوس دلوں کو اس اُمید نے بہت کچھ ڈھارس دے رکھی ہے۔ کہ اس یونیورسٹی کی بدولت گزشتہ غفلت کی تلافی ہوگی اور خصوصاً اسلامی کالج اور شعبۂ علوم اسلامیہ کے قیام سے انہیں اعلیٰ تعلیم میں بڑی مدد ملے گی +

ہز اکسلینسی وائسرائے بہادر نے حال ہی میں اس یونیورسٹی کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ یہ یونیورسٹی بلا مزید تاخیر کے قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس موقع پر میں اس قدر اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یونیورسٹی کی تعلیم اور اس کی انتظامی مجلسوں میں ان لوگوں کی نیابت اور حقوق کا خیال نہ رکھا گیا جن کے فائدے کی غرض سے ابتداءً اس کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس بارے میں خاص احتیاط عمل میں نہ آئی تو اس کی اصل غرض و غایت فوت ہو جائے گی +

اس سلسلہ میں میں اپنے اُن الفاظ کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں جو میں نے گزشتہ سال جنوبی ہند کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے کہے تھے:۔

"میں اس کا سخت مخالف ہوں کہ ہم اپنی درخواست بھکاریوں کی طرح سرکار کے سامنے لیکر جائیں

تاہم اس کا مطالبہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں بطور خاص رعایت کے کریں جو ہماری جیسی قوم کی خودداری کے منافی ہے۔ میں نے ان رعایتوں یا مطالبہ کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ یہ ہندوستان کے عام فوائد کے لئے نیز دوسری اقوام اور گورنمنٹ سب کے حق میں بہتر اور مفید ہوگا۔ میں ہر تدبیر سے زیادہ مقدم اور زیادہ اہم اس اصول کو سمجھتا ہوں کہ مسلمان ہر معاملہ میں اپنی مدد کے لیے خود آمادہ ہوں اور اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا سیکھیں اور اس بنا پر ان کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیمی اغراض کے لئے ہر قسم کا بار اُٹھائیں اور مشقت سہیں۔ اور کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مسلمان گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ اُن پر ایک تعلیمی سیس اُس ٹکس کے ساتھ اضافہ کر دیا جائے جو وہ زرمالگزاری یا انکم ٹکس یا کسی اور ذریعہ سے سرکار کو ادا کرتے ہیں۔ اس سے اُن کی خواہش اور مطالبہ کی صداقت کا ثبوت ملے گا اور اُس وقت تمام ذرائع کے استعمال کرنے کی کوشش کے بعد اُن کے مطالبات میں سے رعایت کا بدنما لفظ خود بخود خارج ہو جائے گا لیکن قبل اس کے کہ اس قسم کی تجاویز قطعی طور سے طے کئے جائیں یا کوئی درخواست گورنمنٹ میں پیش کی جائے۔ ضرور ہے کہ اعداد و شمار اور وسائل و ذرائع وغیرہ کی کامل تحقیقات کر لی جائے۔ لیکن موجودہ حالت میں اُس سے بہتر اور کارگر کوئی تجویز نہیں بتا سکتا جو میں نے خاص مسلمانانِ جنوبی ہند کے تعلیمی مسائل کے متعلق پیش کی ہے'' *

تحقیقاتی کمیشن | حضرات! نہ تو مجھے اتنی مہلت ہے اور نہ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ میں ان مسائل پر بحث کروں جو اس وقت کئی کمیشنوں کے سامنے پیش ہیں اور جن کے اجلاس ہندوستان میں ہو رہے ہیں۔ لیکن مجھے حسنِ اتفاق سے اُس کمیشن کے ارکان کے ساتھ کئی گھنٹے بسر کرنے کی عزت حاصل ہوئی جو اس وقت اسی شہر میں ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے معاملات پر غور کر رہا ہے۔ اس ملاقات اور گفتگو کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تحقیقات اور غور و فکر کا نتیجہ کچھ بھی ہو اور خواہ ہم اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اس کا مجھے پورا یقین ہے کہ جو کچھ وہ کہیں گے یا لکھیں گے وہ ہندوستان کی تعلیمی فلاح اور نیک نیتی پر مبنی ہوگا۔ اور وہ دیگر اثرات سے متاثر نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کمیشن جس کا صدر ڈاکٹر سیڈلر سا عالم، وسیع النظر، ہمدرد اور ماہر فن تعلیم ہے، وہ ہماری بہت سی مشکلات کو جو ہندوستان کی تعلیم یونیورسٹی کی راہ میں پیش آ رہی ہیں، آسان کرنے کی کوشش کرے گا۔ مثلاً ایک الحاق ہی کا مسئلہ ہے جس میں سخت اختلاف ہے۔ حامیانِ الحاق کا منشا یہ ہے کہ علم کی عام اشاعت ہو اور طلبہ اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ دوسری طرف مخالفینِ الحاق کا یہ خیال ہے کہ ناقص تعلیم کی اشاعت سے کچھ فائدہ نہیں علم پختہ اور گہرا ہونا چاہیے۔ اور یونیورسٹی حقیقی علم و فضل اور علمی تحقیقات کی مرکز ہو۔ اب یہ ان ماہرانِ تعلیم کا کام ہے کہ مُلک کی ضروریات اور حالات پر غور کر کے کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ ہمارے طالب علم اعلیٰ تعلیم سے بھی محروم نہ رہیں۔ اور ہماری یونیورسٹیاں حقیقی علم و فضل کا مرکز بھی بنی رہیں۔

ایک دوسرا کمیشن ہندوستان کی حرفت وصنعت اور تجارت پر غور کر رہا ہے۔ اس کمیشن کے صدر سر ٹامس ہالینڈ ہیں جو اس سے قبل ہندوستان میں بہ سلسلۂ ملازمت رہ چکے ہیں اور اس کے ارکان میں سر راجندرا ناتھ مکرجی، سر داراب تاتا، سر فاضل بھائی کریم بھائی سے تجربہ کار اور ماہران حرفت وصنعت ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس امر کو بلا رو و رعایت صاف صاف بتا دیں گے۔ کہ اگر معاملات کی حالت یہی رہی جو ہمیں بمبئی کی شہادت سے چمڑے اور خیموں اور ہسپتال کے سامان کے بہم پہنچانے کے متعلق معلوم ہوئی ہے تو حرفت وصنعت وتجارت کی تعلیم ہماری حرفت وصنعت وتجارت کی ترقی میں کچھ مدد نہیں دے گی۔ بجز اس کے کہ منشیوں اور محرروں کی ایک اور نئی جماعت پیدا کر دے۔

مجھے اس میں شبہ نہیں کہ لارڈ مارلے کا شاگرد رشید جو اس وقت خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں موجود ہے وہ مدبرانہ تخیل سے کام لیکر ہندوستان کی سیاسی حالت کو ایسی بنیاد پر قایم کرنے کی کوشش کرے گا۔ جس کی توقع میں نے اس صدی کے پہلے سال میں ظاہر کی تھی۔ مہارشی مہادیو گوبند راناڈے نے ہندوستان کی سوشل ریفارم (اصلاح تمدن) پر مختلف مضامین لکھوائے تھے۔ اور اسی بزرگ کی فرمایش سے میں نے "ہندو مسلمانوں کے تعلقات" پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جسے میں ہندوستان کا ایسا اہم اور بڑا مسئلہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کے حل ہونے پر دوسرے تمام مسائل کا دار و مدار ہے۔ اس میں میں نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ "اس وسیع براعظم کے مختلف اقوام و ملل کے قلوب اتفاق کی برکت سے متحد ہو جائیں۔ ایسے اتفاق سے نہیں جو عارضی اور سرسری ہو، یا یہ کہ ہندو مسلمان پارسی اور عیسائی ایک دوسرے کو نظر رواداری سے دیکھیں۔ یا ایسی ہمدردانہ عنایت سے جس میں غیریت کی بو آتی ہو۔ بلکہ ایسے اتفاق سے جس میں زندگی اور حرکت ہو اور جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور مشترکہ ارث کی ترقی اور نشو و نما کے لئے مل کر کام کریں، تب ہمارے مردوں اور عورتوں میں خودداری پیدا ہوگی اور ہمارا ملک اس قابل سمجھا جائے گا کہ وہ برطانیہ کے ملحقہ خود مختار حکومتوں کے برابر جگہ پائے"۔

یہ مشہور مقولہ ہے کہ جنگ کے شور و شغب میں تمام قوانین معطل ہو جاتے ہیں لیکن برطانوی امن و امان کی کوئی تعریف اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ اس نے اس عالمگیر اور طوفان خیز جنگ کے زمانہ میں اپنے نائب و سفیر کو اُس مہتم بالشان قانون کی بنیاد قائم کرنے کے لیے بھیجا ہے جو صرف ایک فرماں روا قوم ہی کا حق ہے یعنی آزادی کا وہ فرمانِ محکم جو محکوم قوم کو اپنے حقوق و اقتدارات اور ذمہ واریوں میں حاکم قوم کے مساوی بنا سکتا ہے۔

شمشیر تعلیم

حضرات! یہ زمانہ بہت نازک ہے۔ ہر طرف انقلاب کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ جدید حالات و واقعات نے خیالات میں تغیر و تزلزل پیدا کر رکھا ہے۔ ہر قوم اپنے سنبھالنے اور اپنی اصلاح کی فکر میں ہے۔

باوجودے کہ اس وقت تمام عالم میں ایک کہرام مچا ہوا ہے اور فلک سیاست پر آلام و مصائب کی گھٹائیں گھر گھر کر آرہی ہیں۔ تاہم وہ دول بھی جو اس منحوس اور خونخوار جنگ میں مبتلا ہیں۔ اور جن کے تمام ذرائع، جان و مال، ساری ہمت و قوت جنگ کے نذر ہے۔ ایسے نازک وقت میں اپنی قوم کی تعلیم سے غافل نہیں ہیں۔ اِن جدید حالات نے اس امر کو اور واضح اور نمایاں کر دیا ہے کہ دنیا میں وہی قوم زندہ اور سرسبز رہ سکتی ہے جس کی تعلیم صحیح اُصول پر ہے۔ پس ایسی صورت میں ہم پر جو تعلیم میں دوسروں سے پسماندہ اور اپنی حالت میں دیگر اقوام سے درماندہ ہیں، سخت ذمہ داری ہے۔ ہم اگر اپنی رفتار معمول سے زیادہ تیز نہیں کریں گے۔ اور اگر ہمارا احساس اس بارے میں قوی نہیں تو اس میں ذرا شبہ نہیں۔ کہ ہم اس عالمگیر جدّ و جہد میں پیچھے ہی نہیں رہ جائیں گے بلکہ اغلب ہے کہ کُچل دئے جائیں۔

ایک انگریزی گیت میں ایک بڑے مزے کی اور سبق آموز کہانی ہے:۔

لکھا ہے کہ ایک مسافر راستہ بھول گیا اور پہاڑوں میں ٹکراتا پھرتا تھا۔ پھرتے پھرتے وہ پہاڑ کی ایک کھوہ میں پہنچا جہاں اس نے ایک بڑا مکان دیکھا جو طلسمات کا گھر تھا۔ اس میں بے شمار سوار سپاہی سر سے پاؤں تک ہتیاروں سے سجے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ اور اُن کے پاس اُن کے گھوڑے بھی اسی طرح بے حس کھڑے تھے۔ اتنے میں اس کی نظر ایک چٹان پر پڑی جس پر ایک تلوار اور ایک قرنا رکھی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ جو کوئی اس فوج سے کام لینا چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ ان دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک پسند کر لے۔ مسافر نے قرنا اُٹھالی اور زور سے پھونکی اس کے پھونکتے ہی ساری فوج ایک آندھی میں غائب ہو گئی اور مُسافر جہاں سے آیا تھا وہیں پہنچ گیا۔ مگر اس کے پیچھے پیچھے ہوا میں پیہم یہ آواز آرہی تھی۔

"لعنت ہے اس بزدل پر جس نے تلوار کھینچنے سے پہلے قرنا پھونکی"۔

حضرات! کسی شخص کو اعلانِ جنگ کا حق نہیں ہے جب تک کہ پوری طرح وہ کیل کانٹے سے لیس نہ ہو اسی طرح کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ دنیا کی جد و جہد میں داخل ہو جب تک وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار نہ ہو۔ ہم میدان میں اُتر آئے ہیں۔ ہمیں خوب دیکھ لینا چاہیئے کہ ہم نے اُس نقشے اور اُس نظام عمل پر کامل غور کر لیا ہے جس پر ہمیں کاربند ہونا ہے؟ ہمارے پاس وہ تمام سامان مہیا ہے جو اُس کارزار کے لئے ضروری ہے؟ اگر کچھ کسر باقی ہے تو اب بھی ہم اُس کی تلافی کر سکتے ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم تمام رخنوں کو بند کر لیں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ دوش بدوش چلیں اُن کے ساتھ مساوی حیثیت میں رہیں۔ اُن کے برابر بیٹھ کر مُلکی معاملات پر بحث کریں۔ ملک میں اپنی ہستی اور وقار کو

قائم رکھیں۔ اور اُن کے ساتھ متفق و متحد ہو کر اقوام عالم میں ہندوستان کو سرخرو اور ممتاز کریں تو اس کے لئے صرف ایک ہتیار رہے اور فضائے عالم میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ "قرنا پھونکنے سے پہلے تلوار کھینچو" یہ تلوار تعلیم کی تلوار ہے۔ جو اس زمانہ میں ہماری عزت و آبرو اور ہماری ترقی و خوش حالی کی حفاظت کے لئے لازم ہے۔ اور جسے ہاتھ میں لینے کے لئے ہمیں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ تاکہ دیو جہالت جو اِس مُلک پر مُسلط ہے اس کے زور سے مغلوب اور زیر ہو۔ اور فرزندان مُلک خدا کی اس سر زمین پر امن و آزادی سے رہیں سہیں۔ جن کے دل قدیم زمانہ کی شان و شوکت اور کامیابیوں سے مسرور اور آیندہ زمانہ کے توقعات و برکات سے معمور ہوں ٭

چند اعداد و شمار | بہرحال کچھ اعداد جو میں نے فراہم کئے ہیں اُن سے ہماری تعلیم کی حقیقت کسی قدر واضح ہو جائے گی:۔

برٹش انڈیا میں تعلیم کے متعلق جو آخری سالانہ اعداد شائع ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۶ء کو سرکاری اور پرائیویٹ درسگاہوں میں مسلمان لڑکوں کی تعداد تقریباً پندرہ لاکھ (۱۵،۰۰،۰۰۰) اور لڑکیوں کی دو لاکھ پچھتر ہزار (۲،۷۵،۰۰۰) تھی۔ جس کے مقابلہ میں سنہ ۱۶ء میں یہ تعداد علی الترتیب (تیرہ لاکھ پچاس ہزار ۱۳،۵۰،۰۰۰) اور (دو لاکھ پچپن ہزار ۲،۵۵،۰۰۰) تھی۔ یہ اضافہ خصوصاً لڑکیوں کی تعداد میں قابل اطمینان ہے۔ لیکن نہ اس قدر کہ ہمارے لئے باعث مسرت ہو۔ برٹش انڈیا میں مسلمانوں کی مردم شماری ۵ کروڑ ۷ ½ لاکھ ہے اور لڑکے لڑکیوں کو ملا کر مدرسہ جانیوالوں کی تعداد کا تناسب ۱۵ فی صدی کے مفروضہ تناسب سے بھی کم ہے۔ لیکن یہ یقین کرنے کے لئے معقول وجوہ ہیں کہ کم از کم ہندوستان میں یہ مفروضہ تناسب حقیقی تناسب سے بدرجہا کم ہے۔ حال ہی میں آپ کے شہر کے مشہور و معروف رسالہ ماڈرن ریویو نے ٹراونکور کے انتظامی رپورٹ سے ایک اقتباس شائع کیا تھا کہ ۱۵ فی صدی کا تناسب جو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے حقیقی تناسب سے بہت ہی کم ہے۔ چنانچہ رپورٹ نے اس امر پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ ایک تعلقہ میں زیر تعلیم طلبا کی شرح سو فی صدی سے زائد تھی جو بظاہر محتمل ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ مدرسہ جانیوالے طلبا کا اوسط ۱۵ فی صدی خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے۔ اسی بنا پر اس رپورٹ میں مدرسہ جانیوالے طلبہ کا اوسط بہ مقابلہ آبادی کے بجائے پندرہ فی صدی کے ۲۵ فی صدی فرض کر لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی اوسط پیدایش کو ملحوظ رکھ کر جو بہت زیادہ ہے یہ زیادہ معقول ہوگا کہ مدرسہ جانیوالے آبادی کا تناسب بمقابلہ کل آبادی کے ۱۵ فی صدی سے زیادہ رکھا جائے جس حالت میں کہ موجودہ مفروضہ تناسب کے حساب سے مسلمانوں کی

تعلیمی پستی اس قدر زیادہ ہے اگر حقیقی تناسب کے لحاظ سے دیکھا جائے گا تو یہ پستی اور بھی زیادہ معلوم ہو گی۔

جن اعداد و شمار کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے وہ اگرچہ مایوس کن ہیں لیکن جب ہم ان اعداد پر تعلیم کے مختلف مدارج کے لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں تو یہ مایوسی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ کالجوں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد صرف چھ ہزار ہے اور مدارس ثانوی میں ان کی تعداد تخمیناً دو لاکھ ہے۔ ابتدائی مدارس میں مسلمان طالب علموں کی تعداد سب سے زیادہ پائی جاتی ہے جو تعداد کثیر یعنی ۱۲۴۰۰۰۰ ہے اگر کامل تحقیقات کی جائے تو ظاہر ہو گا کہ ابتدائی مدارس کے کثیر التعداد طلبہ ابجد خوان ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کی تعداد برٹش انڈیا کی کل آبادی کے مقابلہ میں ۱/۵ ہے لیکن مسلمان طلبا کا تناسب جو کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں ۱/۱۰ اور مدارس ثانوی میں ۱/۶ سے کم ہے۔

البتہ یہ قابل لحاظ ہے کہ طلبا جو مدارس خاص میں تعلیم پاتے ہیں اُن میں پچاس فی صدی سے زائد مسلمان ہیں۔ یہ امر ایسا نہیں ہے جو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس لئے میں یہاں صحیح اعداد کا پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

مدارس صنعت و فنون میں آخر مارچ ۱۶ء میں کل ۱۶۱۳۰۸ طلباء تھے جن میں سے ۸۷۱۷۰ مسلمان تھے

ان اعداد سے میرے خیال میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان لڑکے جو زیادہ تعداد میں مدارس ابتدائی صنعتی میں پائے جاتے ہیں اور ثانوی مدارس میں ان کی تعداد بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ثانوی مدارس کی ایک تو تعداد کم ہے دوسرے فیس اس قدر زیادہ ہے کہ مسلمان غیر مستطیع طلبہ اس کے ادا کرنے سے قاصر ہیں اگرچہ یہ امر مسلم ہے کہ ثانوی تعلیم ہماری قوم کے لئے بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ ضروری اور مفید ہے۔ موجودہ حالت میں ہماری قوم کے اکثر نوجوان اپنی تعلیم یونیورسٹی سے محروم ہیں۔ وہ مجبوراً ابتدائی تعلیم کے بعد ذریعہ معاش حاصل کرنے کے لئے مدارس حرفت و صنعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ثانوی تعلیم کی مناسب اصلاح کر دی جائے اور ساتھ ہی اُن کی تعداد میں اضافہ اور فیس میں کمی ہو جائے تو اس سے مسلمان طلبہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ خصوصاً اُن طلبہ کو جو یونیورسٹی کی تعلیم کے خواہش مند ہیں۔ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کی حیثیت سے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے یونیورسٹی کی تعلیم سے کافی طور پر فائدہ حاصل نہیں کیا۔ گو یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک آدھ شخص اپنی ذاتی سعی سے ملک میں امتیاز و وجاہت حاصل کرے مگر یہ ناممکن ہے کہ اس زمانہ میں جو جدّ و جہد اور مناسبت کا مظہر عظیم ہے ہماری قوم اُس وقت تک دوسری اقوام کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی جب تک کہ ہمارے طلبا بھی اُنہیں کی طرح اعلیٰ تعلیم و تربیت سے مسلح نہ ہو جائیں۔ لارڈ ہالڈین نے جس کی رائے مسائل تعلیمی میں مستند مانی جاتی ہے ایک عام جلسہ میں اثنائے تقریر میں کیا خوب کہا کہ اعلیٰ ترین تعلیم کا دروازہ امیر و غریب سب کے لئے برابر کھلا رہنا چاہیئے۔ کیوں کہ اعلیٰ ذہانت کچھ امرا کی وراثت نہیں۔ خدا نے غریبوں کو بھی یہ نعمت بخشی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اپنے بچوں کی قابلیت اور صلاحیت سے غفلت کرے گی دنیا میں اس کا عزت سے رہنا مشکل ہو گا۔

سر ابراهیم رحمت اللہ
صدر اجلاس سی و دوم (سورت سنہ ۱۹۱۸ ع)

اجلاسِ دوم

اجلاس سی و دوم

(منعقدہ سورت ۱۹۱۸ء)

صدر

آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ کے سی ایس آئی

حالات صدر

سر ابراہیم رحمت اللہ مسٹر رحمت اللہ قادر بھائی تاجر بمبئی کے دوسرے بیٹے ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی عمر تعلیم کے قابل ہوئی مدرسہ میں داخل کئے گئے۔ ان کی تیز فہمی اور غیر معمولی ذکاوت کی وجہ سے شروع سے ان میں ترقی کن اور امید افزا علامات پائی جاتی تھیں۔ اور ان کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایک دن یہ کامیاب ہستی نہ صرف اپنے خاندان کے لئے بلکہ ملک اور قوم کے لئے باعث زینت ہوگی۔ وہ پرائمری تعلیم سے گزر کر سکنڈری تعلیم میں سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے تھے۔ مگر اتفاقاً ۱۸۷۹ء میں امتحان میٹرک میں ناکام ہونے کے باعث اور خانگی زندگی کی دشواریوں کی وجہ سے ان کی تعلیم کا خاتمہ ہو گیا جس طرح یہ اپنے جماعت میں ذہین اور ذکی الحس طلبہ میں شمار ہوتے تھے، اسی طرح مردانہ کھیلوں کے میدان میں بھی خاص دلچسپی اور نمایاں کامیابی کا اظہار کر رہے تھے بالخصوص کرکٹ اور ٹینس کے کھیلوں میں وہ بہترین کھلاڑی سمجھے جاتے تھے۔ اچھے کیریکٹر ہونے کے لحاظ سے (اسلام جیم خانہ) کے کیپٹن ہونے کا اعزاز بھی ان کو حاصل تھا۔ کرکٹ کے میدانوں اور ٹینس کے لانوں کے نہ وہ مشہور کھلنڈرے تھے۔ بلکہ انھوں نے ان مشاغل میں رہ کر اپنی خصلت اور عادات میں خاص قسم کی مضبوطی و استواری قائم کر لی تھی جو بعد ازاں ان کی آنے والی زندگی میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

جب یہ میٹرک میں ناکامیاب ہوئے تو اپنے بڑے بھائی مسٹر محمد بھائی رحمت اللہ کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ ۱۸۸۰ء میں ان کے والد نے انتقال کیا۔ شفیق اور تجربہ کار باپ کے انتقال کی وجہ سے کاروبار تجارت پر مضر اثر پڑا۔ اور کچھ عرصہ تک دونوں نوجوان بھائیوں کو تجارتی مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

بمبئی کے عام سوداگروں کی مثال پر نہ قایم رہ کر جو اپنی زندگی کا خاتمہ روپیہ حاصل کرنے میں کر دیتے ہیں۔ سر ابراہیم نے اپنے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ یہ زمانہ ہندوستان میں ایک دورِ جدید پیدا کر رہا تھا۔ اور بمبئی کی شہری زندگی میں کافی طور سے ہیجان تھا۔ سر فیروز شاہ جیسے اولوالعزم لوگ میدانِ عمل میں گام زن تھے۔ اخبارات سٹی کارپوریشن کے مباحثوں کو چھاپ کر پبلک اسپرٹ کو ابھارنے میں پرجوش طریقے سے مدد دے رہے تھے کیوں کہ ۱۸۸۴ء سے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں آزادی و ریفارم کی نئی لہریں اور موجیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں ۱۸۸۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس عالم وجود میں آ چکی تھی۔

سر ابراہیم کی پیدائش گو ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو سیاسی روایات سے یک سر خالی تھا لیکن حالات زمانہ نے ان کو خوش آئند موقع کا متوقع بنا دیا تھا۔ اُن کے دل میں معزز اور باوقار شہری بننے کی پرحوصلہ خواہش نے جذبات ترقی کی امنگ کے ساتھ حقائق حالات پر بصیرت حاصل کرنے کی قوت پیدا کر دی تھی۔ ہر کام کے شروع کرنے سے پہلے اس کے مالہ و ماعلیہ پر غور کرنے کی ان میں عادت پیدا ہو گئی تھی اور اب وہ اس درجہ پر پہونچ گئے تھے اور ان کے عزم وارادہ میں اس قدر استواری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس خواہش کا ارادہ کر کے مشکلات کی وجہ سے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے تجارتی لگاؤ کے ساتھ ساتھ اپنی دماغی اور ذہنی قابلیت کو بڑھانے اور اخبارات کے مطالعہ سے معلومات عامہ کو وسیع کرنے اور اسی کے ساتھ فن تقریر میں مہارت کامل حاصل کرنے کی خاص طور سے کوشش شروع کر دی۔ ارادہ کی پختگی، ہمت، استقلال ثابت قدمی کی صفات نے انجام کار ہندوستان کے مشہور اور قابل لوگوں کی صف اولین میں ان کو پہونچا دیا۔ چنانچہ ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہ نے اپنی ایک باموقع تقریر میں ان کی نسبت حسب ذیل فقرہ استعمال کیا تھا۔

انھوں نے کہا

”ہماری قوم نے جنوبی ہند میں جو مشہور ہستیاں پیدا کیں ان میں یہ (یعنی سر ابراہیم رحمت اللہ)

سب سے زیادہ قابل ہیں"

ہر ہائنس کی اس رائے اور خیال کے صحیح ہونے میں ذرا بھی شک و ریب کی گنجائش نہیں۔
سر ابراہیم نے ذمہ داری کے مدارج پر پہونچ کر باوصف پیدائشی اور مذہبی مسلمان ہونے کے دوسری اقوام ہند میں کافی طور سے اعتبار اور اعتماد حاصل کیا۔ ان کی فصیح و بلیغ تحریروں اور تقریروں نے دوسروں سے ہمیشہ خراج تحسین لے کر اپنے اعتماد اور بھروسے میں ترقی دی۔ اسی زمانہ میں جب کہ گورنمنٹ کے مقرر کردہ اشخاص بہت کم قابل بھروسا خیال کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے بڑے بڑے انتظامی محکمہ جات میں عوام کا اعتبار اور گورنمنٹ کا اطمینان حاصل کرتے میں ہمیشہ اپنی عمدہ خدمات اور قابلیتوں کا پُر فخر ثبوت پیش کیا۔

وہ جنوری ۱۸۹۲ء میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور ۱۸۹۴ء میں جسٹس آف دی پیس بنائے گئے۔

۱۸۹۸ء میں کارپوریشن کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور اس انتخاب کے سات برس کے اندر ہی اندر اُنھوں نے کارپوریشن کے صدر کی قابل عظمت جگہ حاصل کر لی جس کے بعد وہ کارپوریشن کے ممبر اس وقت تک رہے جب تک کہ ۱۹۱۸ء میں صوبہ کی کونسل کے ممبر نہ منتخب ہو گئے۔ اس لحاظ سے ان کا تعلق کارپوریشن سے ۲۷ چھبیس برس کا رہا۔

اس سلسلہ میں (امپرومنٹ ٹرسٹ) تزئین بلدہ کے متعلق ان کی شاندار شہری خدمات قابل ذکر رہیں گی۔ ان کی تعلیمی خدمات بھی دوسرے کاموں سے کم وقیع نہیں ہیں۔ وہ عرصہ تک اسکول کمیٹی کے ممبر رہے۔ ابتدائی تعلیم کی دقتوں کو اُنھوں نے بہت کچھ حل کرنے کی کوشش کی۔ سر ابراہیم ان سیاسی متقدمین سے ایک ہیں جن کا خیال ہے کہ جب تک عوام کی تعلیم کے لئے تیز روی کے ساتھ کام نہیں کیا جائے گا اس وقت تک سیاسی ترقی ناممکن ہے۔ ان کی توجہ سے شہر بمبئی میں میونسپل مدارس معقول تعداد میں جاری کئے گئے۔ چوں کہ ان مدارس میں قرآن شریف کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی اس لئے مسلمان اپنے بچوں کو مدرسوں میں داخل نہیں کراتے تھے۔ اور بجائے مدارس کے ان مکتبوں میں اپنے بچوں کو بھیجنا پسند کرتے تھے جہاں قرآن شریف کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس وجہ سے مسلمان لڑکوں کی تعلیم میں بڑی رکاوٹ حائل تھی مسلمانوں کے اس تعلیمی نقصان کو محسوس کر کے اُنھوں نے میونسپل کے اردو مدارس میں قرآن پاک کی تعلیم کو لازمی کئے جانے کی کوشش کی۔ ان کی اس تحریک سے کارپوریشن میں سخت اختلاف پیدا ہوا۔ لیکن وہ ممبروں کی ایک بڑی تعداد کو ہم نوا بنانے میں کامیاب ہوئے اور ان کی تجویز منظور

ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان طلبہ بڑی تعداد میں تیزی کے ساتھ اردو مدارس میں داخل ہونے لگے اور اس کوشش کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کے فوائد مسلم شہری آبادی کے قدامت پسند طبقہ تک آسانی کے ساتھ پہونچ گئے۔

ان کی شہری خدمات نے نہ صرف پبلک میں ان کی عزت اور عظمت پیدا کی بلکہ حکومت نے بھی ان کی قابلیت کو محسوس کر کے سنہ ۱۹۰۴ء میں بمبئی کا (شریف) اور اسی سال بمبئی یونیورسٹی کا فیلو مقرر کیا۔

اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بہ حیثیت خدمات (سٹی کارپوریشن) سر فیروز شاہ مہتہ جیسے عظیم اور مقتدر لیڈر کے بعد سر ابراہیم ہی ایک ایسے شخص تھے جو ان کے صحیح جانشین سٹی کارپوریشن میں ثابت ہوئے۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں وہ بمبئی لیجس لیٹیو کونسل کے ممبر مقرر ہوئے جس کا سلسلہ سنہ ۱۹۰۹ء تک قائم رہا۔

جماعتی قائم مقامی کے دوران کش مکش میں جب کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں ویسرائے ہند لارڈ منٹو نے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ مارلے کی منظوری سے گورنمنٹ آف انڈیا اور صوبہ جاتی حکومتوں میں ریفارم منظور کیا تو سر ابراہیم نے مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر بڑی توجہ کی۔ ان کے خیال میں یہ ہندو مسلم سوال نہیں تھا بلکہ قوم کی ترقی کی ایک بنیاد تھی۔ مقابلہ کی کش مکش میں خوف تھا کہ مسلمان جیسی پس ماندہ قوم اس میں پھنس کر اور بھی پس ماندگی کی طرف چلی جائے گی۔ اور اس طرح سے ہندوستان کی قومیت کو جو دھکا لگے گا اس کی تلافی بہت دشوار ہو جاوے گی لہٰذا سر ابراہیم مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کی کوشش میں بہت پیش پیش تھے۔ انھوں نے ہندو لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ اس معاملہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں تاکہ کانسٹی ٹیوشنل ترقی کے لئے متحدہ قوت حاصل ہو سکے اور جس وقت وہ بطور مسلم نمائندہ ہونے کے کونسل کمیٹی میں شملہ بلائے گئے تو ان ہی کی قائم کردہ بنیاد پر مارلے منٹو ریفارم اسکیم قائم ہوئی۔

سر ابراہیم پہلے شخص ہیں جنھوں نے مارلے منٹو ریفارم کونسل بمبئی میں پرائیویٹ بل پیش کیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے اوقاف خیر عامہ کی رجسٹری کا بل پیش کیا جس کی تائید نہ صرف انگریزی اور دیسی اخبارات نے عام طور سے کی بلکہ گورنمنٹ نے بھی ان کی اس تجویز سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ چنانچہ یہ بل لوکل کونسل میں منظور ہو کر ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد ہوا۔ چوں کہ گورنمنٹ آف انڈیا اس قسم کے بل کو تمام ہندوستان پر حاوی کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے آخر میں بل ملتوی ہو کر رہ گیا۔

تاہم ان ہی اصولوں پر سنہ ۱۹۲۳ء میں مسلم اوقاف ایکٹ پاس ہوا جس کو پردوان کے مسٹر ابو القاسم نے لیجس لیٹو اسمبلی میں پیش کیا تھا۔

حجاج کے لئے جو قرنطینہ قائم کیا گیا تھا وہ سر ابراہیم کی ان تھک کوششوں سے دور ہوا۔
قومی اور ملکی خدمات کی وجہ سے بمبئی کی مختلف جماعتوں اور گروہوں میں جو عزت ان کی کی جاتی ہے اس کے لحاظ سے تمام جماعتوں نے ان کو کارپوریشن اور کونسل کا خاص عنصر خیال کر لیا ہے۔
نیز گورنمنٹ بمبئی نے بھی صوبہ کے دیگر قابل احترام اشخاص سے زیادہ ہی بھروسہ ان پر کیا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سی آئی ای اور ۱۹۱۱ء میں سر کے خطاب سے ان کی عزت افزائی کی گئی اگرچہ سر ابراہیم کو کمرشیل اور بمبئی کی شہری زندگی میں زیادہ مشغول رہے لیکن اس پر بھی ان کا سیاسی پروپیگنڈا آہستگی کے ساتھ برابر جاری رہا اور جب ان کو موقع ملا ملک کی دوسری مفید تحریکوں میں عملاً دلچسپی لینے کا انھوں نے اظہار کیا۔
آل انڈیا مسلم لیگ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس آل انڈیا نیشنل کانگریس انڈسٹریل کانفرنس وغیرہ ملکی اور قومی مجالس میں وہ شریک ہوئے ۱۹۰۴ء میں جب کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہونے کو تھا تو یہ اس کمیٹی میں شریک کئے گئے جو اس کے قواعد و ضوابط پر غور کرنے کے لئے بیٹھی تھی ۱۹۰۶ء کے پر آشوب زمانہ میں جب کہ مسلمان من حیث القوم کانگریس سے علحدہ ہو گئے تھے اس وقت بھی سر ابراہیم لیگ اور کانگریس کو برابر امداد پہونچاتے رہے ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس آگرہ میں ہوا تو یہ اس کے پریسیڈنٹ تھے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۶ء تک سر ابراہیم امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر رہے۔ اسمبلی میں انھوں نے ہندوستان کی تجارتی اور حرفتی ترقی کے لئے بہت کچھ کام کیا اور یہ انھیں کی تدبیر اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ تحریک مذکورۂ بالا پر غور کرنے کے لئے تین کمیشن مقرر ہوئے جنھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کی پالیسی کی بابت انڈسٹری ریلوے اور ٹیرف میں تبدیلی پیدا کرنے میں امداد دی۔
۱۹۱۶ء میں بمقام سورت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے وہ صدر بنائے گئے۔ کانفرنس کے کامیاب جلسوں میں جلسہ مذکورہ نہایت شاندار تھا۔ سورت میں ہوسٹل کے قیام کی تجویز اجلاس مذکور میں پیش ہو کر پاس ہوئی۔ تجویز مذکور کا عملی پہلو یہ تھا کہ جب تجویز پیش کی گئی اس وقت جلسہ میں ہوسٹل کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا یکمشت چندہ بھی پیش کیا گیا۔ علاوہ ازیں دو ایک ممتاز معطی نے دس ہزار روپیہ یکمشت اس غرض سے آنریری سکرٹری کانفرنس کو دیئے کہ وہ ان طلبہ پر جو گجرات سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جائیں ان کو وظائف دیئے جائیں۔
۱۹۱۶ء کے شروع میں سر مہادیو چوبل گورنمنٹ بمبئی کی ممبرشپ سے علحدہ ہوئے تو سر ابراہیم ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر مقرر کئے گئے ۱۹۱۹ء میں ریفارم اسکیم کے جاری ہونے سے پہلے تعلیم اور لوکل سیلف گورنمنٹ کا چارج ان کے ہاتھ میں تھا ان کے زمانہ اقتدار میں میونسپلٹیوں اور لوکل بورڈس کو بہت کچھ مراعات

حاصل ہوئیں۔ وسیع پنچایت ایکٹ ۱۹۲۰ء میں انھیں کے دوران حکومت میں اُنھیں کی توجہ سے پاس ہوا۔ کونسل کے سنیئر ممبر ہونے کی وجہ سے یہ دو سال تک بمبئی لیجس لیٹو کونسل کے لیڈر رہے۔ ان خدمات کے صلہ میں جون ۱۹۲۳ء میں وہ کے سی ایس آئی کے خطابات سے مخاطب کئے گئے۔

ریٹائر ہونے کے بعد سر ابراہیم کا خیال لیجس لیٹو اسمبلی میں جانے کا تھا کہ یکایک مئی ۱۹۲۴ء میں سر نرائن چندروا کر پریسیڈنٹ بمبئی کونسل کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت کے گورنر سر جارج لائڈ کے بہت اصرار پر سر ابراہیم کو کونسل کی صدارت کا منصب قبول کرنا پڑا۔ ۱۸ر فروری ۱۹۲۵ء کو اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن تمام ممبران کی خواہش کو دیکھ کر ہز اکسیلنسی گورنر نے پھر ان کو نان آفیشل ممبر کے طور پر منتخب کیا۔ یہ ان کی شہرہ آفاق قابلیت اور عام مقبولیت کی وجہ تھی کہ جب ان کا نام پیش ہو کر مشتہر کیا گیا تو ایک متنفس نے بھی کسی دوسرے کا نام پیش نہیں کیا اور وہ بلا اختلاف درجہ صدارت کے لئے منتخب ہو گئے۔

۱۹۲۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا۔ جلسہ مذکور کے لئے سر موصوف کا نام صدارت کے واسطے پیش ہو کر منظور ہوا۔ سورت کانفرنس اور بمبئی کانفرنس کے اجلاسوں کے موقعہ پر جو عالمانہ خطبے اُنھوں نے ارشاد کئے وہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

سر ابراہیم نے باوجود ابتدائی زمانہ کی مشکلات کے بتدریج اپنی ذہنی اور دماغی قوتوں کو طاقت پہونچانے میں اور ان کے ابھارنے میں جو کوشش کی اور جو بے نظیر استقلال اور ہمت انھوں نے دکھائی اور جس کی وجہ سے وہ موجودہ عروج و اقبال کو پہونچے ان کی ذات نوجوان تعلیم یافتوں کے لئے ایک ایسا نمونۂ عمل ہے جس کے پیش نظر رکھنے سے وہی اوصاف ان میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کی ضرورت ہر کامیاب زندگی کو ہو سکتی ہے۔

جنوری ۲۷ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے ایک پمفلٹ مسلم یونیورسٹی کی تنظیموں کی اصلاح کی غرض سے شائع کر کے ایک کمیشن کے ذریعہ سے اصلاح کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ علیا حضرۃ چانسلر مسلم یونیورسٹی نے بمشورہ ہز اکسیلنسی وائسرائے وہ مشہور کمیشن اکتوبر ۲۷ء میں مقرر کر کے علیگڑھ بھیجا جس کے ممتاز ممبر سر ابراہیم رحمت اللہ، سر جارج اینڈرسن ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب اور سر فلپ ہرٹوگ مقرر ہوئے۔ ان ممبروں میں صدر ممبر کی حیثیت سر ابراہیم کو حاصل تھی۔ ممبران کمیشن نے ایک مہینہ علیگڑھ میں قیام کر کے مختلف شہادتیں قلمبند کیں۔ اہم شعبہ جات یونیورسٹی کو دیکھا بھالا۔ قواعد و قوانین و طرز عمل پر نظر کر کے ایک مبسوط رپورٹ کے ذریعہ سے اصلاحات کی سفارش کی۔ علیگڑھ تحریک کی تاریخ میں واقعات مذکورہ نہ صرف مسلم قوم کے لئے بلکہ ملک بھر کی توجہ کو زمانہ دراز تک مسحور بنائے رہے۔۔ اس تحریک کی تہ میں سب سے بڑا انقلاب جو اس وقت پیش آیا وہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سی آئی ای پی ایچ ڈی پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا مسلم یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوش ہونا ہے۔ تقریباً تینتیس برس کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی شان دار اور مختلف اعلیٰ خدمات کے بعد ۲۷ر اپریل ۲۸ء کو مستعفی ہو کر جدا ہو گئے۔

خطبۂ صدارت

حضرات! میں آپ صاحبان کی اس عزت افزائی کا نہایت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ کا صدر مقرر فرمایا ہے۔ یہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس عرصہ تیس سال سے زائد تعلیم و تربیت کی تمام ہندوستان میں اشاعت کرتی رہی ہے۔ اس مشن کے آغاز کے وقت جسے ۳۲ برس گزر گئے ہیں مسلمانوں کی تعلیمی حالت سخت اندوہناک تھی۔ اس طویل عرصہ میں اس کی مساعی جمیلہ کی بدولت بہت کچھ مفید اور مستقل ترقی ہوئی ہے۔ تاہم پس ماندگی کا دھبہ ابھی تک مسلمانوں کے دامن پر ہے اور اس سے پیشتر کہ کانفرنس کا مستحسن مشن پورا ہو اور مسلمان اس ملک کی دیگر ہمسایہ قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہو سکیں۔ ہمیں ابھی تعلیم کے میدان میں بہت کچھ ترقی کرنی باقی ہے۔ آج ہمارے اس جگہ مجتمع ہونے کی صرف یہی غرض ہے کہ ہم حتی المقدور اس پسندیدہ مقصد کے حصول کے لئے بہترین کوشش کریں۔ ہندوستان کی تمام اطراف وجوانب سے آپ صاحبان اُس قوم کی تعلیمی پستی کے داغ کو مٹانے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ (اور آپ کا یہ طرزِ عمل ایثار کی اعلیٰ مثال ہے) جو کسی زمانہ میں محفل دنیا میں تہذیب وتمدن کی شمع فروزاں سمجھی جاتی تھی۔ اس کارخیر میں شرکت کی دعوت کا میں بہت ممنون ہوں۔ اور آپ کی اس عین عنایت کا شکریہ ادا کرنے سے میں بالکل قاصر ہوں۔

جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ابھی ابھی دنیا کی سب سے بڑی جنگ ختم ہوئی ہے جو عرصہ دراز سے جاری تھی۔ اور خدائے تعالیٰ نے ان اقوام کو فتح و نصرت بخشی ہے جو حریت اور نیکی کی دلدادہ ہیں۔ دنیا نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ اور جمہوریت کی لہر دن بدن زبردست ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف ہمیں اس کامیابی پر جو اتحادی طاقتوں کو حاصل ہوئی ہے کمال مسرت ہے اور ان اغراض ومقاصد کی نصرت پر دلی امتنان ہے جس کی خاطر انھوں نے جنگ کی تھی۔ دوسری طرف ہمارا فرض ہے کہ ہم اس دنیائے ترقی میں وہ جگہ لینے کی سرگرم کوشش کریں جس کے ہم حق دار ہیں۔ کیوں کہ اس عظیم الشان لڑائی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر قوم کو اس کی حیثیت کے مطابق جگہ دی جائے گی۔ اس جگہ کو حاصل کرنے کے لئے مسلمانان ہند کے سامنے صرف ایک ہی طریقہ ہے اور یقیناً آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے حصول مدعا کا ذریعہ وسیع معنوں میں تعلیم ہے۔ ہماری مہربان گورنمنٹ نے اعلان کر دیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا مطمح نظر "خود اختیاری"

گورنمنٹ" ہے اور اصلاحات کی اسکیم بھی شائع کی جاچکی ہے۔ تاکہ اس ملک کے باشندے مناسب عرصہ کے اندر اپنے مقصود تک پہنچ جائیں لہذا ضروری ہے کہ مسلمانان ہند تحصیل علم کے لئے جان توڑ کوشش کریں تاکہ آزاد اور خود مختار ہندوستان میں وہ اپنا حق صرف قابلیت واہلیت کی بنا پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ دوسرے کے سہارے کی ہمیشہ توقع رکھنا سخت موجب ذلت ہے۔ لہذا ہم میں سے ہر ایک شخص کی یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ وہ اس ملک کی پبلک زندگی میں جلد سے جلد اس پوزیشن پر پہونچ جائے جس کی آپ کی قوم جائز طور سے مستحق ہے۔

اسلام و علم

مجھے ہمیشہ اس بات کی فکر دامن گیر رہی ہے کہ میں ان اسباب کو معلوم کروں جو مسلمانوں کی دوامی تعلیمی پستی کے ذمہ دار ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے اور اس کا ذکر میں ان اعداد کے ضمن میں کروں گا جنھیں میں نے جمع کیا ہے لیکن بلاشبہ وہ صورت حالات کی نزاکت اور ضروریات کے کسی طرح مطابق نہیں ہیں ضرور کچھ وجوہ ہیں جن کے باعث معقول ترقی نصیب نہیں اور یہ لازمی ہے کہ ہم ان اسباب کے معلوم کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کا سدباب اور آئندہ ترقی یقینی طور پر ہو سکے۔ میری رائے میں یہ امر ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان ہند دیگر ہم سایہ اقوام کے مقابلہ میں ذہنی قوت کے اعتبار سے کمتر ہیں چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ اہل اسلام ویسی ہی ترقی نہ کر سکیں جیسی کہ اور اقوام عالم کر رہی ہیں۔ اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی مذہبی امر تعلیمی ترقی کا مانع ہے۔ سالہا سال سے میرے سننے میں یہ بات آرہی ہے کہ اکثر اشخاص کا اعتقاد ہے کہ اجنبی زبانوں میں تعلیم دینا درحقیقت مذہب اسلام کے منافی ہے۔ ان ہی وجوہ پر ان کے قول کے مطابق کٹھ ملاؤں نے انگریزی علوم کے مطالعہ کی سختی سے ممانعت کی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کے وعظ و نصیحت کے خراب اثرات بتدریج زائل ہو رہے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ابھی بہت سے لوگ اسی عقیدہ پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس جلسہ میں اس کی نسبت ذرا وضاحت سے بحث کروں۔ مسلمان راسخ الایمان ہیں ان کا یہ شک رفع کرنا لازمی ہے کہ اجنبی زبانوں کی تعلیم کا اسلام مخالف نہیں بلکہ نہایت شد و مد سے یہ بات ہمارے فرائض میں داخل کر دی گئی ہے کہ ہم ہر ایک مقام پر علم حاصل کریں جہاں کہیں وہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشہور حدیث سے واقف ہیں کہ علم حاصل کرنے کے لئے اگر چین بھی جانا پڑے تو جانا چاہیئے۔ جن اصحاب نے اس مضمون کا کافی مطالعہ کیا ہے انھیں کامل یقین ہے کہ یہ کہنا کہ اسلام اجنبی علوم کی ترویج میں حارج ہے اس کی بہت بڑی توہین ہے۔ اگر اس حدیث سے یہ مراد لی جائے جیسا کہ

بعض جگہ لی جاتی ہے۔ کہ اس سے محض مذہبی تعلیم مقصود ہے تو چین کی طرف اشارہ کرنا لایعنی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عین حیات میں مذہبی علوم عرب کے ایک محدود حصہ میں پڑھائے جاتے تھے اور اس لئے مسلمانوں سے چین جا کر مذہبی تعلیم کے حاصل کرنے کی توقع رکھنا بالکل بے سود تھا۔ واضح رہے کہ اس زمانہ کا سفر سخت مصیبت ناک تھا اور اس لئے چین جیسے دور دراز ملک کا نام لے کر خاص طور پر وضاحت کرنے سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان محض تحصیل علوم کے لئے جہاں کہیں بھی وہ حاصل کئے جا سکیں۔ طرح طرح کی صعوبتیں اُٹھا کر جائے۔ میرے خیال میں ان لوگوں کے عقیدہ کا یہ دنداں شکن جواب ہے جو ابھی تک یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے فقط مذہبی تعلیم مراد ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حدیث مقدس کی ایسی محدود تاویل بالکل ناقابل پذیر ہے۔ سچ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کے لئے مذہبی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہے اور آگے چل کر میں اس شعبہ پر بھی بحث کروں گا۔ فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اصول اسلام اس امر کے مقتضی ہیں کہ نہ صرف مذہبی۔ بلکہ دنیاوی علوم بھی حاصل کئے جائیں جس تو ہین کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کا قطعی جواب جناب رسالت مآب (صلعم) کے زمانۂ مبارک کے واقعات اور آپ کے صحابہ کرام کی تواریخ میں پایا جاتا ہے جس کی مابعد کی صدیوں میں مختلف ممالک میں تقلید کی گئی تھی۔

محقق جے جے پول اپنی کتاب "اسلام پر ایک نظر"[۱] میں لکھتا ہے:۔

"جہاں اسلام پیغمبر عرب (صلعم) کا اور شعبوں میں اس قدر رہین منت ہے وہاں اس میں بھی ممنون احسان ہے کہ اُنھوں نے قرآن کریم کے ذریعہ علم ادب میں ایک جدید طرز کی بنیاد ڈالی اور پاک خیالات اور اعلیٰ حقائق کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔

تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن مجید ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز کتاب ہے اور گزشتہ سالوں میں میں نے غور سے جو اس کا مطالعہ کیا ہے تو میں اس کی بلاغت۔ الفاظ کی شان و شوکت اور جملوں کی شان دار روانی سے حیران رہ گیا ہوں اور تعلیم اسلام کا ذکر درکنار میں حضرت محمد (صلعم) کا گرویدہ ہو گیا ہوں ..... بلاشبہ کلام پاک کی مہتم بالشان بلاغت اور خیالات کی بلند پروازی نے ممالک اسلام کی تمام تصانیف مابعد پر بے انتہا اثر ڈالا ہے۔

"رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ہی جنگ اور جنگ کے اندیشوں نے علم ادب کی اشاعت میں رکاوٹ پیدا کی تاہم تعلیم و تصنیف کا شوق لوگوں کے دلوں میں برابر امڈ آیا اور خصوصاً حضرت علیؓ کو اس قدر دلچسپی تھی کہ ان کے متعلق روایت ہے کہ اُنھوں نے اپنے عہد خلافت

[۱] برصفحہ آئندہ

ہیں قومی مصنفوں کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ انھیں ترغیب تصنیف بھی دی۔ حضرت علی (رض) خود بھی ایک بڑے ادیب تھے۔ اور ان کے نصائح اور مواعظات کا مجموعہ ایک کتاب "اقوال علی" کی صورت میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے اور اہل یورپ کو اس کا اور زیادہ مطالعہ کرنا واجب ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگرچہ جنگ و جدال نے ترویج علم میں رکاوٹ پیدا کی۔ تاہم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد علم کا شوق بہت زیادہ تھا اور علم کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اپنا ثمر لا رہے تھے۔ دوسرا اقتباس جو میں آپ کو سنانے کی جرأت کرتا ہوں۔ ڈریپر کی کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" سے لیا گیا ہے۔[۲]

اس طویل عرصہ میں عیسائی ممالک کے لوگ زیادہ تر باری تعالےٰ کی ذات کے مباحث میں مصروف رہتے تھے اور دینی فوقیت کے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتے رہتے تھے۔ پادریوں کا رسوخ اور یہ عام عقیدہ کہ ان کی آسمانی کتابوں میں تمام علوم موجود ہیں۔ قوانین قدرت کی تحقیق میں مانع تھا۔ اگر اتفاقاً کوئی شخص ہیئت کے کسی مسئلہ پر سوال کرتا تھا تو فوراً اس کے جواب میں آگسٹین اور لیکٹینٹی اس کی کتابوں کا حوالہ دے دیا جاتا تھا۔ اور مظاہرات سماوی بالکل نظر انداز کر دیئے جاتے تھے۔ مذہبی تعلیم کو دنیاوی تعلیم پر اس درجہ ترجیح دے دی گئی تھی کہ ۱½ ہزار سال کے طویل عرصہ میں عیسائی ایک ہیئت داں بھی پیدا نہ کر سکے۔

مسلمانوں نے اس سے کہیں زیادہ ترقی کی۔ ان کے یہاں علم طبعی کی اشاعت ۶۳۸ء سے شروع ہو جاتی ہے۔ جب کہ انھوں نے اسکندریہ کو فتح کیا تھا۔ یعنی رسول عرب (صلعم) کی وفات سے فقط ۶ سال بعد۔ دو صدی کے اندر اندر وہ یونانی مصنفین علم طبعی سے نہ صرف واقف ہو گئے تھے۔ بلکہ ان کی تصانیف کا اندازہ کرنے کی قابلیت حاصل کر چکے تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں خلیفۃ المامون نے میکائیل ثالث سے عہد نامہ کے بموجب بطلیموس کی کتاب "علم ہیئت" کا ایک نسخہ بھی طلب کیا تھا اور اس کا فوراً عربی میں ترجمہ بھی کرایا تھا۔ اس کتاب پر عربوں کا علم ہیئت تمام و کمال مبنی ہے۔ اس کے ذریعہ عربوں نے چند اہم مسائل طبعی حل کئے۔ انھوں نے زمین کا طول و عرض دریافت کیا۔ اور تمام اجرام فلکی کی جو انھیں دکھائی دیتے تھے۔ ایک ترتیب وار فہرست مرتب کی اور ان میں سے بڑے

---

[۱] نوٹ صفحہ گزشتہ J. J. Pool's Studies in Mohammedanism صفحات ۳۲۵ سے ۲۶ ۱۸۹۲ء

[۲] J. W. Darper's History of the Conflict between Religion and Science صفحات ۱۵۷ سے ۵۹ ۱۸۷۷ء

تاروں کے وہ نام رکھے جو اب تک ہمارے نقشوں اور کروں پر لکھے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے سال کی وسعت کا صحیح اندازہ کیا اور اجرام فلکی کی شعاع میں جو کجی پیدا ہوتی ہے وہ معلوم کی اور رلنگروالی ساعت ایجاد کی۔ ستاروں کی تصویر اتارنے کے فن کو ترقی دی ہوا میں روشنی کی شعاعوں کا ٹیڑھا پن معلوم کیا متوازی الافق آفتاب اور ماہتاب کے مظاہرات کے اسباب دریافت کئے اور ان کے قبل از طلوع و قبل از غروب مشاہدہ کے اسباب بیان کئے۔ کرہ ہوا کی بلندی ناپی اور اسے ۵۸ میل قرار دیا۔ شفق کا صحیح مسئلہ معلوم کیا۔ تاروں کے جھلملانے کے وجوہ دریافت کئے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے یورپ میں رسد خانہ تعمیر کیا۔ ان کے مشاہدے اس درجے تک صحیح اترے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے قابل ترین مہندس ان کے نتائج استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لیپ لیس نے اپنی کتاب "نظام عالم" میں البتیجنی کے مشاہدات کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ مصنف موصوف کا مشاہدہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ مدار ارض کی گولائی بڑھتی جاتی ہے۔ لیپ لیس نے ابن یونس کے نتائج متعلقہ کجی مدار شمس کا اپنے مباحث میں استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی زحل و مشتری کی زیادہ تفاوت کے مسئلہ کا حوالہ بھی دیا ہے جسے ابن یونس نے دریافت کیا تھا۔

یہ عرب ہیئت داں کی وسیع خدمات کا محض ادنے نمونہ ہیں جو اُنھوں نے ماہیت علم کے مسئلہ کے حل کرنے میں بنی نوع انسان کے لئے انجام دی ہیں"

اس اقتباس سے اس ترقی کا کچھ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے جو پیغمبر خدا (صلعم) کی وفات کے بعد تقریباً دو سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے سائنس اور علم ادب میں کی۔

میں اب آپ کی توجہ گبن کی مشہور تاریخ موسوم بہ "زوال دولت رومۃ الکبریٰ" کے چند اقتباسات کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

"حکمائے دنیا کے سچے ستارے اور واضعان قوانین ہیں اور اگر وہ دنیا کی رہ نمائی نہ کریں تو بنی نوع انسان از سر نو جہالت و گمراہی میں پڑ جائیں۔ خلفائے بنی عباس نے المامون کے اجتہاد اور وسیع علمی دلچسپی کی قدم بقدم پیروی کی۔ ان کے ہم عصر یعنی خاندان بنی فاطمہ کے شاہان افریقہ اور بنی امیہ کے سلاطین اندلس اسی طرح مصنفین کے مربی بنے رہے جیسے کہ وہ در اصل دین کے حامی تھے۔ ان کے خود مختار عاملان صوبجات نے بھی انھی شاہی حقوق اور مراعات کو قائم و برقرار رکھا اور ان کی قدردانی کا یہ نتیجہ نکلا کہ سمرقند اور بخارا سے لے کر فیضان اور قرطبہ تک سائنس کا چرچا پھیل گیا۔ صرف ایک ہی سلطان کے وزیر (نظام الملک) نے دو لاکھ اشرفیاں بغداد میں نظامیہ کالج بنانے کے لئے عطا کیں۔

اور اس کے علاوہ ۱۵ہزار دینار کی سالانہ آمدنی کی املاک وقف کیں۔ اس دارالعلوم میں مختلف اوقات میں ۶ ہزار تک طلبہ درس لیا کرتے تھے اور ان میں امرا سے لے کر معمولی صناعوں تک کے لڑکے شامل تھے۔ غریب طلباء کے لئے کافی سرمایہ مہیا کیا گیا تھا۔ اور معلمین کی قابلیت اور سعی کا معاوضہ نہایت فیاضی سے دیا جاتا تھا۔ ہر شہر میں علم کے دلدادہ عربی کتابوں کی نقل کرتے اور انھیں جمع کرتے تھے۔ اور امرا کی خودنمائی اس شوق کے لئے تازیانہ ہوتی تھی۔ ایک طبیب نے سلطان بخارا کی دعوت نامنظور کردی تھی۔ اس لئے کہ اس کی کتابوں کی باربرداری کے لئے چارسوا ونٹوں کی ضرورت تھی۔ بنی فاطمہ کے بادشاہوں کے کتب خانہ میں ایک لاکھ قلمی کتابیں تھیں جو اعلیٰ خط میں لکھی ہوئی تھیں اور جن کی شاندار جلدیں تھیں اور جو قاہرہ کے طلباء کو بشکل تمام مستعار دی جاتی تھیں۔ لیکن یہ کتب خانہ اس کتب خانہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا جو بنی امیہ کے سلاطین نے اندلس میں قایم کیا تھا۔ اور یہاں چھ لاکھ کتابیں جمع کی گئی تھیں اور جس کی فہرست ۴۴ جلدوں میں تھی۔ بنی امیہ کے دارالسلطنت قرطبہ اور اطراف کے شہروں ملاکا۔ المیریا اور مرسیا میں تین سو سے زائد مصنفین پیدا ہوئے۔ اور مملکت اندلس میں ۷۰ سے زیادہ کتب خانے عوام کے لئے قایم کئے گئے۔ عربوں کی علمی شان وشوکت پانچ سو سال تک قایم رہی اور مغلوں کے زبردست حملہ کے بعد زوال پذیر ہوئی۔ اور یہ وہی زمانہ ہے جب کہ یورپ میں تاریکی اور کاہلی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن جب سے مغرب میں سائنس کا آفتاب طلوع ہوا ہے اس وقت سے مشرقی علوم بظاہر تنزل پذیر ہوگئے ہیں...... حکمائے یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔ اور ان کی بنیاد پر اور کتابیں بھی تصنیف کی گئیں۔ اور اگرچہ اصل زبان (یونانی) کی بعض کتابیں مفقود ہوگئی ہیں تاہم وہ مشرقی کتابوں کی صورت میں دستیاب ہوگئی ہیں۔ اور مشرقی دنیا میں ارسطو۔ افلاطون۔ اقلیدس۔ بطلیوس۔ بقراط اور جالینوس کی تصنیفات موجود تھیں اور یہاں اُن کا مطالعہ کیا جاتا تھا"

میں آپ کی توجہ خاص طور پر اس تاریخی حقیقت کی جانب منعطف کرتا ہوں کہ حکمائے یونان مثل ارسطو۔ افلاطون۔ اقلیدس۔ اپولونیس۔ بطلیموس۔ بقراط اور جالینوس کی تصنیفات کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا تھا اور ان کی بنیاد پر اور کتابیں تصنیف کی گئی تھیں۔ واضح رہے کہ یہ عمل ناممکن تھا۔ تاوقتیکہ وہ یونانی زبان بخوبی تحصیل نہ کرچکے ہوں اور یونانی زبان ان کے لئے ایک اجنبی زبان تھی۔

ذیل کا اقتباس جس کے سننے کی میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔ وہ اسٹین لے لین پول کی کتاب "اندلس میں موروں کی حکومت" سے لیا گیا ہے۔[1]

اگرچہ قرطبہ کے محلات وباغات خوش نما تھے لیکن دارالسلطنت کے موجب افتخار اور اسباب

[1] صفحہ آئندہ ملاحظہ ہو

بھی ہیں۔ روح ایسی ہی خوش نما تھی جیسا کہ جسم۔ اس کے معلمین اور مدرسین نے اسے یورپ کی تہذیب کا مرکز بنا دیا تھا۔ تمام اکناف یورپ سے طلباء وہاں کے مشہور حکماء سے سبق لینے کے لئے آتے تھے اور راہبہ ہیروس وتھا جو گانڈرشیم کی خانقاہ میں رہتی تھی۔ مقدس یو لوجیس کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے قرطبہ کی تعریف کا گیت گانے سے باز نہ رہ سکی۔ اور اسے "دنیا کے نہایت شاندار خطہ" کے نام سے موسوم کیا۔ سائنس کے ہر ایک شعبہ کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اور علم طب میں جالینوس کی وفات کے بعد سے جس قدر اضافہ اندلس کے طبیبوں اور جراحوں نے کیا اتنا اس سے پیشتر کسی نے نہیں کیا تھا ابو القاسم گیارہویں صدی عیسوی کا مشہور جراح ہے۔ اور اس کے بعض ایجاد کردہ اعمال جراحی موجود طریقوں کے مطابق ہیں۔ ابن ظہر نے کچھ عرصہ بعد طب اور جراحی میں چند قابل یادگار اور نہایت اہم ایجادات دریافت کیں۔ ابن بیطار نے جو علم الاشجار کا بہت بڑا ماہر تھا۔ طبی پودوں کے حاصل کرنے کے لئے تمام مشرقی ممالک میں سفر کیا۔ اور ان کے متعلق ایک جامع کتاب لکھی اور فیلسوف ابن سینا نے اپنی کتابوں کے ذریعہ قدیم یونان اور یورپ کے عہد وسطی کے فلسفہ کو باہم مربوط کیا قرطبہ کے مدارس میں نہایت ذوق اور شوق سے علم ہیئت۔ جغرافیہ۔ کیمیا اور علم حیوانات پڑھایا جاتا تھا۔ باقی رہی علم ادب کی ترقی تو یورپ میں کبھی کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب کہ ہر ایک شخص منظوم گفتگو کرتا ہو جیسا کہ اس زمانہ میں ہر طبقہ کے افراد وہ عربی کی نظمیں تصنیف کرتے تھے جن کی سپانیہ۔ پراونس اور اٹلی کے گویئے اپنے اپنے راگوں میں نقل اتارتے تھے۔

"مصنوعات۔ علوم۔ اور تہذیب کے لحاظ سے اہل عرب کا آباد کیا ہوا شہر قرطبہ بلاشبہ دنیا کا سب میں عظیم الشان مرکز تھا"[1]

مذکورہ بالا اقتباسات میں نے صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کئے ہیں کہ ان دنوں میں آپ ہی کے ہم مذہبوں نے مختلف علوم وفنون سائنس اور علم ادب کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا آپ ان اقتباسات کے سننے سے بے چین ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر آپ مجھے ایک اور اقتباس پڑھنے کی اجازت دیں گے جو دراصل اسلامی حکومت کے تمام تعلیمی کارناموں کا خلاصہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ میری سمع خراشی کو نظر انداز کریں گے۔ اس اقتباس کو پیش کرنے کی مجھے نہ صرف اس لئے جرات ہوئی ہے کہ اس میں مسلمانوں کے کارناموں کو مختصر پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں

---

[1] S. L. Poole's Moors in Spain صفحات ۱۴۴ تا ۱۵۱ سنہ ۱۸۹۳ء

علوم وفنون اور علم ادب کو ترقی دینے کے لئے کیا کچھ کیا۔ یہ مسز بسینٹ کے ایک لیکچر "اسلام تخیلو ماتی کی روشنی میں" سے لیا گیا ہے۔ وھو ھذا :-

"بہ حیثیت مذہب کے اس پر اکثر ناجائز طور پر حملے کئے گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول مقبول (صلعم) کی بزرگی اور دنیا کو جو تعلیمات آپ نے دی ہیں اُن کی شرافت کو بالکل غلط پیرایہ میں سمجھا گیا ہے۔ بسا اوقات مغربی ممالک میں اسلام کے خلاف اس بنا پر حملے کئے جاتے ہیں کہ وہ سخت متعصب ہے اور مانع ترقی ہے۔ اس بنا پر کہ اسلام میں عورت کو وہ پوزیشن حاصل نہیں جو اسے ملنی چاہیئے تھی۔ اس بنا پر کہ وہ علم سائنس اور ذہنی طاقتوں کو نشو و نما دینے کے خلاف ہے یہ وہ تین اعتراض ہیں جو اہل مغرب عام طور پر اسلام پر کیا کرتے ہیں۔ میں اپنی تقریر کے آخر میں آپ کو یہ دکھاؤں گی کہ نہ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ان کی تکذیب کرتی ہے بلکہ اسلام نے جو وسیع خدمات دنیا کے لئے انجام دی ہیں۔ ان سے مذکورۂ بالا اعتراضات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے یہ سچ ہے کہ آج اسلام دنیا میں اعلیٰ علوم و فنون اور اعلیٰ ذہنی کوششوں کا مظہر نہیں رہا۔ مگر یہ اس کی تعلیم کا قصور نہیں۔ بلکہ اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح سے اسلام کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پیرو اس کے بانی کے اہل نہیں رہے۔

"...... حضرت رسالت پناہؐ امی تھے اور علم کا جو کچھ مفہوم دنیا سمجھتی ہے اس اعتبار سے وہ عالم نہ تھے۔ بار بار آپ اپنے تئیں "امی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے آپ کے پیرو قرآن مجید کو ایک دائمی معجزہ سمجھتے ہیں اور اسے آپ کے دعوۂ نبوت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ نہایت بلیغ عربی میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اگرچہ آپ امی تھے آپ نے سب چیزوں سے بڑھ کر حصول علم کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:-

"علم حاصل کرو اس لئے کہ جو اسے خدا کے لئے حاصل کرتا ہے۔ وہ نیکی کا کام کرتا ہے جو علم کے بارے میں بات چیت کرتا ہے۔ وہ گویا خدا تعالےٰ کی تعریف کرتا ہے جو اس کے حصول کے لئے سعی کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے جو علم کی اشاعت کرتا ہے۔ وہ گویا زکوٰۃ دیتا ہے۔ اور جو اس کا صحیح استعمال کرتا ہے وہ خدا کی پرستش کرتا ہے۔ علم نیکی و بدی میں تمیز کرنی سکھاتا ہے وہ خدا تک پہنچنے کے لئے روشنی کا کام دیتا ہے۔ وہ صحرا میں ہمارا رفیق ہے اور تنہائی میں ہمارا مونس ہے۔ وہ خوشی کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ اور مصیبت کے دنوں میں ہمت برقرار رکھتا ہے۔

دوستوں کی موجودگی میں وہ ہماری تزئین کا باعث ہے اور دشمنوں کے خلاف وہ ڈھال کا کام دیتا ہے۔ علم کے ذریعہ انسان نیکی کے اعلیٰ منازل تک پہنچ سکتا ہے اور دنیا میں اچھی پوزیشن حاصل کرسکتا ہے۔ اس دنیا میں عالم کو بادشاہوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے اور دوسری دنیا میں اسے خوشی اور امن ملتا ہے۔

"ایک اور موقع پر آنحضرؐ صلعم نے جن کی خاطر اتنے آدمیوں نے اپنی جانیں دی ہیں۔ کیا صحیح فرمایا ہے:-

عالم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہر قائم کردہ اسکول پر اس فقرے کو سنہری حرفوں میں لکھ کر لگا دیں اس لئے کہ فرزندان اسلام ہمیشہ سے خوشی خوشی شہادت حاصل کرنے کے لئے تو دوڑتے ہیں۔ لیکن گزشتہ چند صدیوں سے (اور واقعات جلد جلد بدل رہے ہیں۔) انھوں نے علماء کی بہت کم عزت روا رکھی ہے۔

حضرت علی رضؓ نے بھی علم کی نہایت اعلیٰ تعریف کی ہے:

"علم کا جوہر قلب کی روشنی ہے۔ سچائی اس کا بڑا مقصد ہے۔ الہام اس کا حقیقی رہنما ہے عقل اسے قبول کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ اس کا ملہم ہے اور انسانی الفاظ اسے ادا کرتے ہیں۔

"علم کی قدر و قیمت کے متعلق یہ وہ بلند خیالات ہیں جنھوں نے ایک طرف تو عربوں کے فلسفہ کی بنیاد ڈالی اور دوسری طرف موروں کو علوم و فنون کے حصول پر آمادہ کیا۔ جب اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مانع ترقی ہے۔ یہ کہ اس کے پیرو علمیت کے اعتبار سے دوسری اقوام سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تو اس وقت معترضین دبشرطیکہ وہ تاریخ کو نظرانداز نہ کردیں، کو چاہیئے کہ وہ اس پستی اور جمود کو جو چند صدیوں سے مسلمانوں پر طاری ہے۔ کسی اور سبب کا نتیجہ قرار دیں۔ اس لئے کہ وہ حضرت علیؓ ہی تھے جنھوں نے سید المرسلین کی قائم کردہ بنیاد پر علم کی عمارت تعمیر کی اور جنھوں نے باقاعدہ علم کی ترویج کی جو بالآخر عرب میں ایک سو سال تک خاموش ترقی کرنے کے بعد یکایک یورپ میں روشنی کی صورت میں جلوہ گر ہوا اور جس نے موروں کے ذریعہ اسپین میں آنے کے بعد عیسائی ممالک میں علم کا چرچا پھیلا دیا۔ اسلام ہی تھا جس نے جدید فلسفہ و افلاطونیہ ورثہ کو سنبھالا اور قاہرہ اور بغداد۔ مصر اور عرب کے کالجوں میں اس کا درس دیا حالاں کہ ہائی پیشیا کے قتل کے بعد عیسائی اسے رد کرچکے تھے اور اس کے مطالعہ کو کفر خیال کرتے تھے۔ مسلمانوں نے علم کی اس بیش بہا دولت کو بچایا اور بعد

میں یورپ کے استعمال کے لئے اسے دو ہمروں کے سپرد کر دیا۔ آں حضرت صلعم کے ارشادات کے مطابق علم کی قدر دانی ہی وہ شئے تھی جس نے آپ کے پیرووں کی ایک جماعت کو عرب میں علوم و فنون کے مطالعہ کا گرویدہ بنا دیا۔ اور دوسری جماعت کو فاتح تلوار کے ساتھ مشرق و مغرب میں روانہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے اسلام کی طاقت زبردست ہو گئی۔ ایک طرف طلبار فلسفہ اور سائنس کا نہایت سرگرمی سے مطالعہ کرتے تھے۔ اور دوسری طرف اس کے جاں باز رفتہ رفتہ اسے طاقتور بناتے جاتے تھے یہاں تک کہ فاتح تلوار کے سایہ میں علم کی روشنی جلوہ گر ہوتی گئی اور فاتح کے نقش قدم پر فلسفہ اور سائنس کا رواج ہوتا گیا۔ سب سے پہلے اسلام کی افواج افریقہ کے شمالی حصص میں لڑتی رہیں اور بالآخر اپنا علم نصب کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس کے بعد افریقہ سے اسپین میں گئیں اور وہاں جا کر عربوں کی حکومت کی بنیا ڈالی۔ یونیورسٹیاں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جہاں یورپ کے تمام حصص سے طلباء جوق جوق آتے تھے۔ اس لئے کہ عیسائی ممالک میں سائنس کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ علم ہئیت اور علم ریاضی مفقود ہو چکے تھے۔ اور کیمسٹری (علم کیمیا) مصری مقبرہ سے باہر نہیں نکلی تھی۔ فاتح عرب علم کو اپنے ساتھ ساتھ لائے اور پاپائے اعظم سلوسٹر ثانی نے بھی اپنی نوجوانی میں قرطبہ کی درس گاہ میں تعلیم پائی اور وہیں علم ہندسہ اور ریاضی کے ابتدائی اصول سیکھے اور یہ وہ بات تھی جس کی وجہ سے اس زمانہ کے جاہل پادری اُن کے خلاف ہو گئے تھے۔ میں نے کسی اور مقام پر اس مضمون کے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"مسلمان ہندوؤں اور یونانیوں سے علم حساب لیتے ہیں وہ جبر و مقابلہ میں دوسرے درجہ کی مساوات معلوم کرتے ہیں۔ پر اس کے بعد کو آڈریٹک مساوات بھی دریافت کر لیتے ہیں۔ پھر بائی نومیل تھیورم معلوم کرتے ہیں۔ وہ علم المساحت میں سائن اور کوسائن کو بھی معلوم کرتے ہیں وہ پہلی دوربین ایجاد کرتے ہیں۔ وہ ستاروں اور سیاروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ زمین کی جسامت کو ناپتے ہیں۔ وہ جدید قسم کا فن تعمیر نکالتے ہیں۔ وہ علم موسیقی میں ایجاد کرتے ہیں۔ وہ سائنٹفک طریقہ سے کاشت کرتے ہیں۔ اور مصنوعات کو خوب صورتی کی انتہا تک پہنچا دیتے ہیں۔"

یہ سب باتیں صرف یورپ ہی میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کی بنائی ہوئی بعض نہایت شان دار عمارتیں ابھی تک موجود ہیں اور جن کے بہ نسبت بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ وہ

دیووں کی طرح عمارت بناتے تھے اور جوہریوں کی طرح نفیس و پاکیزہ کام کرتے تھے۔

بعض نہایت حیرت انگیز عمارتیں مسلمانوں کی یادگار باقی رہ گئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے وجود نے ہندوستان کو زیادہ مالدار بنا دیا ہے۔ اور یہ سب خزانے ہندوستان کی گود میں اس کے مسلمان فرزند لائے تھے۔ ان کی صنعت کا اثر ہندوؤں کے فن عمارت پر بھی پڑے بغیر نہ رہا اس لئے کہ کوئی فن کسی خاص مذہب یا نسل کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ انھی صدیوں میں اسلام نے فلسفہ مابعد الطبیعیات کے بعض نہایت قابل حکماء اور ماہر پیدا کئے جو دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے"

اگر اُس زمانہ میں اسلام نے "بعض ایسے قابل ترین حکماء اور ماہر پیدا کئے جو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے" تو پھر اس کی کوئی وجہ نہیں دکھائی دیتی کہ آج کل کے مسلمان بھی علوم و فنون سائنس اور علم ادب میں ویسی ہی حوصلہ مندی نہ دکھا سکیں اور اسی اعلیٰ بلندی پر نہ پہنچ جائیں جو ان کے بزرگوں نے ظاہر کی تھی جس بات کی اب ضرورت ہے وہ عزم بالجزم اور سخت محنت و مشقت ہے۔ ان تاریخی واقعات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا بالکل لاطائل ہے کہ اسلام علوم کی ترقی کا حامی نہیں ہے۔ حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے فصیح و بلیغ الفاظ جنھیں اوپر نقل کیا گیا ہے ہمارے لئے مزید ترقی کا باعث ہونے چاہئیں جیسا کہ وہ قدیم مسلمانوں کے لئے تھے جنھوں نے صدیوں تک علم کی شمع کو فروزاں رکھا ایسے مذہب کے متعلق ایک منٹ کے لئے خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تعلیم کی راہ میں مانع ہو سکتا ہے۔ بعض قادُزبیوں نے اپنے مفاد کی خاطر تعلیم کو نقصان پہنچانے کے جو کوششیں کی ہیں انھیں مذکورۂ بالا واقعات کی روشنی میں اپنی کشمکش سے باز رہنا چاہیئے۔ کیا یہ امید کرنا ضرورت سے زیادہ ہے کہ ہر شخص کو اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو جہالت کے بجائے تعلیمی آب و ہوا میں نشو و نما دے اور انھیں تعلیم یافتہ شہری بنائے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن جہالت ہے اور ہر شخص کے دل میں ہمارے برگزیدہ پیغمبر صلعم کے حسب ذیل الفاظ سے ایک خاص جوش پیدا ہو جانا چاہیئے۔ "جو شخص علم کے متعلق گفتگو کرتا ہے وہ گویا خدا کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ جو علم کے حاصل کرنے کی جستجو کرتا ہے وہ خدا کی تعریف کرتا ہے جو علم کی اشاعت کرتا ہے وہ خیرات دیتا ہے اور جو اس کا صحیح استعمال کرتا ہے وہ رب اکبر کی پرستش کرتا ہے۔"

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ

اگر دلیل مزید کی ضرورت ہو تو وہ اس واقعہ سے مل سکتی ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں ہزارہا انگریزی داں مسلمان ایسے موجود ہیں جن میں سے اکثر تلاش علم میں کئی سال تک انگلستان میں رہ چکے ہیں اور جو ابھی تک ایسے ہی خوش اعتقاد ہیں جیسے کہ ہم ہیں سے

بعض پکے مسلمان۔ کیا عملی تجربہ اس ادعا کے غلط ہونے کا کافی وشافی جواب نہیں ہے کہ غیر زبانوں کا مطالعہ مسلمانوں کو جادۂ مذہب سے گمراہ کر دیتا ہے! میں نہیں جانتا کہ آیا جو لوگ کمال متانت و سنجیدگی سے اس مسئلہ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ محسوس بھی کرتے ہیں یا نہیں کہ وہ ایسا کہنے سے اسلام کو در پردہ کس قدر نقصان پہنچا رہے ہیں: وہ اپنے اس طرز عمل سے دوسری اقوام میں یہ احساس پیدا کر رہے ہیں کہ اسلام ایسا تنزل پذیر مذہب ہے اور اس کا اثر اس قدر سطحی کہ یوں ہی اس کے پیرو موجودہ زمانہ کی روشنی سے متاثر ہوتے ہیں وہ اپنے مذہب سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اسلام کو دوسرے مذاہب کے نام لیواؤں کے غلط الزامات سے بہت کچھ صدمہ پہنچا ہے۔ اور اسی حالات میں اسے یہ امید تھی کہ خود اس کے دلدادگان ایک زندہ اور روشن مذہب کی حیثیت سے اس کے محاسن اور اس کی خوبیوں کی قدر کریں گے جو شخص بھی اس کی اصلی خوبی سے واقف ہو وہ فوراً یہ یقین کر سکتا ہے کہ ہمارے نبی کریم صلعم کی تعلیم کس قدر اعلیٰ اور پاکیزہ ہے۔ یہ یقین کرنا بھی لغو ہے کہ جس کسی مسلمان نے اپنے مذہب کا مطالعہ کیا ہے کبھی وہ اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے پیرو مستقل مزاج ہوتے ہیں اور وہ زندگی بھر جادۂ وفاکیشی پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ اگر اب بھی بعض حلقوں میں اس مسئلہ کے متعلق شکوک باقی رہ گئے ہیں تو میں درخواست کروں گا کہ وہ اس پوائنٹ کے بارے میں پوری طور پر مطالعہ کریں اور شکوک کے باطل اثرات کو دل سے نکال دیں اور تعلیم اور روشنی پھیلانے کے مقدس کام کو نہایت استقلال اور سنجیدگی سے شروع کر دیں اگر ہم سب اس اعلیٰ مشن کی اسپرٹ پر عمل درآمد شروع کر دیں تو یہ کہ صرف تعلیمی پستی کا دھبہ دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ اسلام کے مقصد کو بھی فائدہ پہنچائیں گے اور اس درجہ کے اہل ہو سکیں گے جس کا آں حضرت صلعم نے مندرجہ بالا الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

اعداد دربارۂ تعلیم آپ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ جو کام ہمارے سامنے درپیش ہے وہ کس قدر عظیم الشان ہے۔ اس سے پیشتر کہ ہم جہالت کو کھلے طور پر زائل کرنے کے مقصد میں کامیاب ہوں۔ میں مسلمانوں میں تعلیم کی موجودہ حالت کا نقشہ آپ کے روبرو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اب اس امر پر افسوس کرنا کہ ہم پہلے یہ تھے اور ہم کو کیا بننا چاہیئے تھا فضول ہے۔

مسلمان تاریخ عالم میں مختلف علوم و فنون کے شعبوں میں نمایاں کارناموں کے ذریعہ ایک سنہری ورق چھپاں کر چکے ہیں اور میں علوم و فنون سائنس اور علم ادب کی ترقی کے ضمن میں دکھا چکا ہوں کہ ماضی میں مسلمانوں کے کارنامے کیسے عظیم الشان تھے۔ اب بھی کوئی قوت مانع نہیں ہے بشرطیکہ ہم میں

اسی بلندی پر پہونچنے کا عزم بالجزم ہو۔ موجودہ صورت حالات مقابلۃً نہایت افسوسناک ہے۔ اور اس لئے ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ ہم اس کی مدافعت کے موثر اور قاطع علاج دریافت کریں۔ یہ کہ ہماری تعلیمی پستی کس قدر افسوسناک ہے حسب ذیل اعداد سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ ۸۷-۱۸۸۶ء میں سے لے کر اب تک ہر پانچ سال کے اعداد و شمار میں نے جمع کئے ہیں اور ۸۷-۱۸۸۶ء وہ سال ہے جب کہ ہماری کانفرنس معرض وجود میں آئی تھی۔ میں نے یہ اعداد اس لئے منتخب کئے ہیں کہ اس سے اچھی طرح سے پتہ لگ جائے گا کہ ہم نے کہاں تک ترقی کی ہے اور کیا کرنا باقی رہ گیا ہے۔

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم کو اگر ہم پہلے لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۸۷-۱۸۸۶ء میں ابتدائی مدارس میں مسلمان طلباء کی مجموعی تعداد ۴۹۵۶۸۰ تھی اور کل طلباء ۲۳۸۱۲۱۷ تھے یعنی مسلمان ۲۱ فی صدی تھے۔ تعداد ۱۷-۱۹۱۶ء میں ۱۳۰۹۸۴۵ تک پہنچ گئی ہے۔ اور تمام طلباء ۵۸۱۸۷۳۰ ہیں۔ اگرچہ مسلمان طلباء کی تعداد میں اضافہ بڑھ کر ہوا ہے لیکن ان کی تعداد فی صد کچھ ہی زیادہ یعنی ۲۲ فی صد ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل اسلام نے تیس سال کے عرصہ میں فقط اپنی پوزیشن قائم رکھی ہے اور جو اضافہ ہوا ہے وہ نسبتاً اسی قدر رہے جو اور قوم کے افراد نے اپنے تئیں حاصل کیا ہے۔ لیکن اگر یہ اعداد اس لحاظ سے دیکھے جائیں کہ مسلمان طلباء کی نسبت کل تعداد طلباء سے وہی ہے جو مسلمانوں کی کل آبادی کی دیگر اقوام کی تعداد سے ہے تو نتیجۃً تسکین بخش ہے۔ برٹش ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۶ کروڑ ہے اور اگر اسکول میں جانے کے قابل بچوں کی تعداد ۱۵ فی صدی ہو جیسا کہ شمار کی گئی ہے تو اسکول کے جانے والے بچوں کی مجموعی میزان ۹۰ لاکھ ہونی چاہیئے۔ اس میں سے فقط ۱۳۱۰۰۰۰ لڑکے برٹش ہندوستان کے ابتدائی مدارس میں پڑھتے ہیں اور باقی ۷۶۹۰۰۰۰ بچے ایسے رہ جاتے ہیں جو جہالت میں نشو و نما پاتے اور تعلیمی سایہ سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ میں اب آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ غریب بچے بڑے ہوئے پر کس قسم کے مسلمان بنیں گے۔ جو اپنی مادری زبان کی الف۔ بے تے سے بھی واقف نہیں۔ اسکول جانے والے بچوں میں سے فقط ۱۵ فی صد بچے اپنی مادری زبان میں پڑھے لکھے ہوں گے اور ۸۵ فی صدی محض جہالت میں نشو و نما پائیں گے۔ میں معترف ہوں کہ مسلمانوں کے والدین اس صورت حالات کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس ملک میں پرائمری مدارس کی تعداد بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ جو والدین اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم دینا چاہتے ہیں اُن کو حصول مقصد کے لئے سہولت میسر نہیں آتی یہ مسلم امر ہے کہ تمام شائقین ابتدائی تعلیم کے حصول مدعا کے لئے مدارس کی تعداد میں اضافہ

کرنا پڑے گا۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ جناب ہارڈولنگڈن کے عہد حکومت میں یکم اگست ۱۹۱۸ء کو من جانب گورنمنٹ ہیں نے حسب ذیل اعلان دربارہ ابتدائی تعلیم کیا تھا۔

"...... ڈسٹرکٹ لوکل بورڈ کی صورت میں بہت کچھ ترقی کی ضرورت ہے اور گورنمنٹ کا منشاء ہے .... کہ آنریبل مسٹر اسپانی کی قرارداد قبول کرے جس میں سرکار سے استدعا کی گئی ہے کہ ہر ایک گاؤں میں جس کی آبادی ایک ہزار یا اس سے زیادہ ہو حتی المقدور ایک ابتدائی مدرسہ کھولا جائے۔ یہ اول قدم ہے جو گورنمنٹ دیہاتی مقامات میں ابتدائی تعلیم کی ترویج کی خاطر لینا چاہتی ہے ...... جس وقت تمام دیہات میں جن کی آبادی ایک ہزار یا اس سے زیادہ ہے مدارس قائم ہو چکیں گے تو سرکار دوسرا قدم اٹھانے کی کوشش کرے گی تاکہ ان دیہات میں بھی جن کی آبادی پانسو نفوس یا زائد ہو ایک ایک ابتدائی درس گاہ بنائے۔ ایسے دیہات جن کی آبادی ایک ہزار یا اس سے زائد ہو کل ایک ہزار ایک سو چار ہیں اور جہاں تا حال مدارس موجود نہیں ہیں اور ایسے دیہات جن کی آبادی ایک ہزار اور پانسو نفوس کے درمیان ہے اور جہاں مدارس نہیں ہیں تین ہزار چار سو ہے۔ آنریبل مسٹر اسپانی کے رزولیوشن پر عمل درآمد کرنے کے بعد دوسرا قدم ان ۳۴۰۰ دیہات میں کم از کم ایک ایک ابتدائی مدرسہ بنانے کے واسطے اٹھایا جائے گا۔ گورنمنٹ کا منشا یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد اور کچھ نہ کریں۔ جائے رہائش ساز و سامان اور ضروری بندوبست استادوں کے ٹرین کرنے کے لئے خاطر خواہ طور پر مہیا کرنے کے بعد جس پر گورنمنٹ غور کر رہی ہے گورنمنٹ کا ارادہ یہ ہے کہ مدارس کی تعداد میں متواتر اضافہ کیا کرے میرا مقصد یہ ہے کہ میں کھلے الفاظ میں اس امر کو بیان کر دوں گا کہ گورنمنٹ اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ ہر ایک گاؤں میں جہاں کافی تعداد طلبہ کی جمع ہو سکے ایک ایک اسکول کھول دے۔"

ظاہر ہے کہ اس صوبہ کی گورنمنٹ ابتدائی تعلیم کے لئے وسیع پیمانہ پر سہولتیں بہم پہونچانے کا ارادہ کر چکی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ابتدائی تعلیم کے مسئلہ پر کشور ہند کے تمام صوبجات میں غور کیا جا رہا ہے اور یہ مصیبت کہ بعض والدین کافی سرمایہ مہیا نہیں کر سکتے۔ اور اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم نہیں دے سکتے۔ تھوڑے عرصہ میں گئی گزری بات ہو جاوے گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ مسلمان بچوں کے والدین اُن مزید سہولتوں سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے اور اس کو بخوبی یاد رکھیں گے کہ اپنے بچوں کو کم سے کم مادری زبان کی تعلیم دلانا ان کا فرض ہے۔

ثانوی تعلیم

اب ہم ثانوی تعلیم سے بحث کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس صیغہ میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ ۹۷-۱۸۹۶ء میں ثانوی مدارس میں ۵۸۶۴۴ مسلمان لڑکے پڑھتے تھے اور ۱۷-۱۹۱۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۷۲۳۹۲ تک پہنچ گئی ہے۔ ان اعداد سے بھی ترقی کا پتہ چلتا ہے مگر مجموعی مردم شماری کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بہت ہی کم ہے میں ثانوی مدارس میں حاضر ہونے والے مسلمان طلبا اور ایسے مدارس میں جانے والی عمر کے مسلم طلباء کے باہمی وسیع فرق کو دکھانا نہیں چاہتا اس لئے کہ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ثانوی تعلیم پانے کے قابل ہر مسلمان لڑکا اسکول میں داخل ہی ہو۔ اسی طرح اس امر کی بھی توقع کی جا سکتی کہ ہر مسلمان انگریزی میں لکھ پڑھ ہی سکتا ہو۔ اس لئے اچھی قسم کا تقابل یہ ہے کہ مسلمان طلباء کا مقابلہ دوسری ہمسایہ قوموں کے طلباء کے ساتھ کیا جائے۔ ۱۷-۱۹۱۶ء میں ثانوی اسکولوں میں تمام قوموں کے طلباء کی مجموعی میزان ۱۱۸۶۳۳۵ تھی۔ اگر آبادی کی بنا پر ۲۰ فی صدی مسلمانوں کی تعداد سمجھی جائے تو ثانوی مدارس کے مسلمان طلباء کی مجموعی تعداد ۲۳۷،۲۶۰ ہونی چاہیئے۔ دراں حالیکہ اصلی تعداد صرف ۱۷۲۳۹۲ ہے یعنی اصلی تعداد کی ۷۰ فی صدی۔ اصل فرق اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ اس لئے کہ مجموعی آبادی جس کی بناء پر ۱۱۸۶۳۳۵ کا شمار کیا گیا ہے۔ اچھوت ذاتوں پر بھی مشتمل ہے۔ جو ہند میں آباد ہیں اور جن کی محض ایک برائے نام تعداد ثانوی اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہے۔ اس لئے ثانوی مدارس میں مسلمانوں کی تعداد اور دوسری اقوام کے طلباء کی تعداد کا باہمی فرق اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ ان اعداد سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ثانوی تعلیم کی صورت میں کس قدر کمی پوری کرنی ہے۔ تاکہ اپنی ہمسایہ اقوام کے دوش بدوش ہو جائیں۔

اعلیٰ تعلیم

جب کالج کی تعلیم کے بارے میں اعداد و شمار دیکھے جاتے ہیں تو یہ فرق اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ ۹۷-۱۸۹۶ء میں ہندوستان کے تمام آرٹس کالجوں میں مسلمان طلباء کے مجموعی تعداد فقط ۳۳۰۸ تھی اور ۱۷-۱۹۱۶ء میں اس میں ایک قابل ذکر اضافہ ہوا ہے اور تعداد بڑھ کر ۴۹۲۱ تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں پر میں پھر یہی کہوں گا کہ ترقی خاصی کر لی گئی ہے اور پوچھوں گا کہ کیا دوسری اقوام کی ترقی سے اسے کچھ نسبت ہو سکتی ہے؟ ۹۷-۱۸۹۶ء میں آرٹس کالجوں میں طلباء کی مجموعی تعداد ۸۰۶۰ تھی جو ۱۷-۱۹۱۶ء میں ۴۷۱۳۵ تک پہنچ گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں مجموعی تعداد میں ۳۹۰۰۰ طلباء کا اضافہ ہوا ہے۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد میں فقط ۴،۶۰۰ کی بیشی ہوئی ہے۔ تعلیمی پستی کا دھبہ مٹانے کے لئے صرف اتنا ہی ضروری نہیں کہ جتنے زیادہ

طلباء ہمسایہ قومیں کالجوں میں تعلیم پانے کے لئے بھیج رہی ہیں۔ ہم بھی اسی نسبت سے زیادہ مسلمان طلباء بھیجیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں طالب علموں کو کالجوں میں بھیجنا چاہیئے تاکہ قدیمی کمی پوری ہوسکے۔ اگر اعداد اسی معیار کے مطابق جانچے جائیں تو حسب ذیل نتیجہ نکلے گا۔ ۱۸۸۶-۸۷ء میں اسی ۲۰ فی صدی تعداد کے مطابق کالجوں میں ۱۶۰۰ مسلم طالب علم ہونے چاہیئے تھے حالاں کہ ان کی تعداد تقریباً ۳۵۰ تھی یعنی اس وقت ۱۲۵۰ طلباء کی کمی تھی ۱۹۱۷-۱۸ء میں تمام طبقوں کے طلباء کی مجموعی تعداد (جیسی کہ بیان کی جا چکی ہے) ۴۷۱۳۵ تھی۔ یہاں بھی ۲۰ فی صدی آبادی کے اصول کے مطابق ۹۴۲۷ طلباء ہونے چاہیئے تھے۔ حالاں کہ موجودہ تعداد صرف ۴۹۲۱ ہے یعنی ۴۵۰۰ طلباء کی اب بھی کمی باقی رہ گئی۔ اعداد فی صدی کے مطابق مسلمان طلباء میں خفیف سی ترقی ہوئی ہے۔ لیکن باہمی فرق پر بھی بہت زیادہ ہے اور چوں کہ اچھوت ذاتوں کی کروڑہا آبادی میں سے خال خال نوجوان آرٹس کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس لئے یہ تفاوت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ ہماری کمیونٹی کو نہ صرف ۴۵۰۰ کی کمی پوری کرنی ہے بلکہ مزید فرق کو بھی پورا کرنا ہے جو اچھوت ذاتوں کے میدان میں نہ آنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ نیز اس مقام پر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حصول تعلیم میں ہماری ہمسایہ اقوام ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ گئیں۔ جو اعداد کہ دیئے جا چکے ہیں ان سے ان کے مستقل اور بتدریج ترقی کا پتہ لگ سکتا ہے جو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں وہ برابر حاصل کر رہی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو نہ صرف فرق پورا کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کرنی پڑے گی بلکہ نسبتہً زیادہ طلباء بھی بھیجنے پڑیں گے۔ تاکہ دونوں شعبوں میں ایک معقول عرصے کے اندر حسب دل خواہ ترقی ہو سکے

تعلیمی بیداری

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری کمیونٹی فی الحقیقت اس کمی کو پورا کرنے کی سنجیدگی سے کوشش کر رہی ہے اور بعض شعبوں میں حتی الامکان جلد سے جلد ترقی کرنے کی سخت جدوجہد کی جا رہی ہے۔ بےشمار حلقوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ہم میں سے بعض بہترین اشخاص نے جو تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرنی شروع کر دی ہے وہ مستقبل کے لئے اچھی علامت ہے۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس بتدریج اپنے مشن کو پورا کر رہی ہے جو اس نے تیس سال قبل اپنے ذمہ لیا تھا اور ہندوستان کے مختلف اقطاع سے اتنے قابل اور ماہر تعلیم اشخاص کی موجودگی موجودہ اجلاس کانفرنس کی کامیابی کا پورا ثبوت ہے اور اس سے آئندہ ترقی کی بھی امید بندھتی ہے۔ اس لئے یہ بالکل مناسب موقعہ

ہے کہ ہم آپس میں ان تجاویز پر غور کریں جو ہمارے جائز مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔ تاکہ مسلمان تعلیم اور تہذیب کے لحاظ سے زیادہ بلند ہوں اور ملک کی پبلک لائف میں اپنی جائز پوزیشن حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں۔

کسی قوم یا ملت نے صرف گزشتہ عروج کے افتخار سے دوبارہ کمال حاصل نہیں کیا ہے۔ ہماری قوم نے مصنوعات امن میں بہت بڑی ترقی کی اور صدیوں تک معراج کمال ان کے تصرف میں تھا۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے کہ زمانہ حاضرہ کے اہل اسلام اپنا مستقبل ایسا ہی شاندار بنانے سے قاصر رہیں۔ عظیم الشان ماضی ہمارے دل شکستہ نہیں کرسکتی بلکہ اس کو ہماری ہمت افزوں کرنا چاہیئے۔ اگر زمانہ حاضرہ کے مسلمان اپنے مذہب اور گزشتہ عروج سے سبق لیں اور قوم کی اعلیٰ ترقی کے لئے سعی عازمانہ کریں تو یقیناً وہ راستہ ہموار کرسکیں گے۔ اور متاخرین کے اجتہاد کے واسطے عمدہ نظیر چھوڑ جائیں گے تاکہ وہ اصل مقصد حاصل کرسکیں۔ زمانہ موافق نظر آرہا ہے۔ عرصۂ دراز تک امن کے قیام کے آثار نمایاں ہیں۔ مسلمانان ہند حقیقتاً خواب سے بیدار ہوکر مشغول جد و جہد ہیں۔ علی گڑھ میں قیام مسلم یونیورسٹی کی تحریک نے ایک موقع پر بہت بڑا جوش پیدا کیا تھا اور متعدد انقلابات کے بعد یہ خبر سن کر مجھے نہایت خوشی ہوئی ہے کہ یہ مسئلہ ایک مستقل درجہ تک پہنچ گیا ہے اور یونیورسٹی کے قیام کی غرض سے عنقریب قانون وضع ہونے والا ہے۔ مجوزہ یونیورسٹی تعلیم و تحقیق کا وسیع میدان شائقین کے لئے بہم پہنچائے گی۔ اور بہی خواہان قوم کے واسطے سب قسم کی سہولتیں مہیا کرے گی۔ اس دوربین اور وطن پرست کا منصوبہ جس نے اپنی زندگی قوم میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے وقف کردی تھی یعنی سرسید احمد خاں کی مراد آج بر آنے والی ہے۔ ہز اگزالٹیڈ ہائینس حضور نظام والیٔ دکن نے جو علم کے بڑے مربی ہیں ایک یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم کی ہے۔ تمام کشور ہند میں اور کالجوں اور اسکولوں کے بنانے کی تحریک جاری ہے۔ یہ تمام آثار حقیقی ترقی کے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری قوم کے افراد ان سہولتوں سے کیا فائدہ اٹھائیں گے۔

مذہبی تعلیم

مسلمان بچوں کے والدین اپنی اولاد کی مذہبی تعلیم کو بجا طور پر اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف اقوام کو مذہبی تعلیم کا اپنے آپ بندوبست کرنا ہوگا۔ یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی ہے کہ گورنمنٹ عام سرکاری مدرسوں میں اس قسم کی تعلیم کا بندوبست کرے۔ بعض مقامات میں قرآن کریم کی تعلیم کا انتظام اس غرض سے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کے دلوں میں ابتدائی تعلیم کی رغبت پیدا ہو۔ اس رعایت کے ہم عین مشکور ہیں۔

اور ہم کو معلوم ہے کہ اس کی وجہ سے ابتدائی مدارس کے مسلمان طلباء کی تعداد میں اضافہ بھی ہوا ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ رعایت مذکور کسی طرح سے کافی نہیں ہے۔ ان بچوں کے والدین اس امر کے قطعاً خواہاں ہیں کہ ان کی اولاد اصول مذہب سے پورے طور پر واقف ہو۔ اس وضع کی تعلیم گھروں میں یا مسلمانوں کے خاص معابد میں دی جاسکتی ہے۔ دوبارہ عرض ہے کہ سرکاری مدارس جن کی آبیاری خزانہ عامرہ سے ہوتی ہے مذہبی تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ لازم ہو کہ متعدد مسلم ہائی اسکول اور کالج قطرِ ہند میں قایم کئے جائیں۔ قوم میں جو اشتیاق اصلی تعلیم کا علی گڑھ کالج نے پھیلایا ہے وہ اسی قسم کے اور معابد قایم کرنے والوں کے لئے ہمت افزا ہے۔ ہم سب کو سلطانیہ کالج کے قیام کی تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنے طویل عہدِ حکومت میں مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کی ہمیشہ تائید کی ہے اور یہ عین مناسب ہے کہ یہ کالج آپ کے محترم اسم سے نامزد ہو۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تجویز مذکور جلد معرض شہود میں آئے اور علی گڑھ ثانی کی ملک کے ایک اور حصہ میں مضبوط بنیاد پڑ جائے۔ صوبہ بمبئی کے مسلمانوں نے ترویج تعلیم کے لئے روپیہ فراہم کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ ہم سب کو ہز ہائینس سر آغا خاں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپ کی تحریک دربارہ قیام علی گڑھ یونیورسٹی اس قدر ثمر ور ثابت ہوئی کہ اس صوبہ سے ایک گران بہا رقم دستیاب ہوئی۔ آپ سب کو علم ہے کہ سر محمد یوسف صاحب نے آٹھ لاکھ روپیہ کی کثیر رقم اس احاطہ میں ایک مسلم کالج بنانے کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ آپ کی توجہ اس امر کی جانب بھی مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ سر فاضل بھائی کریم بھائی نے تین لاکھ روپیہ کی بڑی رقم ایک ہائی اسکول پونہ میں منعقد کرنے کے لئے دی ہے۔ بعض اور طریقوں سے تعلیم کی ترویج جاری ہے لیکن ان کا ذکر اس موقع پر بے سود ہے۔ فقط اس قدر عرض کرنا کفایت کرے گا کہ تعلیم کے بارے میں وہ بیداری جس کا تذکرہ پیشتر کر چکا ہوں قوت سے عمل میں مبدل ہو چلی ہے اور روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ یہ امید بے جا نہیں ہے کہ وہ کمی جو اعداد و شمار سے ظاہر ہے اس وسیع بیداری کے طفیل پوری ہو جائے گی۔ اور کہ اہل اسلام نہ صرف تعلیمی پس ماندگی کے دھبہ کو اپنے دامن سے دور کر سکیں گے بلکہ تمام تعلیمی امور میں علم بردار نظر آنے لگیں گے۔

ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے مسئلہ پر جو کچھ میں نے غور کیا ہے اس نے مجھے جتا دیا ہے کہ مسلمانانِ ہند کس قدر اقتصادی پستی میں گرفتار ہیں۔ ہماری قوم میں بہتیرے شوقین طلباء ہیں جو بصد اشتیاق مدریس جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ناداری کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ مجھے کامل اعتماد ہے

کہ اگر قابل طلباء کی مالی امداد کے واسطے ایک اسکیم مرتب کی جائے اور وظائف کی صورت میں یہ امداد معقول طریقہ سے دی جائے تو قوم کی تعلیمی حالت بہت کچھ سدھر سکتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چندہ جمع کرنا کس قدر مشکل ہے۔ آپ صاحبان کو معلوم ہے کہ ہم سب کو کیا کیا ضروریات بہم پہنچانا لازم ہے اور اگرچہ فیاض اشخاص نیک کاموں کے لئے ہمیشہ روپیہ دینے کو تیار پائے گئے ہیں تاہم ممکن ہے کہ کافی سرمایہ جمع نہ ہو سکے۔ ہمیں ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ ہر ایک صوبہ میں بہتیرے اوقاف ہیں جن کی کثیر آمدنی ہے۔ جب میں نے اس صوبہ میں اوقاف کی نسبت قانون وضع کرنے کی تحریک شروع کی تھی تو مجھے تحقیق خبر معلوم ہوئی تھی کہ صرف شہر بمبئی میں مسلمانوں کے اوقاف کی سالانہ آمدنی دو کروڑ روپیہ سے زائد ہے۔ اور اس کا کثیر حصہ بیکار پڑا رہتا ہے۔ بفرض اگر یہ اعداد مبالغہ آمیز ہیں۔ پھر بھی ان سے عیاں ہے کہ اوقاف کی آمدنی کا کس قدر روپیہ تمام سرزمین ہند میں موجود ہے اور اگر اس کا قلیل حصہ بھی قوم کی تعلیمی ترقی میں خرچ کیا جائے تو بہت سی مالی رکاوٹیں فوراً غائب ہو جائیں گی ہمارے مذہب کی رو سے تعلیم سے زیادہ اور کون سا عمل ثواب کا مستحق ہے؟ اور کون چیز اوقاف کی آمد سے مسلمانوں کی تعلیم سے زیادہ حق دار ہے؟ یقیناً درسگاہیں بنانا اور جاری رکھنا اور مسلمانوں کو حصول تعلیم میں مدد دینا خواہ دینی تعلیم ہو یا دنیوی۔ بموجب حدیث مصطفوی صدقۂ اولیٰ ہے۔ اور بہترین عبادت باری تعالےٰ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک انجمن اس غرض سے قایم کی جائے کہ امناء اوقاف سے التماس کرے اور ان کو اگر تمام آمدنی نہیں تو کم از کم اس کے ایک حصہ کو مسلمانان ہند کی تعلیم کے صیغے میں خرچ کرنے کے لئے آمادہ کرے۔ اگر اس بارہ میں تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل ہو گئی تو مسلمانوں کی راہ تعلیم سے ایک سد عظیم کسی قدر دور ہو سکیگی۔

ٹاٹا کے وظائف

وظائف کے زمرہ میں آپ کی توجہ اس اسکیم کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں جس کی بابت چند سال ہوئے کہ ہز ہائینس سر آغا خان اور اور احباب سے میں نے تذکرہ کیا تھا۔ کسی قوم کی پستی دور کرنے کے واسطے ایثار اور خدمت کی سچی اسپرٹ ہونا فرد بشر میں لازم ہے اور اس کو ہر طرح سے اُبھارنا ضروری ہے۔ تاہم ہم کو انسانی فطرت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اکثر طلباء ان پیشوں کو پسند کرتے ہیں جن میں آمدنی زیادہ ہے۔ اس لئے قرین مصلحت ہے کہ ایک ایسی تجویز اختراع کی جاوے جس میں دونوں خوبیاں ہوں۔ یعنی قوم کی اعلیٰ خدمت اور عاملوں کے لئے معقول معاوضہ۔ میری رائے میں ٹاٹا کی اسکیم جو اعلیٰ تعلیم کے وظائف سے تعلق رکھتی ہے ان دونوں فوائد سے مملو ہے۔ مجھے علم نہیں کہ آپ صاحبان میں سے

اکثر اُن اصول سے واقف ہیں جن پر یہ اسکیم مبنی ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نمایاں خط و خال کا اس موقع پر ذکر کروں۔ مسٹر جمشید جی ٹاٹا نے جو عالی دماغ شخص تھا ایک اسکیم مرتب کی تاکہ ہونہار نوجوان تکمیل تعلیم کے لئے یورپ جایا کریں اور مختلف پیشوں اور پبلک میں اعلیٰ عہدوں کی قابلیت حاصل کریں۔ اس غرض سے اس نے بہت بڑی رقم علٰحدہ جمع کی اور اُس کے امین منجملہ دیگر اصحاب کے اس صوبہ کے صیغۂ تعلیم کے سربر آوردگان کو مقرر کیا۔ امنائے وقف کا فرض ہے کہ تمام گریجوئیٹوں کی عرائض جانچیں جو اُن صیغوں میں ملازمت کرنے کے خواہاں ہیں جن کی بھرتی انگلستان میں ہوتی ہے یا کسی علمی کاروبار میں مشغول ہونا چاہتے ہیں۔ چوں کہ انتخاب کرنے کے لئے تعداد بہت قلیل ہے اس لئے قابل ترین گریجوئیٹ منتخب کئے جاتے ہیں اور ان کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ انگلستان بھیجنے سے پہلے ان کا قرار واقعی طبی معائنہ ہوتا ہے۔ وظیفہ کی مقدار معقول ان کی ضروریات کے لئے کافی ہے اور یہ تعلیم کا خرچ ان کو قلیل شرح سود پر قرض دیا جاتا ہے۔ انگلستان میں ٹاٹا کے وظائف پانے والوں کی نگرانی کے لئے ناظر مقرر ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ان کی تعلیمی ترقی کی نسبت خبر بھیجتے رہتے ہیں اور ان کو روپیہ بھی وہی ادا کرتے ہیں۔ ان تین سالوں کی تعلیم کا خرچ (اور اس قدر قیام انگلستان قابلیت حاصل کرنے کے لئے لازم ہے) بمعہ خرچ آمد و رفت وقف کی آمدنی سے ادا کیا جاتا ہے اور ان کو بطور قرض دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں واپس آنے کے بعد اور روپیہ کمانے پر اصل رقم بمعہ سود بحساب تخمیناً چار روپیہ فی صد معقول اقساط میں واپس کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ قانون کی رو سے روپیہ کی ادائگی جائز رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن منشا یہ نہیں ہے کہ مقروض پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہ بات اس پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ عزت نفس کا لحاظ کرے گا۔ اور جب ممکن ہوگا روپیہ معقول اقساط میں ادا کر دے گا۔ اس پر کوئی جبر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کی ہر طرح پر امداد کی جاتی ہے کہ اگر اس نے کوئی اس طرح کی لائن پسند کی ہے تو وہ اپنے علمی پیشے میں نام حاصل کرے اور مستحکم ہو جائے۔ یہ پالیسی اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ وہ طالب علم جس نے فنڈ مذکور کی وساطت سے تعلیم اور اعلےٰ قابلیت حاصل کی ہے نہ صرف قرض ادا کرنے کے لئے طیار ہوگا بلکہ فنڈ کی مزید امداد کرے گا جس نے اس کی اس درجہ دستگیری کی ہے۔ اسکیم مذکور عرصہ سے اجرا پذیر ہے۔ اور دوربیں بانی کی تمام امیدیں پوری ہو چکی ہیں۔ بہتیرے طلبا تعلیمی اعزاز حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس آچکے ہیں۔ بعض امپیریل سروس مثل انڈین سول سروس وغیرہ میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور بعض نے

علمی پیشوں میں دسترس حاصل کی ہے۔ تمام کی حالت نہایت عمدہ ہے اور اس بانی کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں جس کی داد و دہش کے ذریعے ان کو بہبودی نصیب ہوئی۔ مجھے ایک شخص کی بھی ایسی مثال نہیں ملی ہے جس نے کل اصل رقم بمعہ سود واپس نہ دے دی ہو بلکہ تعجب ہوگا اگر ان میں سے بعضوں نے جو اپنی ملازمت یا پیشہ میں خاص طور پر کامیاب ہوئی ہیں کچھ زائد روپیہ بھی فنڈ کو دے نہ دیا ہو۔ امید ہے کہ آپ صاحبان محسوس کریں گے کہ یہ کار خیر کیسے دنیاداری کے طریقوں کے مطابق جاری ہے۔ فنڈ پر بغیر بوجھ ڈالے ہوئے روز بروز ان طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اصل رقم جو ٹاٹا نے علحدہ جمع کی تھی اس سود کے اضافہ سے جو قرض کی ادائیگی پر ملتا ہے برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے اور ممکنات سے ہے کہ وظائف کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ان تمام فوائد کا بار خرچ جو طلبا حاصل کرتے ہیں انھی کے دوش پر رہتا ہے اصل رقم لگاتار بڑھ رہی ہے اور کچھ عرصہ میں کثیر مقدار تک پہنچ جائے گی۔ یہ تمام روپیہ بہت زیادہ طلبا کے قابلیت حاصل کرنے اور بہتر شہری بنانے میں برابر صرف ہوتا رہے گا۔

صاحبان! مجھے اعتماد کلی ہے کہ کشور ہند کے ہر ایک صوبے میں اس قسم کے فنڈ کا قیام اس سہولت کو بہم پہونچا دے گا جس کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کے واسطے اہل اسلام سخت ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ اسکیم مذکورہ بالا کے جزئیات میں ایسی تبدیلیاں کرنا ضروری ہے جو ہماری قوم کے حالات کے مناسب ہو وظائف مثل ٹاٹا اسکیم کے گریجویٹ ہونے کے بعد نہیں دیتا ہوں گے بلکہ میٹرکیولیشن یا ہائی اسکول لیونگ امتحان پاس کرنے کے بعد۔ اس تبدیلی کے فوائد عیاں ہیں۔ مالی اور دیگر اسباب کی وجہ سے بہت سے مسلمان طلبا کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہیں اور ادنےٰ امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اگر وظائف دیئے جائیں گے تو ان کو تحصیل تعلیم برابر جاری رکھنے کے لئے قرار واقعی امداد ملے گی مزید فائدہ یہ ہوگا کہ اثناً وقت طلبا کی نگرانی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے وقت کر سکیں گے اور دریافت کر لیں گے کہ انتخاب سے بیشتر جو علمی فضیلت کی امید طلبا نے دلائی تھی برابر قائم رہی ہے اور رہ سکتی ہے۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد آخری انتخاب بدیں منظر کیا جائے گا کہ طالب علم یورپ یا کسی اور ملک میں بھیجا جائے اور اس موقع پر فیصل ہوگا کہ اس مخصوص طالب علم کا انتخاب اولےٰ برقرار رکھا جائے دوسری تبدیلی کا تعلق سرمایہ کے اسراف سے ہے۔ ہر صوبہ میں یہ فیصلہ کرنا بھی لازمی ہوگا کہ اصل رقم واپس لی جایا کرے۔ یا فنڈ کے ازدیاد کی غرض سے کچھ زیادہ رقم طلب کی جائے۔ میری

رائے میں کوئی نقصان عظیم نہیں ہوگا۔ اگر اس زائد رقم کی ادائیگی جو ٹاٹا کی اسکیم کے مطابق بحساب ایک روپیہ فی صدی جاتی ہے طلباء پر چھوڑ دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ طالب علم کا احساس آبرو اس کو مجبور کرے گا کہ حتی الامکان اس فنڈ کو روپیہ واپس دے جس کی بدولت آج اس درجہ کو وہ پہنچا ہے۔ یہ قاعدہ بھی وضع کرنا ہوگا کہ وظائف تعلیم صنعت وحرفت کے لئے بھی دیئے جایا کریں۔ تجویز کے جزئیات کی نسبت مفصل بحث لازمی نظر نہیں آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس قسم کا فنڈ قائم کیا جائے تو ہر ایک صوبہ میں ایسے قواعد وضع کئے جا سکیں گے جو اس کے مناسب حال ہوں۔

اس قسم کی تجویز کا ایک اور عمدہ نتیجہ یہ ہے کہ کثیر التعداد طلباء میں وظیفہ حاصل کرنے کے لئے قابلیت پیدا کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ جو امتحان میں نے تجویز کیا ہے وہ میٹریکولیشن یا ہائی اسکول لیونگ امتحان ہے۔ فقط یہ امر کہ وظائف حاصل کنندگان کو روپیہ بقدر ضرورت ہندوستان کے کالجوں میں حصول تعلیم کے لئے دیا جائے گا اور ڈگری کا امتحان پاس کرنے کے بعد ممالک غیر میں جانا ہوگا۔ محرک اشتیاق پایا جائیگا اور رہائی اسکولوں میں بیش از بیش طلباء داخل ہوا کریں گے۔ مسلمانان ہند میں ترویج تعلیم انگریزی کے لحاظ سے یہ کچھ کم فائدہ نہ ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ سے کالجوں میں بھی زیادہ طالب علم داخل ہونے لگیں۔ سامعین یقیناً آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ خواہ تجویز مذکور سے یہ تمام فوائد میسر آئیں یا نہ آئیں اس قسم کے وقف کا مسلمانان ہند میں اعلیٰ تعلیم پھیلانے کی غرض سے محض قائم کرنا بے انتہا مفید ہے۔

مذہبی تعلیم کے ضمن میں میں اشارہ کر چکا ہوں کہ علی گڑھ جیسے رہائشی ہائی اسکول کالج قلمرو ہند کے مختلف اقطاع میں قائم کرنا مناسب ہوگا۔ ان میں تمام اقوام کے طالب علم داخل ہو سکیں گے اور وہاں مسلمان طلباء کو ضروری مذہبی تعلیم بھی دی جایا کرے گی اور ان میں مثل علی گڑھ کالج کثیر التعداد طلباء پڑھا کریں گے۔ ان تجاویز کے پیش کرنے کے وقت میں یہ امر فراموش نہیں کر چکا ہوں کہ ان سب کا اجرا روپیہ پر مبنی ہے۔ بہت سی اہم تجویزیں مسلمانوں میں تعلیمی ترقی پیدا کرنے کے لئے بیان کی جا سکتی ہیں لیکن سب میں دشوار مسئلہ مالی مسئلہ ہے۔ یہ دو طرح حل ہو سکتا ہے۔ اول تو ہر طرح کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ خیراتی اوقاف کی کثیر آمدنی قوم کی تعلیمی ضروریات مہیا کرنے میں صرف ہوا کرے۔ اس کا ذکر میں پیشتر بھی کر چکا ہوں اور آپ کا بیش قیمت وقت مکرر مضمون سے ضائع نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ دوم سرکیف کوشش کرنا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کے محاسن کو بغیر بگاڑے ہوئے

اس کے خرچ میں کمی ہو۔ موجودہ حالات میں اعلیٰ تعلیم نہایت گراں ہے اور اچھا ہوگا اگر ہم سوچیں کہ آیا اس کے اخراجات اس قدر کم ہو سکتے ہیں کہ ان کی مقدار معقول ہو جائے۔ اس زمرے میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ اہل ہنود نے اس مسئلہ کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عرصہ ہوا کہ پونا کے چند پُر جوش اشخاص نے اعلیٰ تعلیم کے مسئلہ کو حل کرنے کا عزم کیا۔ ہماری طرح انھوں نے محسوس کیا کہ سرزمین ہند کی ترقی مغربی علوم کی وسیع اشاعت سے وابستہ ہے اور خدمت و ایثار کے زریں اصول کی بنا پر ایک تجویز اختراع کی۔ انھوں نے ایک انجمن تعلیم قایم کی اور اس کی رکنیت کی ایک شرط یہ قرار دی کہ ہر ایک ممبر کم سے کم پندرہ سال قلیل مشاہرہ پر تعلیم کی ترویج میں صرف کرے گا۔ جوش اس درجہ موج زن ہوا کہ بعض قابل گریجویٹ اصحاب نے دنیوی ترقی کو جو ان کے قبضے سے دور نہ تھی خیرباد کہہ کر انجمن میں شامل ہو گئے۔ اس طریقہ سے وہ پروفیسروں اور لکچرروں کے کثیر مصارف یک قلم غائب ہو گئے اور عوام الناس میں بھی اعلیٰ تعلیم کی مقدرت پیدا ہو گئی۔ ہند کی تعلیمی ترقی کے واسطے اس خلوص نفس سے خدمت کرنا امداد اور پسندیدگی سے کب محروم رہ سکتا تھا؟ متمول اشخاص نے ان محبان وطن کی مالی امداد کی۔ چنانچہ اس امداد اور گورنمنٹ کے معطیات سے آج صوبہ بمبئی میں پونا کو اعلیٰ علمی مرکز بنا دیا ہے۔ فرگوسن کالج ایثار نفس اور تعلیمی ترقی کی جیتی جاتی یادگار رہے۔ پونا ایجوکیشن سوسائٹی کے لئے یہ امر تسلی بخش ہے کہ ان کے اعلیٰ اصول عمل اور اشخاص کی نگاہوں میں بھی مستحسن ثابت ہو رہے ہیں اور اس کے قیام کے بعد کئی اور انجمنیں انہی قواعد کے مطابق بنائی جا چکی ہیں تاکہ اعلیٰ تعلیم کا حلقۂ اثر وسیع ہو سکے۔ مجھے مطلع کیا گیا ہے کہ اس شہر میں بھی اسی طرح کی ایک سوسائٹی بنائی گئی ہے اور اس کی مساعی جمیلہ کے نتائج ایک ہائی اسکول اور سورت کالج ہیں۔

ان محبان وطن پر صد آفریں جنھوں نے مادر ہند کی علمی بہبودگی کے لئے اپنی زندگی نثار کر دی کیا یہ توقع بے جا ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان ان کی تقلید کریں اور ترویج تعلیم کی غرض سے انجمنیں قایم کریں؟ نہیں ہرگز نہیں! مجھے اعتماد کلی ہے کہ اگر ان سے اپیل کی جاوے گی تو کافی گریجویٹ یہ کام اپنے ذمہ لے لیں گے۔ اور کم سے کم ایک ایسی انجمن فی صوبہ قایم ہو سکے گی۔ یقیناً آپ اعتراف کریں گے کہ مختلف اقطاع ملک میں اس قسم کی انجمنوں کا قیام شوق تعلیم کے لئے تازیانہ کا کام دیگا اور قوم کی تعلیمی ترقی پر عمدہ اثر ڈالے گا۔ کیا میں جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ صاحبان سے اس مسئلہ پر اپنے اپنے صوبہ واپس جانے کے بعد غور کرنے کے لئے درخواست کروں اور کیا میں

استدعا کر سکتا ہوں کہ آپ ان کے قیام کے لئے اپنے رسوخ کو کام میں لائیں ان انجمنوں کے قیام میں فوری کامیابی کی چند خاص وجوہ ہیں۔ مسلمانان ہند امور تعلیم سے ان دنوں میں خاص کر دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہماری قوم میں بہتیرے گریجوئیٹ ہیں جن میں پبلک کی خدمت بجالانے کی اسپرٹ اُمڈ رہی ہے۔ ان کو صرف ایسے مواقع کی ضرورت ہے جہاں وہ ملک کی خدمت کر سکیں۔

اس سے زیادہ کیا مفید کام ہے کہ وہ زندگی کا بہترین حصہ تعلیم و تعلّم میں صرف کریں۔ پس فقط یہی وجوہ نہیں ہیں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اس اپیل کو قبول کرنے کا ایک اور خاص سبب ہے کیا حضرت رسالت پناہ علیہ صلوات اللہ نے ہمیں درس تدریس کی نصیحت نہیں کی ہے؟ حدیث مصطفوی دوبارہ سناتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص علم سکھاتا ہے گویا زکوٰۃ دیتا ہے اور جو شخص اس کو حقیقی معنوں میں صرف کرتا ہے عبادت خدا میں مشغول رہتا ہے۔ مجھے ہرگز شبہ نہیں ہے کہ اگر تعلیم یافتہ مسلمانوں سے اپیل کی جائے کہ وہ خلوص نفس سے مذہب اور حب وطن کی خدمات بجالائیں تو وہ کبھی انکار نہ کریں گے۔

جب ایسی انجمنیں قائم ہو جائیں گی تو مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ جو سرمایہ بصد کوشش جمع کرنا پڑتا ہے۔ اس میں معتدبہ کمی ہو جائے گی۔ گورنمنٹ بھی سالانہ اور غیر مقررہ امداد دے گی جو بڑی حد تک حاجت روا کر سکتی ہے۔ آپ کو مطلع کر چکا ہوں کہ گورنمنٹ بمبئی نے ابتدائی تعلیم کی تعمیم کے بارہ میں جو پالیسی اختیار کرنا منظور کی ہے اس کا اعلان کر دیا ہے۔ ثانوی تعلیم کی ترویج کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایڈیڈ کالجوں کو بعض شرح سے مدد دی جاتی تھی اس پر نظر ثانی ڈال کر اس کو ترمیم کیا ہے اور اب زیادہ مقدار میں امداد ملا کرے گی اس امداد اور تعلیمی انجمنوں کے قیام سے یقیناً مسلمانوں کا مسئلہ تعلیم حل ہو سکتا ہے۔ ہمیں جان توڑ کوشش کرنے کا عزم کرنا چاہیئے اور مردانہ وار ہمت کر کے کسی کی مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے اگر ایسا ہوا تو بلاشبہ ہماری قوم میں علم ایسا ہی تازہ بن کر چمکے گا جیسا سلف میں درخشاں تھا۔

حضرات! مزید طول کلام سے آپ کے صبر و تحمل کا امتحان لینا میرا مقصد نہیں ہے میں آپ صاحبوں کا عین مشکور ہوں کہ آپ نے نہایت صبر سے میری تقریر کو سنا ہے اب میں جملہ صاحبان سے جو قوم کے حقیقی بہی خواہ ہیں اپیل کرتا ہوں کہ آپ عزم بالجزم کریں کہ علم اور روشنی کے واسطے آپ اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اگر ہم ارادہ کر لیں کہ بغیر دوسرے کی امداد کے اپنا مقصد خود حاصل کر لیں گے تو اس اصول کے مطابق مسئلہ تعلیم کو بآسانی

حل کر سکتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک فرد لشیر احیاء علوم کے نیک کام میں ہاتھ بٹا سکتا ہے جو متمول ہیں روپیہ دے کر حصول مدعا میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ بعض نصیحت اور تمثیل سے مدد کر سکتے ہیں۔ جن کو یہ توفیق حاصل ہے وہ تعلیمی انجمنوں میں شامل ہو کر اپنی زندگی کا بہترین حصہ قوم کی بہبودگی کے لئے وقف کر سکتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ اگر کوئی شخص ان طریقوں سے مدد نہ کر سکتا ہو تو وہ اپنی اولاد کو مذہبی اور دنیوی تعلیم دے سکتا ہے۔ تاکہ جہالت کا پردہ قوم کے منہ سے اٹھ جائے۔

مسلمانو! خدا عزوجل سے دعا مانگو کہ وہ ہر ایک مومن کو توفیق خدمت و ایثار بخشے تاکہ ہم سب قوم کی ترقی اور بہبودگی کے نیک کام میں اپنی زندگی گزاریں۔

آمین
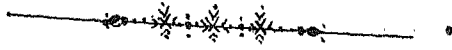
اجلاس سی و سوم

(منعقدہ خیرپور سندھ ۱۹۱۹ء)

صدر شمس العلماء نواب شمس الہدیٰ صاحب مرحوم کے سی آئی ای

حالات صدر

مولوی شمس الہدیٰ مغربی بنگال کے شریف اور ذی علم خاندان کے فرد فرید تھے۔ وہ عربی کے فاضل اور مذہبی علوم سے باخبر تھے۔ اسی کے ساتھ علوم جدیدہ میں انھوں نے ایم اے کی ڈگری کلکتہ یونیورسٹی سے حاصل کر کے قانونی تعلیم پر توجہ کی اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ بعد انفراغ تعلیم اُنھوں نے کلکتہ میں پیشۂ وکالت اختیار کیا اور اپنے زمانہ کے مشہور اور کامیاب وکیل ثابت ہوئے۔ اس ذریعہ سے ان کو بہت مالی فائدہ پہنچا۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی قانونی شہرت اور کامیاب وکالت نے ان کو ہائی کورٹ کلکتہ کی ججی کے ممتاز منصب پر پہونچانے کی سفارش کی جو اپنی عمدہ خصلت اور اعلےٰ قابلیت کے لحاظ سے اس عہدہ کے لئے بجا طور پر مستحق تھے۔ ہائی کورٹ کی ججی کی خدمات مسلسل طور پر کئی سال تک نیک نامی کے ساتھ انجام دینے کے بعد انھوں نے پنشن حاصل کی بعد ازاں وہ گورنر بنگال کی اگزکیٹو کونسل کے ممبر قرار پائے وہ ایک باوقار شہری ہونے کے لحاظ سے سوسائٹی کے ممتاز ممبر ہونے کی حیثیت سے گورنمنٹ اور اعلیٰ حکام کی نظروں میں وقیع اور امور ملکی میں گورنمنٹ کے دست و بازو متصور ہوتے تھے۔ گورنمنٹ نے نہ صرف ان کو اعلےٰ مناصب پر جگہ دی بلکہ متعدد خطابات سے وقتاً فوقتاً ان کی عزت اور قابلیت کا اعتراف کیا۔ وہ سب سے پہلے شمس العلماء، اس کے بعد خان بہادر، پھر نواب اور آخر میں سر کے خطاب سے معزز

شمس العلما نواب سر سید شمس الہدیٰ کے سی آئی ای
صدر اجلاس سی و سوم (خیرپور سندھ سنہ 1919ع)

کئے گئے۔ نواب صاحب عمدہ سیرت اور قدیم وضع قطع کے ساتھ عالمانہ شان رکھتے تھے۔ شروع سے آخر زندگی تک وہ اپنے قومی لباس میں ملبوس نظر آتے تھے۔ جب وہ ہائی کورٹ میں بہ حیثیت وکیل کے مصروف بحث ہوتے تھے یا جب وہ ایک فاضل جج ہائی کورٹ کی صورت میں عدالت العالیہ کی کرسی پر بیٹھے نظر آتے تھے یا جس وقت وہ کونسل میں وزارت کے درجہ میں تھے اس وقت بھی ان کے سر پر عمامہ بنگالی کاٹ کا انگرکھا اس کے اوپر چغہ زیب بدن ہوتا تھا وہ ہمیشہ ایک طالب علم کی حیثیت سے رہے اور کتابوں کا مطالعہ کبھی اور کسی زمانہ میں نہ چھوڑا۔ وہ مختلف قومی انسٹی ٹیوشنوں سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ ہر قسم کی سوشیل اور علمی سوسائٹیوں کی اصلاح اور ترقی سے ان کو خاص دل چسپی تھی۔

جس زمانہ میں علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ مسئلہ وقف علی الاولاد کو قانونی شکل میں لاکر اس کا مسودہ پاس کرانے کی فکر میں تھے، اس وقت نواب صاحب نے علامہ ممدوح کو مسودہ کے شرعی اور قانونی پہلو کے لحاظ سے خاص طور پر امداد دے کر اس تجویز سے اپنی پوری دل چسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۱۹۱۰ء میں وہ کلکتہ سے آکر شریک کانفرنس ہوئے تھے۔

جب ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا کانفرنس کمیٹی نے اجلاس کانفرنس منعقدہ خیرپور کے لئے ان کو صدر منتخب کیا اور نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس نے نواب صاحب سے عہدہ صدارت قبول کرنے کی خواہش کی تو ممدوح نے نہایت خوشی سے اس دعوت کو قبول کیا مگر اتفاق کی بات کہ عین وقت پر جب کہ نواب صاحب کلکتہ سے عازم خیرپور ہو رہے تھے دفعتاً علیل ہو گئے اور ڈاکٹروں نے سفر کرنے کی مخالفت کر دی۔ بدیں وجہ نواب صاحب بہ نفس نفیس فرائض صدارت انجام نہ دے سکے۔ اس خبر نے اعیان جلسہ اور حاضرین جلسہ دونوں پر تھوڑی دیر کے لئے افسردگی پیدا کر دی۔ تاہم اس وقت مولوی سر رحیم بخش صاحب پریسیڈنٹ کونسل بہاول پور کی موجودگی نے صدارت کی قائم مقامی کے لئے موزوں اور مناسب انتخاب پیش کیا اور نواب صاحب کی عدم موجودگی کی تلافی کر دی۔ قائم مقام صدر نے دوسرے فرائض تو خود انجام دیئے لیکن خطبۂ صدارت وہی پڑھا گیا جس کو نواب صاحب پڑھنے والے تھے۔ نواب صاحب نے ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا جب کہ ان کی عمر کی تقریباً ستر منزلیں طے ہو چکی تھیں۔ نواب صاحب کا وجود مسلمانان بنگال

کے لئے ایک گراں قدر سرمایہ تعاجس کی تلافی عرصۂ دراز تک ہوتی نظر نہیں آتی ؎

جہاں اے برادر نماند بہ کس
دل اندر جہاں آفریں بند و بس

خطبۂ صدارت

حضرات! میرا فرض یہ ہے کہ آپ کا دلی شکریہ ادا کروں کہ آپ نے اس قومی تعلیمی مجلس کی صدارت کا اعزاز بخش کر میری عزت افزائی کی جس حالت میں کہ میں اپنے گرد و پیش کل حصص ہندوستان کے قائم مقاموں کو دیکھتا ہوں جو علم و فضل اور اپنی گزشتہ قومی خدمات کے لحاظ سے ممتاز ہیں تو میں یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اعزاز میری اعلیٰ درجہ کی خوش نصیبی کا باعث ہے۔ بدقسمتی سے اس سے قبل ایک سے زیادہ مواقع پر میں اپنی ناتندرستی اور دیگر وجوہ سے (جن کے اظہار کی ضرورت نہیں) اس عزت کے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر چکا تھا۔ مگر اس موقع پر جب میرے دوست مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے مجھے اطلاع دی کہ قوم کی متفقہ خواہش ہے کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی صدارت مجھے کرنی چاہیئے تو میں نے اُسے بخوشی منظور کرنا اپنا فرض سمجھا۔ مجھے مسرت ہے کہ میں اس قابل ہو سکا کہ ملک کے سربرآوردہ ماہرانِ تعلیم کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر سکوں۔ اور مجھے صدقِ دل سے امید ہے کہ ہمارے مباحث کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہم اپنے کل ملک کے برادرانِ اسلام کی حالت کی اصلاح کی تدابیر اختیار کر سکیں گے۔ جیسا کہ آپ سب اصحاب واقف ہیں۔ ماہرانِ تعلیم کے سالانہ اجتماع کا خیال سب سے اول اُس برگزیدہ ہستی کو ہوا تھا جس کا صرف یہ وظیفہ تھا کہ اپنی قوم کو بامِ ترقی پر پہونچائے اور اس کو ہندوستان کی دیگر اقوام کی سطح پر لائے۔ سب سے پہلے اُنھی نے یہ محسوس کیا کہ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کہ ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں اور اُس کے بعد اُنھوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے اس طرح کام کرنا شروع کیا کہ ان سے پہلے کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے جیسی کچھ کامیابی حاصل کی وہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی یاد تازہ رکھنا ایک عظیم الشان قومی سرمایہ ہے جو مرورِ ایام کے ساتھ اور زیادہ شاندار اور مقدس تر ہوتا جاتا ہے۔ میں آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ اللہ تعالےٰ شانہٗ کی بارگاہ میں دستِ بدعا ہوں کہ سرسید کی

روح پر برکات کاملہ نازل فرمائے۔

ہمیں چاہیئے کہ اُن کی یاد کے ساتھ ہی حتی الامکان ان کی مثال کی پیروی کی کوشش کریں۔ اس موقع پر ہمیں صدق دل سے کوشش کرنی چاہیئے کہ ان مختلف مسائل کو حل کریں جو ہمارے غور کے محتاج ہیں اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ اس مہم کو سر کریں جو سر سید کے اس قدر مرکوز خاطر تھی۔ یہاں پہنچنے کے لئے ہم میں سے اکثر نے بڑی بڑی مسافتیں طے کی ہیں پس اس موقع کو اپنی قربانیوں کی شایان شان بنائیے۔ ہمارے دلوں میں ارزاں مدح وثنا کرنے کی خواہش نہ ہونی چاہیئے۔ ہر شخص کو لازم ہے کہ اس کانفرنس کو اپنے تجربہ سے مستفید کرے اور اُس تجربہ کی روشنی میں اُن چٹانوں اور اُتھلائیوں کا پتہ دے۔ جو ہمارے راستہ میں حائل ہیں۔ اسلام کی کشتی کو جو ہندوستان کے متلاطم سمندر میں ڈگمگا رہی ہے۔ ہوشیاری کے ساتھ ملاحی کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ دنیا بڑے بڑے انقلابات دیکھ رہی ہے۔ جب کہ پرانا نظام سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے اور ہم اپنے آپ کو ایک نئے عالم میں پاتے ہیں جہاں حالات زندگی بہ نسبت سابق کے بالکل ہی مختلف ہیں۔ نئی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ پرانے آلات زنگ آلودہ ہو گئے ہیں اور اس تنازع للبقاء کے اندر ہمیں جدید آلات حرب کی ضرورت ہے۔ دنیائے اسلام اب وہ نہیں ہے جو پہلے تھی۔ مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت کی قسمت میزان میں آ چکی ہے۔ یہ وہ سلطنت ہے جس نے اسلام کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا تھا اور جس کی گرفت کل مسلمانان عالم کے جذبات پر نہایت مستحکم تھی۔ یہ وہ واقعات ہیں جن سے چشم پوشی کرنا فریب کاری ہے۔

اس امر پر غور کرنا میرے فرائض سے خارج ہے کہ ان انقلابات کا سیاسی اثر کچھ ہوا تو کیا ہوگا۔ چوں کہ ان کے اثرات بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات پر بھی ہیں اس لئے ممکن ہے کہ ہماری تعلیمی پالیسی پر بھی اس کا اثر پڑے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ اپنی موجودہ حالت کے لحاظ سے ہمارے بیرونی تعلقات لازمی طور پر نہایت محدود قسم کے ہیں اور خارجی دنیا کے انقلابات خواہ ہم اُن کا کتنا ہی ماتم کیوں نہ کریں ہندوستان کے اندر ہماری تعلیمی پالیسی کو طے کرتے وقت یہ لحاظ رکھیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور ہمارے بہترین فوائد اس ملک سے وابستہ ہیں جس میں ہم رہتے ہیں۔ لہذا ہمیں ان وسیع تر مسائل کو چھوڑ کر ان معاملات کو چھوڑ کر ان معاملات کو لینا چاہیئے جو قریب تر ہیں اور جو اس وقت اتنی کافی اہمیت رکھتے ہیں کہ ہم اُن کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو سکیں۔

یونیورسٹی کمیشن کلکتہ یونیورسٹی کمیشن جس میں سلطنت برطانیہ کے بعض نہایت ممتاز ماہران تعلیم شریک تھے اپنے مباحث کا نتیجہ تیرہ مجلدات کی شکل میں پیش کیا ہے جن میں سے دس شائع ہو چکی ہیں۔ ہمیں اس امر کا اطمینان ہے کہ میرے دلی دوست ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی شرکت نے اس ممتاز جماعت کو مسلمانوں کی خاص ضروریات کی جانب مائل کیا اور گو کمیشن کی سفارشیں اس لحاظ سے براہ راست صرف مسلمانان بنگال سے متعلق ہیں۔ تاہم تمام ضروری تفصیلات میں وہ کل مسلمانان ہندوستان پر بھی تقریباً اسی حد تک منطبق ہوتی ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ ان سفارشوں پر غور کر کے ان کی نسبت کوئی فیصلہ صادر کریں۔ اس سے کانفرنس کے اجلاس ہذا پر ایک بڑا بار اور ذمہ داری عائد ہو گئی ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی بل اس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مسودہ قانون اہمیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ آپ واقف ہیں۔ باشندگان مشرقی بنگال اور علی الخصوص مسلمانوں کے ساتھ اس کا وعدہ ایک بڑے مدبر نے کیا تھا اور اس سے غرض اس نقصان کی تلافی تھی جو دہلی دربار میں حضور ملک معظم کے منسوخی تقسیم بنگال کے اعلان سے مسلمانوں کو پہنچا تھا۔ ایک کمیٹی اس غرض کے لئے قایم ہوئی تھی کہ ڈھاکہ میں ایک اقامتی یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم مرتب کرے۔ کمیٹی نے ایک نہایت جامع اور مانع رپورٹ پیش کی جو سالہا سال تک ہمارے پیش نظر رہی اور کچھ تو زمانہ جنگ کی مالی مشکلات کے سبب سے اور کچھ سیڈلر کمیشن کے تقرر کے سبب سے یہ کل مسئلہ اتنے عرصہ تک معلق رہا حتی کہ باشندگان مشرقی بنگال سمجھنے لگے تھے کہ شاید جدید یونیورسٹی کسی قریب زمانہ میں قایم نہ ہو۔ مگر ہم آنریبل میاں محمد شفیع کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے اپنے تقرر سے تین ماہ کے اندر امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ڈھاکہ میں ایک تعلیمی اور اقامتی یونیورسٹی قایم کرنے کے متعلق مسودہ قانون پیش کر دیا۔

علی گڑھ کالج علی گڑھ کالج کی پیچیدگیاں بہ لحاظ اہمیت تیسرا مسئلہ ہے جس نے کل ہندوستان کے مسلمانوں کے قلوب کو مضطرب کر رکھا تھا۔ علی گڑھ کالج سرسید کا عزیز فرزند تھا۔ اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اُن کی تمام دلچسپیوں کا مرکز صرف یہی کالج رہ گیا تھا۔ لہذا یہ ایک قومی سرمایہ ہے۔ جس کی فلاح و بہبود کی جانب سے ہم غافل نہیں ہوسکتے۔ یہ واقعہ بخوبی معلوم ہے کہ کالج کے انتظامات کے متعلق اس وجہ سے مشکلات پیدا ہو گئی تھیں کہ یورپین اسٹاف نے بالاتفاق استعفا دے دیا تھا۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے بھی اپنے فرض کی انجام دہی میں

کوتاہی نہ کی۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں وہ بہ تعداد کثیر علی گڑھ میں جمع ہوئے اور یوروپین اسٹاف اور آنریری سکرٹری کے مابین کشیدگی رفع کرنے کی انھوں نے ہر چند کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ یوروپین اسٹاف استعفا واپس لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کالج کا وجود معرض خطر میں ہے طلبہ کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی اور کالج کے معاملات نے ہم سب کو نہایت پریشان کر دیا تھا۔ قوانین و قواعد کے ملاحظہ سے ٹرسٹیوں کو معلوم ہوا کہ اُن پر نظر ثانی کرنے کی از حد ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی قایم ہوئی اور قواعد کی ترمیم عمل میں آگئی۔ مجھے اس امر کے اظہار میں مسرت ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے کالج کا پرنسپل ہونے سے یہ تمام خطرات رفع ہو گئے ہیں ہم ان کے انتظام کی کامیابی پر ان کو مبارک باد دیتے ہیں اور آئندہ اُن کی مزید کامیابیوں کے لئے دعاگو ہیں۔

ہمارا مطمحِ نظر

اس قسم کے مواقع پر زیادہ مناسب یہ ہوتا ہے کہ وسیع تر مسائل پر غور کیا جائے اور یہ کہ بہ نسبت تفصیلات کے اپنی توجہ کو انھیں مسائل پر محدود رکھا جائے سب سے پہلے غور کرنا یہ ہے کہ وہ کیا اصول ہونا چاہئے جسے ہم پیش نظر رکھیں اس کے بعد ہم صاف نظری کے ساتھ آگے بڑھ سکتے اور اپنا مقصود حاصل کر سکتے ہیں۔ مقاصد کا انحصار زیادہ تر اپنی ضروریات پر منحصر ہونا چاہئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے لئے کوئی نئی دنیا بنالیں۔ ہمیں مقتضائے زمانہ کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کا سب سے پہلا اور نہایت ضروری وصف یہ ہے کہ ادبی اور علمی تعلیم نے اُس کے دل کو فراخ کر دیا ہو۔ آج کل سائنٹیفک تعلیم بہ نسبت خالص لٹریری تعلیم کے شائستگی اور روشن خیالی کے لئے زیادہ معین ہو سکتی ہے اور اس واقعہ سے چشم پوشی کرنا عبث ہے کہ مغربی سائنس اُس سے بہت زیادہ آگے ہے جس کا نام ہمارے بزرگوں کے زمانہ میں سائنس تھا۔ ہمارا ادبی مذاق قدیم یونانیوں سے ہمیں پہنچا تھا اور ہم نے اپنا بہت سا وقت غیر مفید زبانوں میں ضائع کیا لیکن اس سے بھی مسلمانوں کے دل و دماغ کو کافی ورزش حاصل ہو گئی ہم نے یونانیوں کے علوم و فنون پر اضافہ کیا اور اُس زمانہ میں جب کہ یورپ محض ایک سنسان بیابان تھا دنیا نے ہمارے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اس احسان سے آج بھی انکار نہیں کیا جاتا۔ بقول شاعر ؎

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیوں کر کوئی
بھول جائے صبح ہوتے رات کا سارا سماں

میں مسلمانوں کی قدیم عظمت و شان کا اس بنا پر ذکر نہیں کرتا کہ آپ کے روبرو پرانے واقعات کا ذکر کروں۔ دنیا آگے بڑھ گئی ہے۔ اور سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں بھی باقی دنیا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس زمانہ میں جس قسم کی تعلیم ہم چاہتے ہیں وہ مغربی تعلیم ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے سخت غلطی ہوگی اگر ہم ان طریقوں کو زندہ کریں جو گزشتہ زمانہ میں کافی عمدہ تھے مگر جو آج کل بالکل کہنہ و فرسودہ ہیں اور ان خیالات کے علاوہ بھی ہم ہندوستان کے اندر اپنی موجودہ خاص حالت کی جانب سے بھی تغافل نہیں برت سکتے۔ ہمیں یہاں ہر روز مقابلہ کے میدان میں جد وجہد جاری رکھنا پڑتی ہے اور مقابلہ بھی اس جماعت کے ساتھ ہے۔ جو ہم سے زیادہ دولت مند، زیادہ طاقتور اور زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ جائز مقابلہ سے ترقی کے جوش میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری قوموں کے ساتھ مقابلہ کے باعث جوہر نمودار ہوتے ہیں۔ اس مقابلہ کے لئے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیئے ایوان ہائے سلطنت کے اندر ہمیں نہ صرف تعلیم کی بلکہ اکثریت کی جس قدر ضرورت اب ہے اتنی کبھی نہیں ہوئی تھی آج کل ہندوستان میں بڑے بڑے انقلابات ہو رہے ہیں۔ ہم اپنے سیاسی وجود کے ایک جدید میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک مصیبت ہوگی اگر ہم اُن فوائد سے جو عنقریب ہمیں ملنے والے ہیں پورے طور پر متمتع ہونے کا ہم اپنے آپ کو اہل نہ ثابت کریں۔ ہندوستان کی ترقی بحیثیت مجموعی ان تمام جماعتوں کی جو آبادی کا اکثر حصہ ہیں منتظم اور مساوی ترقی پر منحصر ہے۔

مقاصد کے عدم تعین کی وجہ سے ہم نے بہت نقصان اُٹھایا ہے۔ ایک زمانہ میں مسلمان سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کا واحد مقصد معقول سرکاری عہدے حاصل کرنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ فکر معاش سے فارغ البال تھے اُنھوں نے اپنے بچوں کو مدارس میں بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھی اور صرف اسی تعلیم پر اکتفا کی جو مسلمانوں کے شریف خاندانوں میں اس وقت جاری تھی اور جو صرف عربی اور انگریزی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی تھی۔ اس طرح انگریزی تعلیم صرف متوسط الحال اور غرباً کے اندر محدود رہی۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ سیاسی اثر کے برقرار رکھنے کے لئے سرکاری عہدوں کے اندر واجبی حصہ کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہمارے واسطے ایک تعلیمی پالیسی قرار دینے میں یہ واحد عنصر ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ صرف دو اصول ہمارے مدنظر ہونے چاہئیں سب سے پہلے حصول تہذیب اور دوسرے حکومت کے اندر اثر۔ اور ان دونوں مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے مغربی تعلیم از بس ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری قوم ضروریات زمانہ سے پورے

طور آشنا ہو چکی ہے۔ ترقی ہوئی ہے اور کچھ کچھ تیز بھی ہوئی ہے۔ مگر چوں کہ ہمیں ابھی بہت کچھ
کمی پوری کرنی ہے اس لئے ہمیں اور زیادہ تیز ترقی کی ضرورت ہے۔ مغربی تعلیم اور مغربی اصول
تعلیم سے میری مراد کسی مغربی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینا نہیں ہے۔ اگر حالات زندگی اجازت
دیتے تو میں مسلمانوں کے لئے ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دینے کو ترجیح دیتا۔

یہ بات زمانہ حال کے معموں میں سے ہے کہ ہماری تعلیم ایک غیر ملکی زبان کے واسطے سے
شروع ہو۔ یہ شیر خوراتی کا وہی مصنوعی طریقہ ہے جس نے ہماری دماغی نشو و نما کو بیخ و بن سے ضائع
کر دیا ہے اور ہمارے بچوں کی تعلیم کو اصل سے دہ چند مشکل کر دیا ہے۔ اس سے اپج کا مادہ بالکل
ضائع ہو گیا ہے۔ اور تحقیقات کی روح مردہ ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں تعلیمی ترقی میں قدم
قدم پر مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ الزام دیا جاتا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے ناقابل پیدا
ہوتے ہیں۔ میں اس الزام کو تسلیم کرتا ہوں۔ نسبتاً ہندوستان کا طریقہ تعلیم ایسے لوگ پیدا
کرنے سے قاصر رہا ہے جنھوں نے انسانی علم کے مجموعہ میں کسی قسم کا اضافہ کیا ہو ہم نے اس
قسم کے چند ہی لوگ پیدا کئے ہیں جن کی نسبت اس وقت اور بھی کم ہو جاتی ہے جب ہم ہزاروں
گریجوایٹوں کو شمار میں لاتے ہیں جو ہر سال ہندوستانی یونیورسٹیوں سے تعلیم کی سندیں حاصل
کرتے ہیں لیکن یہ سلسلہ پچاس برس سے زیادہ سے جاری ہے۔ اور یک لخت چھوڑ دینا مشکل
ہے۔ ایک اور بھی خیال ہے جس کے سبب سے فوری بازگشت حد سے زیادہ دشوار ہو گئی
ہے۔ مغل بادشاہ جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ اپنا علم ادب لائے۔ ان کے عہد
حکومت میں جو زبان کہ درباری زبان تھی۔ دیسی زبان تھی جس میں کہ زندگی کے معمولی کاروبار
بعید ترین دیہات میں ہوتے تھے۔ جو فارسی تھی برٹش گورنمنٹ نے اُن کی تقلید کی ہے اور
انگریزی کا علم قدم قدم پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس بیان کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے
وہ سیاسی اثر حاصل کرنے کے لئے اور ملک کی حکومت میں جائز حصہ لینے کے لئے جس کے
ہم اپنی تعداد اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستحق ہیں۔ ہمیں نہ صرف مغربی طرز تعلیم کی تقلید کرنی
چاہیئے بلکہ آئندہ کچھ زمانہ تک وہ کم از کم اعلیٰ اعلیٰ درجوں میں انگریزی کے واسطے حاصل
کرنی چاہیئے اور اس طرح ایک بڑے معاملہ کو حتی الامکان سدھارنا چاہیئے۔ اس مسئلہ کے
متعلق یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ کا معائنہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ نہایت اہم سوال جو
جواب کے لئے شائع کیا گیا تھا یہ تھا۔

(۱) کیا آپ کی رائے میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم (امتحان میٹری کولیشن سے اوپر یونیورسٹی کو اُس کے ہر درجہ میں ہونا چاہیئے۔

(۲) (الف) اگر آپ کا جواب اثبات میں ہو تو کیا آپ کے خیال میں یونیورسٹی کے طالب علم یونیورسٹی میں داخل ہونے کے وقت انگریزی زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں۔

(ب) آپ کی دانست میں ثانوی مدارس کے اندر ان طالب علموں کے لئے جو میٹرکولیشن کے لئے تیار ہو رہے ہوں انگریزی کس حد تک واسطہ تعلیم قرار دی جائے۔

(ج) کیا آپ اُس تعلیم سے مطمئن ہیں جو یونیورسٹی میں داخل ہونے سے قبل انگریزی زبان میں دی جاتی ہے۔ اگر نہیں تو آپ کس قسم کی اصلاح تجویز کرتے ہیں۔

(د) اسکول اور یونیورسٹی دونوں کے اندر انگریزی زبان کے استعمال کی عملی تعلیم اور انگریزی ادب کے مطالعہ کی تعلیم کے درمیان آپ کیا فرق کرتے ہیں۔

(ھ) کیا آپ کے خیال میں میٹری کولیشن کا امتحان تمام مضامین میں انگریزی میں ہونا چاہیئے۔

(و) کیا آپ کے خیال میں یونیورسٹی کورس کے درمیان میں انگریزی تمام طالب علموں کو یونیورسٹی کورس کے دوران میں تحصیل کرنی چاہیئے اور اگر ایسا ہو تو آپ کی رائے میں ان طالب علموں کے لئے جن کا عام نصاب تعلیم ادب کے علاوہ کچھ اور ہو تو اُن کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔

(۳) اگر آپ کا جواب نفی میں ہو یعنی اگر آپ یہ خیال کریں کہ انگریزی واسطہ تعلیم کے طور استعمال نہ ہونی چاہیئے۔ میٹری کولیشن سے اوپر یونیورسٹی کورس کے امتحان کے ہر درجہ میں تو آپ کس قسم کی تبدیلی کی سفارش کرتے ہیں اور یونیورسٹی اور قبل یونیورسٹی نصاب کے کس درجہ میں۔

کمیشن جن نتائج پر پہنچا اُن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ہم سفارش کرتے ہیں کہ (۱) مادری زبان کی تعلیم بہ دل و دماغ کی ترتیب کے خیال سے (۲) (الف) موجودہ میٹری کولیشن کے درجہ تک انگریزی کے بطور ذریعہ تعلیم ہونے کے استعمال کو کم کرنا۔ اور (ب) مذکورہ بالا درجہ سے اوپر اس کے ذریعہ تعلیم ہونے کو قایم رکھنا۔ (۳) انگریزی زبان کی تعلیم کے لئے ترقی یافتہ طریقے اختیار کرنا اور سکنڈری اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں اعلیٰ درجہ کے ٹرینڈ اُستاد رکھنا۔ (۴) انگریزی کے عملی علم کے لئے جانچ کے اور زیادہ سخت

طریقے اختیار کرنا اور (۵) ادبی نصابوں کی مشکلات میں غیر ادبی طلبہ کے امتحان کے طریقہ کو ترک کرنا۔ ہمارا عام مقصد یہ ہے کہ بنگال کی تعلیم یافتہ جماعت دو زبانیں جاننے لگے۔ مگر اپنے پیش رووں کی طرح ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دیسی زبانوں کو ترقی دینے کی برابر ضرورت ہے کیوں کہ انھیں کے ذریعہ سے مغربی اور مشرقی علوم و فنون عوام الناس تک پہنچ سکتے ہیں۔

موجودہ حالات پر یہ ایک بیّن اضافہ ہے اگر ہمارا راستہ صاف ہو تو ہم بہت زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مزید ترقی کا ابھی وقت نہ آیا ہو۔ تاہم ہمیں چاہیئے کہ استقلال کے ساتھ اس پر چلے جائیں۔ میری رائے میں ہماری تعلیمی پالیسی کی انتہائی منزل یہ ہونی چاہیئے کہ اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی امتیاز حاصل کر سکے جو ہمیں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ملنا ممکن ہے۔ یہ وہ مقصد ہے جس سے حاصل کرنے کی ایک اور مشرقی قوم نے کوشش کی اور نہایت قلیل وقت میں اسے حاصل کر لیا۔ انگریزی زبان کی تعلیم محض اس ضرورت سے جاری رہنی چاہیئے کہ موجودہ زمانہ کی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور جو لٹریچر ابھی تک اُردو میں پیدا نہیں ہوا ہے وہ پیدا ہو جائے۔ اس معاملہ میں میری رائے بہت سخت ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے وہ دن نہایت شاندار ہوگا جب کہ ہر مرد اور عورت ملکی زبان کو بھول کر ہر حیثیت سے انگریز ہو جائے۔ اور وہ نا قابلیتیں دور ہو جائیں جو قدرت نے اس پر عائد کی ہیں۔ میرے اصول بالکل مختلف ہیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور میں بالکل اپنے دلی جذبات کہہ رہا ہوں کہ میرے لئے اس سے زیادہ شرمناک کوئی بات نہیں ہو کہ میں اس وقت اپنے اسلامی بھائیوں میں کھڑا ہوا اپنی محدود تعلیم کی وجہ سے ایک ایسی زبان میں تقریر کرنے پر مجبور رہوا ہوں جس کو شاید آدھے سے زیادہ حاضرین سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا اس کا علاج یہ ہے کہ یہ نصف حصہ اٹھا کر دوسرے نصف کے ہم سطح کر دیا جائے میری رائے میں یہ قابل عمل نہیں ہو مجھے یقین ہو کہ ربندر ناتھ ٹیگور بیسویں صدی کے فلسفۂ تصوف کا رکن رکین نہ بن سکتا اگر وہ اپنے خیالات ایک اجنبی زبان کے ذریعہ سے ادا کرنے شروع کرتا۔ وہ انگریزی زبان پر بخوبی قادر ہیں تاہم اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کی کامیابی صرف اُسی زبان کے ساتھ وابستہ ہو۔ جو شیر مادر کے ساتھ اُنھیں ملی ہو۔ "اقبال" مسلمانانِ ہند کا قومی شاعر نہ بن سکتا اور ہمارے قلوب کو اپنی پُر جوش اور ولولہ انگیز نظموں سے متاثر نہ کر سکتا جیسا کہ اب کرتا ہو۔ اگر وہ اپنے خیالات کو اجنبی زبان کا جامہ پہناتا اور زیادہ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہو۔ کہا جاتا ہے کہ

مضمون پر ہم اس طرح حاوی نہیں ہو سکتے جس طرح کہ یوروپین ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ صحیح ہو لیکن اس سے کسی قسم کی دماغی سستی یا پستی لازم نہیں آتی بلکہ اس کا سبب محض زبان کی مشکل ہے جس سے بہ نسبت ذہن کے حافظہ پر زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔ قدرتی طور پر اس طریقہ سے ذہن کی رسائی محدود ہو جاتی ہے اور یہ خرابی عمر بھر قایم رہتی ہے اس طالب علم کی نسبت آپ کیا خیال کرینگے جو اپنے باپ کے ساتھ صبح و شام سیر کرنے دریا کی طرف جاتا ہے اور گھر آکر جغرافیہ ہاتھ میں لے کر یہ رٹ لگاتا ہے۔ "کلکتہ دریائے ہوگلی پر۔ کلکتہ دریائے ہوگلی پر"

میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے کافی طور پر آپ کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم آئندہ نسلوں کے لئے نہایت مضرت رساں ہے اور اس سلسلہ کی ضرورت سے زیادہ قایم نہ رہنا چاہیے۔ مگر قطع نظر دوسرے خیالات کے آپ کسی قسم کی فوری تبدیلی اس سبب سے بھی نہیں کر سکتے کہ درسی کتابیں موجود نہیں ہیں۔ پس لازم ہے کہ ہم میں کا ہر شخص جو یہ خدمت انجام دے سکتا ہے اپنا فرض اولین سمجھ کر اُسے انجام دے اور سمجھے کہ اُس نے ایسی قومی خدمت انجام دی ہے جو ہندوستان کی آئندہ قسمتوں کو سانچے میں ڈھالنے والی ہوگی۔ مجھے قوی امید ہے کہ حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ہمارے خواب کی تعبیر میں بہت کچھ آسانی پیدا کرے گی اور میں ہز اگزالٹیڈ ہائینس حضور نظام سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خود اپنی قلمرو کی ترقی کے لئے خصوصاً اور مسلمانان ہند کے لئے عموماً اُسے بیش از بیش ترقی دیں۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو قطع نظر سیاسی خیالات سے حتی الامکان صحیح تعلیم کو ترقی دینے کا دل سے خیال ہے۔ موجودہ وائسرائے نے اپنے اقوال و افعال سے اس رجحان کا کافی ثبوت بہم پہونچایا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ گورنمنٹ کی خدمت میں استدعا کریں کہ وہ ایک سرکاری دارالترجمہ قایم کرے جو ہمیں منزل مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ ہز اگزالٹڈ ہائینس حضور نظام کی توجہ اس جانب پہلے ہی منعطف ہو چکی ہے اور ہم اُن اہم نتائج کے بر آمد ہونے کے لئے یقین کے ساتھ چشم براہ ہیں۔

مسلمانان ہند کے لئے نئی تعلیمی پالیسی اختیار کرنے میں نمایاں حصہ لینا مسلمان والیان ریاست کا کام ہے۔ یہ مقصد ان ریاستوں میں بخوبی حاصل ہو سکتا ہے کیوں کہ وہاں اس قسم کا تصادم فوائد موجود نہیں ہے جو اُن سے باہر پایا جاتا ہے۔ اور میں اُن سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ از راہ فیاضی پیش قدمی کریں اور اپنی اپنی ریاستوں میں اپنی رعایا کے مناسب حال تعلیمی انسٹی ٹیوشنز

قایم کریں۔ مجھے امید ہے کہ مجھے معاف کیا جائے گا کہ شاید میں نے اُن لوگوں کو مشورہ دیا ہے جن کو میرے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ میں یہ اپیل اُس کانفرنس میں کر رہا ہوں جو ایک ایسے روشن خیال مسلمان حکمراں کی حدود ریاست کے اندر منعقد ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ اصلی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے جو ایک علم دوست قوم سے ہیں اور جن کے سلسلۂ اجداد میں نامور بزرگوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ہم سب ہز ہائینس کے اس شاہانہ مہمان نوازی کے لئے ممنون ہیں جو ہمارے لئے مرعی رکھی گئی ہے۔

حضرات قبل اس کے کہ میں دوسرے مضمون پر آؤں مجھے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کرنے کی اجازت دیجئے۔ خوش نصیبی سے اس زمانہ میں جب کہ میں کلکتہ پریسیڈنسی کالج کا طالب علم تھا تو مجھے ایک ممتاز مسلمان سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا جو ہندوستان کے باہر سے تشریف لائے تھے۔ یعنی مولانا جمال الدین افغانی کلکتہ میں وہ دو یا تین ماہ تک مقیم رہے اور اس تمام عرصہ میں میں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود مجھے فرمایا تھا وہ نسلاً افغانی وطناً مصری اور تعلیماً ترک تھے۔ وہ عربی جانتے تھے۔ فارسی جانتے تھے اور ترکی جانتے تھے۔ شاید سوائے تھوڑی سی فرانسیسی کے وہ کوئی اور یورپین زبان نہیں جانتے تھے۔ باوجود اس کے مجھے ایسے بہت تھوڑے مسلمان یا غیر مسلمان لوگ ملے ہیں جن کا میں اُن سے مقابلہ کر سکوں۔ جب سر الفریڈ اسکاؤن بلنٹ ہندوستان آئے ہیں تو میں اُن سے ملا تھا۔ وہ بھی جمال الدین کے دوست تھے اور میرے یہ دریافت کرنے پر کہ آیا ترکی یا مصر میں اُن جیسے بہت سے لوگ ہیں تو انھوں نے فرمایا کوئی نہیں۔

حضرات! یہ وہ شخص تھا جس نے میری اوائل عمری میں میری توجہ کو اپنی طرف مائل کیا۔ ان کا تصور میرے ذہن میں آج بھی اتنا ہی صاف ہے جتنا کہ ۲۵ سال پہلے تھا۔ وہ سر تا پا مشرقی تھے۔ لیکن وہ تعلیم و تربیت جسے ہم مغرب سے منسوب کرتے ہیں ان میں بدرجہ اولیٰ پائی جاتی تھی۔ اگر ہندوستان اس نمونہ کے چند آدمی پیدا کر سکے تو پھر ہمیں اور کسی چیز کی بہت کم ضرورت باقی رہ جاوے گی۔

عربی و فارسی

آپ قدرتی طور پر سوال کریں گے کہ اس قسم کے سلسلۂ تعلیم میں عربی و فارسی کی کہاں گنجائش ہے۔ جہاں تک فارسی تعلیم کا تعلق ہے بنگال میں سالہائے حال میں یہ میلان رہا ہے کہ اُسے مسلمانوں کی تعلیم سے خارج کر دیا جائے

مجھے ان لوگوں کے ساتھ مطلق کوئی ہمدردی نہیں ہے جو یہ رائے رکھتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانانِ ہند کی تہذیب شاہانِ مغلیہ سے زیادہ تر فارسی کے توسط سے حاصل ہوئی تھی۔ فارسی کی شاعری ہمارے بزرگوں کے لئے تسکین و سرور کا باعث رہی ہے اور ہم میں سے بہت سوں کے لئے اب تک ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ اگر ہم اپنے قدیم ہمسریاں شیخ سعدیؒ، یا لسان الغیب حافظ شیرازیؒ کی پرفیض صحبتوں سے جدا ہو جائیں تو ہم اپنے ذہنی ساز و سامان سے تہی دست اور پُرشوکت طرزِ کلام سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ موجودہ مخصوص ضروریات کے لحاظ سے ہمیں اپنا کچھ نہ کچھ بوجھ ہلکا کرنا اور کچھ قربانی کرنا ناگزیر ہے۔ اور اس کے لئے قدرتی طور پر فارسی پر نظر پڑتی ہے۔ زبان کے متعلق مسلمانانِ بنگال کی دشواریاں خاص ہیں۔ انھیں بنگالی زبان سیکھنی پڑتی ہے کیوں کہ وہ ان کی دیسی زبان ہے اور وہ زبان ہے جو بچپن سے ان کی گوشش زد ہوتی ہے۔ سوائے ان چند زیادہ اہم اور تاریخی شہروں کے جہاں اردو بدستور مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔

اعلیٰ طبقہ کے لوگ اب بھی فارسی کو تربیت اخلاق کے لئے عربی مذہب کی خاطر اور اردو دوسرے صوبوں کے ساتھ تعلقات رکھنے کے لئے تحصیل کرتے ہیں اور چوں کہ ان زبانوں کی تحصیل انگریزوں کی زبان کی تحصیل کے علاوہ ہے جس کا حاصل کرنا لازمی ہے۔ یہ بار تقریباً ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ مسلمان لازمی طور پر ایک مذہبی قوم ہیں بمثل اکثر دوسرے مذہبوں کے ہمارے ہاں کوئی موروثی مذہبی فرقہ نہیں ہے جیسا کہ ایک عرصہ قبل ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانانِ ہند کے متعلق اپنی کتاب میں دکھایا تھا۔ ہر مسلمان بزرگ خاندان اپنے گھر کا مذہبی پیشوا ہوتا ہے۔ جس وقت یہ کتاب لکھی گئی تھی یہ قول بالکل صحیح تھا خود میری یاد کا یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ میں کوئی مسلمان خاندان معزز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جب تک اس کے مرد فارسی نہ جانتے ہوں۔ اور کوئی شخص پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ وہ عربی نہ جانتا ہو۔ اور مذہبی مسائل سے واقف نہ ہو۔ کوئی شخص شریف نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ فارسی نہ جانتا ہو اور اردو میں بات چیت نہ کر سکتا ہو۔ زبانوں کے انتخاب کے متعلق اسی قسم کے خیالات بنگال میں آج کل بھی مروج ہیں۔ ایسے بہت سے مدارس موجود ہیں جو خالص مذہبی تعلیم عربی کے ذریعہ سے دیتے ہیں۔ اور جہاں فارسی کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ تعلیم گاہیں ہمیشہ طالب علموں سے پُر رہتی ہیں اور ان کی ہر دل عزیزی بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے

کہ ان تعلیم گاہوں سے جو مولوی نکلتے ہیں وہ نہایت تنگ دل اور متعصب ہوتے ہیں اور قوم کے لئے کچھ مفید نہیں ہوتے۔ ان نقائص کو دور کرنے کے لئے اور عربی کی تحصیل کے متعلق جو حقیقی خواہشیں ہیں اُسے پورا کرنے کے لئے اور عربی کے ذریعہ سے علوم اسلامیہ کی مختلف شاخوں میں درس حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ سلسلہ تعلیم کو ترمیم کیا جائے۔ دنیوی اور مذہبی تعلیم کے متضاد مطالبات کو پورا کرنے کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام تجویز کیا گیا تھا۔ علوم مشرقیہ کے مدارس کی اصلاح ہو گئی ہے اور انگریزی بطور ایک لازمی زبان کے داخل کر دی گئی ہے۔ فارسی کی تعلیم کم ہو گئی ہے اور منطق اور دیگر مضامین کی تعلیم میں بھی اصلاح ہوئی ہے اور تفسیر و حدیث کی تعلیم کی جانب بھی زیادہ توجہ کی گئی ہے۔

شعبہ علوم اسلامیہ مشرقی علوم کے مدارس کا یہ ترمیم شدہ نصاب شعبہ علوم اسلامیہ کی بنیاد قرار پایا۔ یونیورسٹی کی جدید اسکیم میں یہ تجویز ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایسی تعلیم کا بندوبست کیا جائے جو انگریزی کی پوری تعلیم کے علاوہ جس سے اتنی لیاقت حاصل ہو سکے جتنی کہ معمولی گریجویٹوں کو ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ ہی ان کو اتنا علم اور حاصل ہو جائے کہ ان کی مذہبی ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ ایک وسیع پیمانہ کی کوشش ہے جو عنقریب پوری ہو گی۔ جیسا کہ آپ کو پیشتر بتا چکا ہوں اس کے متعلق مسودہ قانون امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے اور بلا شبہ اس کا نفع کل مسلمانان ہند کو حاصل ہو گا۔ البتہ میرے دل میں ایک یہ شبہ ہے کہ یہ نصاب محض فنون کا ہو گا۔ اور آیا اس زمانہ میں کوئی تعلیم مکمل خیال کی جا سکتی ہے تاوقتیکہ کچھ نہ کچھ تعلیم سائنس کی اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ اگر اردو کی بنیاد تعلیم قرار دینے کے متعلق میری تجویز قبول کر لی جائے اور اگر فی الحال ہم انگریزی کی تعلیم پر صرف اس قدر اصرار کریں جو اس زمانہ کی ضروریات کے لئے بالکل ہی ناگزیر ہو تو موجودہ بار بہت کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اور جس قسم کی تعلیم کے مسلمان خواہش مند ہیں وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ مگر میرے اس بیان سے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ عربی اور اس کے ذریعہ سے علوم اسلامیہ کی تعلیم ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے لئے ضروری قرار دے دی جائے۔ یا یہ کہ آگے چل کر اس سے کوئی نفع مترتب ہو سکتا ہے۔ مثل دوسرے شعبہ ہائے زندگی

کے تعلیم میں بھی تقسیم کار ممکن ہے۔ خواہ ہم کتنا ہی کیوں نہ چاہیں ہم اپنے گرد وپیش نیا عرب پیدا نہیں کر سکتے۔

تمام دنیا میں تعلیم بجائے مذہبی کے محض ایک دنیوی تعلیم سمجھی جاتی ہے اور ہم مذہب کی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتے تاوقتیکہ کچھ قربانیاں نہ کریں جن کے بغیر کسی ترقی کن جماعت کو چارہ نہیں ہے۔ ہمیں مولویوں اور مفتیوں کی ہزاروں کی تعداد میں ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمیں ان کی ایک محدود تعداد درکار ہے تاکہ اس ملک میں ہمارے قدیم علوم وفنون کی مشعل روشن رہے جس طرح کہ زرتشتی اپنے متدروں میں اپنی مقدس آگ کو روشن رکھتے ہیں۔ ہر مسلمان کو معلوم رہنا چاہیے کہ اس کے مذہبی فرائض کیا ہیں۔ نیز اسے اپنے مذہبی ارکان سے واقف ہونا چاہیئے۔ ہمارا مذہب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔

تعلیم مشرقی اور سفارشات کمیشن

میں اپنی اسپیچ کے اس حصہ کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی سفارشات پر بلا لحاظ کئے جو اس بارہ میں ہوئی ہیں ختم نہیں کر سکتا۔ ان سفارشات میں تحریر ہے کہ باقاعدہ ترقی اور تحریص مشرقی علوم میں عمل میں لانا ایک نہایت قدرتی اور ضروری فرائض میں سے مشرقی یونیورسٹی کی ہے۔ لیکن یہ فرض اب تک اطمینانی طریقہ سے انجام نہیں دیا گیا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اب تک یونیورسٹی کے کام کا خاص منشا مغربی تعلیم میں ترقی دینا رہا اور کچھ اس وجہ سے کہ اس طریقہ کا یہ مقصد رہا کہ یونیورسٹی اور اس کے کالجوں میں تعلیم مغربی طریقہ پر خیالی طور سے ہو پُر اسے دیسی طریقہ پر تعلیم ٹول (یعنی سنسکرت کے مدرسوں میں) اور اسلامی مدارس کے طرز پر دی جاوے سنسکرت اور اسلامی مدارس کی تاریخ اور ان کے تعلقات مغربی طریقہ کی تعلیم کے ساتھ نہایت پیچیدہ اور دشوار امور ہیں جن کی پوری تحقیق باب ۱۶ میں دی ہے۔ الغرض مدارس سنسکرت اور اسلامی مدارس میں بیشتر محض دیسی طریقہ پر تعلیم دی جاتی ہے۔ یونیورسٹی اور اس کے کالجوں کی جانب سے جو کوشش مغربی طریقہ پر تعلیم دینے کی رکھی وہ غیر قابل اطمینان ثابت ہوئی ایک نہایت مادی ترقی گزشتہ چند سالوں میں ان مضامین کی اعلیٰ شاخوں میں خاص کر سنسکرت اور قدیم ہندوستانی تاریخ میں ہوئی لیکن کالجوں کی کارروائی اور تعلیم جو کثیر طلبا کو دی گئی ہنوز قابل اطمینان نہ ہو سکی"۔

باایں ہمہ باوجود گورنمنٹ کی تاکید کے مکالے کے زمانہ سے اگرچہ دیسی زبان کو ترقی اور سنجیدہ تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا لیکن مادری زبان کی تعلیم پر کچھ توجہ مدارس اور کالجوں اور

یونیورسٹی میں نہ ہوئی۔"

"دیسی علوم پر طلباء کو پوری توجہ دلائی گئی جس کے نتائج خوش گوار نہ ہوئے۔ طلباء میں دماغی ترقی نہ ہو سکی۔ ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے۔"

"(الف) محض مشرقی اور دیسی تعلیم سنسکرت کالج اور مدارس اسلامیہ میں دی جاوے۔ لیکن بالکل پُرانے طریقہ پر نہ ہو تو یونیورسٹی براہ راست اس تعلیم میں کچھ مداخلت کرے وہ بالکل جُداگانہ طریقہ پر دی جاوے۔"

"(ب) مشرقی علوم اور دیسی زبان کی ترقی میں باقاعدہ طریقہ سے موجودہ حالت سے زیادہ کوشش کی جاوے اور اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے یونیورسٹی کے طلبا سنسکرت کالج کے مشہور پنڈتوں اور اسلامی مدرسوں کے اعلیٰ مولوی کے نزدیک بھیجے جاویں کہ جہاں تک وہ ان کی تعلیمی امداد کر سکتے ہوں ان کو امداد دیں۔ کچھ انتظام اس لئے ضروری ہے جس کے ذریعہ سے مشرقی علوم کی تعلیم گاہیں اگرچہ وہ علیحدہ رہیں گی نہ ان میں کچھ مداخلت ہوگی ان کی یونیورسٹیوں سے تعلقات قائم کئے جاویں۔ نیز یونیورسٹیوں میں مشرقی تعلیم حال کے طریقہ پر دی جاوے۔ اس قسم کا انتظام ممکن ہے اگرچہ موجودہ اختلافی طریقہ کی وجہ سے اسلامی تعلیم اور سنسکرت کی تعلیم میں کچھ جداگانہ انتظام کرنا ہوگا۔"

جو کچھ کہ مسلمانوں کی عربی کی تعلیم کے متعلق میں نے کہا ہے ممکن ہے آپ صاحبوں میں بہت سے حضرات پسند نہ کریں لیکن حضرات میں نے ۱۵۰۰ میل کا یہ سفر محض آپ کے خوش کرنے کو نہیں کیا ہے۔ لیکن آپ سے ایمان داری اور سچائی سے عرض کرتا ہوں کہ جو میری رائے میں مناسب اور سودمند طریقہ قابلِ اختیار ہے وہ عرض کیا ہے۔

کمیشن نے اپنی سفارشات کرنے میں قدرتی طور پر اس مسئلہ پر دوسرے پہلو سے نظر ڈالی ہے۔ لیکن میں عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ کمیشن نے اس معاملہ پر عالمانہ نظر ڈالی ہے اور اس کی سفارشات حقیقتاً ایسی خواہش کی بنا پر ہیں جس سے مجموعی طور پر اس ملک کے لوگوں کا فائدہ ہو۔

تعلیم نسواں

میں نے آپ صاحبان کے روبرو اپنا منشا متعلق تعلیم مسلمانان پیش کیا ہے میں نے ظاہر کیا ہے کہ بہت زیادہ علمی دشواریاں ہیں جن کو دور کرنا ہوگا۔ قبل اس کے کہ اس مقصد کی تکمیل ہو لیکن یہ دشواریاں تعلیم نسواں میں حائل نہیں ہیں۔

نہایت مضرت رساں غلط فہمی مسلمانوں میں تعلیم نسواں کے متعلق ہے۔ میں اُس کی تردید کا دعوے کرتا ہوں اور اس کے لئے تیار رہوں کہ ہندوستان میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے

آمادہ اور اس کی جویاں نہ ہو، لیکن ایسی تعلیم مکانوں پر دی جاتی تھی۔ آپ کو مشکل سے کوئی معزز مسلمان خاندان ایسا ملے گا جس میں لڑکیوں کو ابتدا سے قرآن پاک کی تعلیم اور اردو کی سہل مذہبی کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہوں۔ اب جو کچھ ہمیں ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جو لڑکیوں کو تعلیم پانچ صدیوں سے دینے کے عادی ہو رہے ہیں اس کے معیار میں ترقی کی جائے۔ دستور میں صرف یہ تبدیلی موجودہ زمانہ کے مطابق چاہیئے کہ وہ تعلیم بجائے گھروں کے لڑکیوں کو مدارس میں دی جائے۔ وہاں وہ جدت حاصل کر سکیں ہمیں صرف یہ چاہیئے کہ حال کے طریقوں سے آسانی کے ساتھ ان کو تعلیم دیں قوم نے اب تک تعلیم نسواں کی جانب سے بے توجہی ظاہر کی اول تو بیشتر اس وجہ سے کہ پرجوش لوگوں نے اپنی تیزی طبع میں عورتوں کو مردوں کے مساوی بنانا چاہا انھیں اس امر کا خیال نہ رہا کہ برٹش انڈیا میں عورتوں اور مردوں کی ضرورت بالکل جدا گانہ ہیں۔ بہت لوگوں نے اس امر پر اصرار کیا کہ لڑکیوں کے مدارس میں تعلیم بالکل لڑکوں کے مدارس کے طور پر دی جائے۔ سرکاری مدارس میں لڑکیاں میٹریکولیشن کے امتحانات کی تیاری کرتی ہیں اور اسی طرح کالجوں میں یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات کے واسطے تیار کی جاتی ہیں یہ میرے نزدیک صریح غلطی ہے۔

پردہ کے موید وں کو اس طور پر یہ خیال ہوا کہ یہ تحریک پردہ کے دور کرنے کی غرض سے ہے اور اس وجہ سے عام طور پر ایک اشتباہ پیدا ہو گیا۔ اس شک کو دور کرنا چاہیئے اور لڑکیوں کی تعلیم کا ایک ایسا طریقہ رکھا جاوے جو موجودہ پرانے خیال سے بہت کم خلاف ہو اور آپ دیکھیں گے کہ بہت زیادہ مسلمان لڑکیاں زیر تعلیم بمقابلہ دیگر اقوام کے ہوں گی۔ مدرسے لڑکیوں سے بھر جائیں گے اور پرجوش لوگوں کی خواہشات سے کہیں زیادہ ترقی ہوگی۔ ہندوستان میں ابھی وہ وقت بہت دور ہے جب ہماری مستورات سرکاری ملازمت اور اُن سرکاری خدمات کی ادائیگی میں مردوں سے مقابلہ کریں گی جو دنیا کے اکثر مقامات میں مردوں کا حصہ جائز طور پر سمجھا جاتا ہے۔

ہم اپنی عورتوں کو اب تک گھر کی ملکہ بناتا اور عمدہ اور روشن خیال مائیں اور بیبیاں بنانا چاہتے ہیں۔ مرد محنت کر کر اپنے اور اپنی مستورات کے واسطے روپے کماتے ہیں اور عورتوں کو سخت اور محنت کے کام سے بچاتے ہیں۔ مرد عورتوں کے واسطے خدمت گھر سے باہر کرتے ہیں اور عورتیں گھر میں خدمت مردوں کے واسطے کرتی ہیں۔ یہ ایک عمدہ تبادلہ جانبین سے ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مرد خود غرض ہیں کوئی شخص اس محنتی مرد پر الزام نہیں دے سکتا۔ جب وہ دن بھر کی محنت کے بعد گھر کو لوٹتا ہے اور وہ اپنی بیوی سے یہ توقع کرے کہ جو کچھ گھر میں اس کو وہ آرام

پہونچا سکتی ہے ۔ پہنچائے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بہت زیادہ فرق مرد عورت کی تعلیم میں نہ ہو۔ ہر ملک میں مردوں کی تعلیم عورتوں سے بہت زیادہ ہے۔ عورتوں کی موجودہ تعلیم سے سو گنی زیادہ تعلیم اور دماغی ترقی ہوتی قبل اس کے کہ وہ مردوں پر سبقت لے جائیں لیکن ایسا حصول اُن کے واسطے دشوار نہیں، لیکن دشواری جو کچھ ہے وہ ہماری ہی پیدا کی ہوئی ہے۔

انگریزی پڑھنے پر اصرار ہماری مستورات کی جانب سے ناقص العقل ہے۔ یہ ان مردوں کی غلط فہمی کی بناء پر ہے جنھوں نے خاص مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور جن کا خیال ہے کہ عورتیں ان کی معاون اور ہم پلہ تعلیم میں ہوں اور بالکل اُسی قسم کی تعلیم حاصل کریں جیسی انھوں نے حاصل کی ہے۔

ہمیں اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ محض مثل غیر تعلیم یافتہ مردوں کے نہ تصور کی جائیں بلکہ اس کا استثنیٰ بھی ہوسکتی ہیں۔ میں انگریزی کو بالکل علیحدہ عورتوں کے تعلیمی پروگرام (تجویز) سے کم از کم ابتدائی زمانہ کے مابین رکھوں گا۔ ہر مسلمان لڑکی کو تعلیم اُردو میں سائنس اور ادب کی دی جائے اور اس طریقہ سے اُس پر سے بار نہایت کم ہوجاوے گا اور تقریباً نصف زمانہ میں مثل مردوں کے وہ قوت علمی حاصل کرسکیں گی۔ ایسا کرنے سے عام طور پر مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا شوق پیدا ہوگا اور اس ہر دل عزیزی میں اور زیادہ ترقی ہوگی اگر ہم مذہبی تعلیم ابھی اس تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیں گے۔

علاوہ اُن فوائد کے جن کا ابھی میں نے تذکرہ کیا ہے اس طریقہ کے استعمال سے وہ خطرہ جس کا اندیشہ ہے رفع ہوجاوے گا۔ میں نے ایسے ہندوستانی خاندان دیکھے ہیں جن میں لوگ انگلستان سے تعلیم حاصل کرکر واپس آئے ہیں اور اپنی بیبیوں اور بچوں سے اُن کا اصرار ہے کہ گھر پر بھی انگریزی میں بات چیت کریں اور خود اُن سے ٹوٹی پھوٹی اُردو مثل یورپین صاحب کے بول کر خوش ہوتے ہیں یہ یعنی قومی حقوق کے نقصان کا راستہ ہے اور مجھے الفاظ نہیں ملتے جن کے ذریعہ سے میں اس خیال کی جس سے یہ عمل ظہور پذیر ہوتا ہے مذمت کروں۔ اگر ہماری دیسی زبان کا ادب ناکافی ہے یا اس میں الفاظ کم ہیں جو بالآخر مجھے تسلیم نہیں تاہم ہمیں اپنی زبان کو ترقی دینا چاہیئے۔

میری رائے میں اگر کسی مسلمان تعلیم یافتہ شخص کو دشواری اپنے اظہار خیالات میں اردو میں پیدا ہو تو یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اُس زبان میں اتنی قوت نہیں کہ اُس کے ذریعہ سے

وہ اظہار خیالات کرسکے لیکن یہ کلیتاً اس وجہ سے ہے کہ یہ خراب عادت ہو جاتی ہے کہ بلا ضرورت انگریزی الفاظ دیسی زبان میں استعمال کئے جاتے ہیں ہم نہ صرف انگریزی الفاظ بولتے ہی ہیں بلکہ خیالات بھی انگریزی زبان میں قایم کرتے ہیں اور یہ تمام باتیں بر بنائے عادت ہیں اور اس وقت تک باقی رہیں گی جب تک پوری کوشش ہم اس عادت کو ترک کرنے کی نہ کریں گے۔ اس لئے میں اپنے مسلمان بھائیوں سے استدعا کرتا ہوں کہ ہر مقام پر لڑکوں کے مدارس اُس نمونہ پر جیسا میں نے بیان کیا ہے جاری کریں۔ ابتدائی تعلیم کے واسطے اس قسم کی کتابیں موجود ملیں گی اُس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کتابوں کے ترجمہ کرانا چاہئیں تعلیم کی دشواری جب رفع ہو جاوے گی تو علم جو حاصل ہوگا وہ حیرت انگیز ہوگا اور مزید شوق علم کا پیدا ہوگا۔ غالباً آیندہ تعلیم پانے پر لڑکی کی خواہش اپنے علم کو ترقی دینے اور دوسری زبان انگریزی، فارسی یا عربی سیکھنے کی ہوگی اس کو آسانی حصول علوم میں پہنچانا چاہئے۔ دیسی زبان کے عمدہ طور پر سیکھنے کی بابت اور اُس کی اہمیت پر وقتاً فوقتاً زور دیا گیا ہے ۱۸۳۵ء میں جنرل کمیٹی تعلیم کلکتہ نے تحریر کیا ہے کہ ہم کو دیسی زبانوں کو ترقی دینے کی اہمیت پورے طور پر معلوم ہے۔

ہم کو ایک دیسی علم ادب تیار کرنے کا خیال ہے اور اس منشاء کے پورا کرنے کے واسطے ہم کو تمام کوششیں اس بارہ میں کرنا چاہئیں اسی سال میں میکالے نے اپنی مشہور تجویز میں لکھا ہے کہ ہم کو نہایت کوشش ایک ایسے گروہ کے بنانے میں کرنا چاہئے جو ترجمہ کرنے والے ہمارے اور ان لاکھوں لوگوں کے درمیان ہوں جن پر ہم حکومت کرتے ہیں اس گروہ کے متعلق دیسی زبان کو ترقی دینا ہم قرار دیں گے کہ اس زبان میں اصطلاحات سائنس مغربی ناموں سے پہنچائیں کہ بتدریج ان کے ذریعہ سے علم کثیر تعداد آبادی کو حاصل ہو سکے۔

۲۴۔ سر چارلس ٹری ویلیان نے اپنی کتاب ایجوکیشن ان انڈیا (تعلیم ہند) میں لکھا ہے۔ ہمارا خاص منشاء ایک ایسے طبقہ کے لوگوں کو تیار کرتا ہے جو یورپ کے علم کو ایشیا کے لوگوں کو اپنی زبان میں سکھائیں ان خیالات کا اظہار ۱۸۵۴ء کی بڑی مراسلت میں اس طور پر کیا گیا ہے کہ انگریزی زبان جہاں ضرورت ہو سکھائی جاوے لیکن ایسی تعلیم کے ساتھ پوری توجہ سے ضلع کی دیسی زبان بھی سکھائی جاوے۔ چوں کہ اہمیت دیسی زبانوں کی پسندیدہ ہے ہندوستان کے دیسی ادب میں رفتہ رفتہ ترجمہ یورپین کتابوں کے مضامین ان لوگوں کے جو یورپین خیالات سے ماہر ہوں اضافہ ہو جائیں گے۔ اس طور پر مغربی علوم رفتہ رفتہ ہر طبقہ کے لوگوں کو حاصل ہو سکیں گے۔

بجویز تعلیم (متعلق ملحقہ مدارس وغیرہ) میں یہ قرار دینا چاہیئے کہ انگلو ورنیکولر (انگریزی دیسی) کالجوں میں دیسی زبان توجہ کے ساتھ سکھائی جاوے اور مشرقی کالجوں میں انگریزی اور دیسی زبانوں کی تعلیم کافی طور پر دی جاوے تاکہ ہر زبان کی تعلیم سے پورا فائدہ پہنچ سکے۔ اور مغربی علم ہر شخص کو حاصل ہوسکے اور یہی خاص منشا تعلیم کا ہندوستان میں ہے۔ ان تحریرات کے حوالہ کے بعد یونیورسٹی کمیشن نے لکھا ہے۔

کہ پالیسی جو مندرجۂ بالا تحریرات میں ظاہر کی گئی ہے اُس کی شرائط بالکل مبہم ہیں اس پالیسی کے ذریعہ سے ہندوستان میں مغربی و مشرقی تہذیب کا دوستانہ الحاق ہونا چاہیئے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے فیاضانہ پالیسی اولوالعزمی سے ظاہر کردی لیکن دیسی زبانوں کے حقوق کا مناسب لحاظ کیا گیا۔ دراصل کلکتہ یونیورسٹی میں نتیجہ خیز کوششیں حال میں دیسی زبانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق کی گئیں اُن زبانوں کے دعاوی کا لحاظ کیا گیا جو ایک یا دل ناخواستہ رضامندی کی جاسکتی ہے۔

ابتدائی تعلیم

دو اہم مسائل کے ذکر کے بعد (یعنی ہمارا معیار تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کا) میں مختصراً ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کا ذکر کرتا ہوں اگرچہ آپ کو مردم شماری کے اعداد سے ظاہر ہوگا کہ عام تناسب تعلیم کا ہندوستان میں ۵،۹ فی صدی ہے اور تناسب مسلمانوں کا ۳،۸ فی صدی ہوتا ہے۔ ان اعداد سے ہماری پستی بلحاظ دیگر اقوام کے ظاہر ہوتی ہے۔

ساتویں پنج سالہ رپورٹ متعلق ترقی تعلیم ہندوستان من ابتدائے ۱۹۱۲ء لغایتہ ۱۹۱۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف صوبہ متحدہ و مدراس اور سنٹرل پراونسیز اور برار میں مسلمان زائد یا مساوی ہنود سے تناسب تعلیم میں ہیں اور یہی حالت بمبئی کے سوائے سندھ کے ہے۔ عالم لوگوں کی جماعت اس تعداد میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے یہ ہمارے واسطے ضروری ہو کہ ان کی تعلیم کی فکر کریں جو بالعموم پرائمری مدارس میں اُن کو دی جاسکتی ہو۔ فی صدی تعداد مسلمانوں کی کل اقوام کے طلباء کی تعداد کے لحاظ سے پرائمری مدارس میں جیسی کہ رپورٹ محولہ میں درج ہے ۱۹۱۷ء میں ۲۲،۵ اور ۱۹۱۲ء میں ۲۰،۵ اور ۱۹۰۷ء میں ۲۰،۰ تھی۔ یاد رکھو کہ ہماری تعداد ۲۲،۷ فی صدی کل ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے ہم بہت خفیف کم تعلیم میں بلحاظ دیگر اقوام کے ہیں۔ ہماری پستی بہت زیادہ تعلیم کی دوسری شاخوں میں ہے۔ ان پانچ سالوں میں ترقی بہت اچھی ہوئی۔ جہاں تک پرائمری تعلیم کا تعلق ہے مسلمانوں کا اوسط دوسری اقوام کے مطابق

ہونا چاہیئے اور اس کے خلاف کوشش کرنا میرے نزدیک بیکار ہے۔ جہاں کہیں بہت زیادہ تعداد مدرسہ جانے والے لوگوں کی مسلمان ہے ہم اصرار کر سکتے ہیں کہ قرآن شریف کی تعلیم بھی شامل کی جاوے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کے ملا مدارس اور مکاتب میں بنگال مشرقی بنگال اور ہندوستان کے دیگر حصص میں ایسا عمل درآمد ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم سے لوگوں کو بہت رغبت ہوگی اور ان ابتدائی مدارس میں بہت زیادہ تعداد میں مسلمان بچے داخل ہو جاویں گے۔

مفت جبریہ تعلیم

ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ مفت جبریہ تعلیم کے معاملہ پر غور کیا جائے۔ ایک امر ظاہر ہے کہ ابتدائی تعلیم جبریہ نہیں قرار دی جاسکتی جب تک اس کو مفت نہ قرار دیا جاوے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جبریہ تعلیم کا مسئلہ ۸ سال قبل اس نہایت لائق اور روشن خیال ہندوستانی مدبر نے اُٹھایا تھا جن کی دوستی کا فخر مجھے حاصل تھا یعنی مسٹر گوکھلے۔ اس وقت ہم دونوں ممبر سپریم لیجیسلیٹیو کونسل کے تھے مسٹر گوکھلے کی تجویز کہ ابتدائی تعلیم مفت اور جبریہ کر دی جاوے اُس سے بہت اختلاف کیا گیا اور مجھے افسوس ہے کہ اختلافی جانب میں بھی تھا۔ اس وقت یہ تجویز خارج کر دی گئی۔ یہ سوال جو زیر بحث ہے آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۹۱۱ء میں ناگپور میں ہوا اور مجھے افسوس ہے کہ وہاں بھی اپنے اختلاف پر میں قایم رہا۔ زمانہ تبدیل ہوتا ہے اور اسی طرح میرے خیالات بھی بدل گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائی تعلیم بمبئی پریزیڈنسی میں حدود میونسپل میں جبریہ کر دی گئی۔ بنگال میں بمبئی کی پیروی کی گئی۔ اور اب ہماری پراونشل انسٹی ٹیوٹ بک میں بنگال پرائمری ایجوکیشن ایکٹ ۱۹۱۹ء درج ہے جس کے بموجب لوکل گورنمنٹ کو میونسپلٹی کی حالت اور آمدنی پر غور کرنے کے بعد اختیار ہے کہ کمشنران کو ہدایت کریں کہ ان بچوں کے واسطے جن کی عمر ۶ سال سے کم اور ۱۱ سال سے زائد نہ ہو مدرسہ اور عملہ اور دیگر سامان کا انتظام کریں اور بعد منظوری لوکل گورنمنٹ ایسے بچوں کو حاضری لازمی کر دی جائے گی جہاں کہ ابتدائی تعلیم کسی میونسپلٹی میں جبریہ یا لازمی کر دی گئی ہے تو کوئی ولی بچے کا اگر بغیر معقول وجہ کے بچہ کو مدرسہ نہ بھیجے گا تو اُس پر پانچ روپیہ جرمانہ ہوگا اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ سزائیں پریشان کن طریقہ سے نہ دی جاویں۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس قسم کا قانون ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی جاری ہوگا۔ اور اپنے مسلمان بھائیوں کو نہایت مضبوطی سے مشورہ دیتا ہوں کہ اس بارہ میں حارج نہ ہوں۔ یہ ایک پسندیدہ دلیل اس

امر میں اختلاف کرنے والوں کی جانب سے ہے کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور جب لڑکا خواندہ ہو جائے گا تو اپنے باپ کے پیشہ کو حقارت سے دیکھے گا اور ہل کو چھوڑ کر قلم ہاتھ میں لے گا۔ یہ حالت اس وقت تک رہے گی جب کہ تناسب تعلیم کا ۵٫۰ فی صدی ہے۔ جب تعداد میں افزونی ہو جاوے گی تو یہ خیالات باقی نہ رہیں گے۔ کاشتکاروں اور کاریگروں کے لڑکے اپنا کام زیادہ عمدہ طرح کر سکیں گے۔ اگر کچھ خواندہ ہو جاویں گے اور کچھ حساب بھی سیکھ لیں گے۔ میں اُس وقت کا منتظر ہوں جب کاشتکاروں کے لڑکوں کے ہاتھ میں ہل اور ایک میں اخبار ہو۔ صنعتی اور حرفتی تعلیم کی بابت ابھی اس قدر کہا گیا ہے کہ میں اس بارہ میں اور کسی مفید امر کا اضافہ نہ کر سکوں گا۔

پستی اعلیٰ تعلیم میں

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں ہم نہایت مضرت رساں حالت میں ہیں۔ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہو گا کہ کس قدر مسلمان فی صدی بلحاظ کل دیگر اقوام پائے گئے۔

	سنہ ۱۹۰۷ء	سنہ ۱۹۱۲ء	سنہ ۱۹۱۶ء
کالج تعلیم یونیورسٹی	۸٫۱	۱۰٫۴	۱۰٫۴
کالج تعلیم پیشہ جات	۷٫۵	۱۰٫۰	۱۰٫۰
سکنڈری مدارس	۱۴٫۰	۹٫۰	۱۸٫۶
مڈل ورنیکیولر	۱۶٫۸	۱۷٫۰	۱۵٫۳
اسپیشل اسکول	۴۲٫۱	۶۶٫۲	۴۵٫۵

اس معاملہ کے متعلق مجھے زائد تحریر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ کافی طور پر آنریبل مسٹر اسد علی خاں نے اپنی پریسیڈنشیل اسپیچ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی

اعلےٰ تعلیم کے سلسلہ میں مجھے یاد آگیا کہ علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی قایم کرنے کی تجویز ہے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جو آپ صاحبوں کے دل میں سب سے بالاتر ہو گا۔ یونیورسٹی قایم کرنے کا خیال بہت برسوں پیشتر ہوا تھا۔ ہز ہائینس آغا خاں نے بہت زیادہ عملی حصّہ روپیہ جمع کرنے میں لیا تھا۔ ہمارے ہندو بھائی اس دوڑ میں ہم سے آگے نکل گئے۔ ہم نے گورنمنٹ سے استدعا اپنی تجویز کی بابت اس سے قبل کی تھی کہ ہندو یونیورسٹی بنارس میں قایم کرنے کا خیال بھی مکمّل شکل میں نہ ہوا تھا۔ میں اُس وقت مباحثہ میں شملہ میں سر ہارکورٹ بٹلر

کے روبرو جن کے تعلق اس زمانہ میں تعلیم کا کام تھا موجود تھا اور مجھے یاد ہے کہ نہایت ہمدردانہ
خیال سے انھوں نے اس معاملہ پر توجہ کی تھی۔ کچھ اختلافات پیدا ہوئے۔ مگر میں ان کو ایسا اہم
نہیں سمجھتا کہ جن کی بنا پر یونیورسٹی کے خیال کا بالکل التوا درست سمجھا جاوے۔ ہمیں اُن اختیارات
اور حقوق پر قناعت کرنا چاہیئے جو ہندو یونیورسٹی کو عطا ہوئے ہیں۔ صرف اس قدر تبدیلیاں کر لینا
چاہئیں جو ہمارے موجودہ ضروریات کے مناسب ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میں سے ہر
ایک جہاں تک ممکن ہو اس امر پر زور دے کہ جلد یونیورسٹی قایم ہو جائے۔
محمدن یونیورسٹی میں موجودہ طریقہ اعلیٰ تعلیم کے تبدیل کرنے کا موقعہ حاصل ہوگا کہ اپنی خاص
قومی ضرورت کے لحاظ سے اس کو جاری کریں اور اس طور پر اعلیٰ تعلیم قوم میں زیادہ رائج ہوسکیگی
مایوسی کی حالت میں دل مردہ ہو جاتا ہے اور بہت کم مسلمانان ہندوستان میں ایسے ہوں گے جو
اس توقف کو جو یونیورسٹی قایم ہونے میں ہو ناپسند کرتے ہوں۔

حالت تعلیم سندھ

حضرات سندھ میں آپ صاحبان کو ان اہم تدابیر کے متعلق جو آپ
کے صوبہ میں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی بابت منجانب گورنمنٹ عمل میں
لائی گئی ہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ تمام اہم سوالات آپ کی تعلیم کے متعلق پورے طور پر آپ کی
قایم مقام کمیٹی کی جانب سے پیش کئے گئے ہیں جس میں آپ کے مشاہیر شریک تھے سفارشات
جو کی گئی تھیں وہ مدات ذیل پر منقسم ہیں۔

(۱) پرائمری ایجوکیشن (ابتدائی تعلیم)
(۲) سکنڈری ایجوکیشن (ثانوی تعلیم)
(۳) صنعت و فنون کی تعلیم
(۴) تعلیم نسواں
(۵) متفرق

بذریعہ رزولیوشن مورخہ ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء گورنمنٹ بمبئی نے کمیٹی سفارشات چند استثنیات
اور محفوظی اختیارات کے ساتھ اول مدات مندرجہ بالا کی بابت منظور کر لیں صنعتی اور تعلیم نسواں
کے متعلق گورنمنٹ کا منشا نہیں کہ ان مسائل کو بالکل اسلامی نظر سے تجویز کرے۔ تاہم ہر شخص اس
بات کو پسند کرے گا کہ گورنمنٹ بمبئی نے اس معاملہ پر ایسی توجہ کی ہے۔ آپ لوگوں کو استفادہ
اس صوبہ میں کثیر تعداد ہونے کا ہے اور کوئی مشترکہ استدعا جو آپ کی جانب سے ہوگی لازمی ہو کہ

کہ اُس پر مناسب توجہ کی جاوے۔ مجھے اگرچہ اس امر کی ضرورت نہیں کہ میں اس معاملہ کی تشریحات کا تذکرہ کروں۔ کیوں کہ اس بارہ میں آپ خود مجھ سے زاید واقفیت رکھتے ہیں۔ تمام واقعات سندھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے مفصل طور پر آنریبل مسٹر بھرگری کی ابتدائی تقریر میں جو سیس پل کے متعلق بھی درج ہیں۔

حضرات میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے عرب فاتح نے آپ ہی کی زمین میں قدم رکھا تھا۔ اس اپنی پورانی عظمت کو قایم رکھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ میں سے اکثر سرجان جنکسن کے نام سے واقف ہوں گے وہ نہایت دوست مسلمانوں کے اور خاص کر سندھ کے لوگوں کے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میری گفتگو ہوئی تھی اُسی وقت سے مجھے آپ کے صوبہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں سندھ کے مسلمانوں کو پسند کرتا ہوں وہ نہایت بہادر اور اپنے اور دوسروں کے فرائض سمجھتے ہیں ان کا طرز معاشرت پسندیدہ ہوتا ہے۔ ایک سندھی باپ اپنے بیٹے کو اس سے زیادہ سخت ملامت ضروری نہیں سمجھتا جب وہ بیٹے سے کہتا ہے تم بڑے بے ادب ہو۔

انتظام اوقاف

مناسب انتظام اوقاف کا ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق ہر صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیم سے ہے۔ بدانتظامی ان اوقاف کی نہایت نا پسندیدہ ہے۔ یہ آپ صاحبان کا فرض ہے کہ جدید مسودہ قانون جو گورنمنٹ ہند نے بغرض درستی انتظام اوقاف ہذا جاری کیا ہے اس کے مضامین پر غور کریں۔ مگر یہ افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس مسئلہ پر فروری سے توجہ کی گئی ہے۔ جو شئے ایک سے دینے کا ادعا کیا جاتا ہے وہ دوسرے سے لی جاتی ہے۔ میری رائے میں مضبوط طریقہ سے عذرداری مسلمان اس مسودہ قانون کی دفعات کی بابتہ کریں اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر آپ جائز طور پر توجہ کر سکتے ہیں۔

حضرات تعلیم کے مضمون پر گھنٹوں گفتگو کی جا سکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے صبر کی بھی کچھ انتہا ہونا چاہیئے اور مجھے خیال ہے کہ میری جانب سے آپ کی زائد مزاحمت مناسب نہ ہوگی۔

شب بپایاں رسید قصہ دراز

زمانہ کی رفتار بدل رہی ہے۔ اضطراب پھیل رہا ہے۔ خفتہ مشرق مادی مغرب سے مقابلہ کی تیاری کر رہا ہے اور اس کا مقصد ہے کہ مغرب سے مساوات پیشہ و تجارت و حرفت کے میدانوں میں ظاہر کرے اس مقابلہ کے واسطے کبھی اس سے بہتر موقعہ ہاتھ میں نہیں آسکتا۔ کوئی چیز سوائے جدید تعلیم کے

ہم کو اصلی ترقی کے راستہ میں نہیں پہونچا سکتی۔ ہم نے بہت کچھ نقصان بہت سوچنے اور کم کام کرنے سے اٹھایا۔ یہ بیکار ہے کہ ہم اپنا وقت گذشتہ شوکت کو یاد کر کر ضائع کریں نہ ہمیں مستقل طور پر مایوسانہ نظر ڈالنی چاہیئے۔ موجودہ وقت میں کام کئے جاؤ اور اُس پر بھروسہ رکھو کہ ہمارا خدائے تعالےٰ ہماری دست گیری کرے گا۔ یہی تعلیم ایک بڑے انگریز شاعر اور ایک بڑے پرانے ایرانی شاعر کی ہے ؎

نیست ز آئندہ خبر، و ز دم رفتہ حاصلے
حاصل وقت را نگر تا دم رفتہ ننگری

ہم سب کو ایک دل ہونا چاہیئے اور ایک خواہش سے اپنے مقصد کے واسطے قدم بڑھانا چاہیئے اور گزشتہ اور آئندہ کے حالات پر نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر ہماری دشواریاں اس طور پر زیادہ ہو جاویں تو ہم کو اُنھیں اس طرح مغلوب کرنا چاہیئے جیسے ایک اسپارٹن ماں عمل کرتی ہے یعنی نہایت استقلال اور مستعدی اور تدبیر کو کام میں لانا چاہیئے۔

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

آپ کی کوشش میں میری خالص دعائیں شامل ہوں گی۔ خدا حافظ!!!
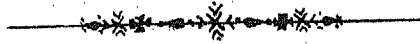
خان بہادر سیٹھہ ابراھیم ھارون جعفر
صدر اجلاس سی و چہارم (امراؤتي سنه ۱۹۲۰ع)

اجلاس سی و چہارم

(منعقدہ امراؤتی سنہ ۱۹۲۰ء)

صدر آنریبل خان بہادر سر ابراہیم ہارون جعفر صاحب رئیس پونا

حالات صدر

سر ابراہیم ہارون جعفر خان بہادر ہارون جعفر صاحب مشہور تاجر پونا کے صاحبزادہ ہیں جو اپنی نیکی عمدہ اخلاق اور فیاضی کے لحاظ سے اپنے زمانہ کے ممتاز اور با اثر شہری افراد کے ہم رتبہ تھے پونا میں اسلامیہ اسکول کا "جعفر ہال" ان کی علمی سرپرستی کی یادگار ہے۔ سر ابراہیم شروع زمانۂ نوجوانی سے الولد سر لابیہ کے پورے طور سے مصداق نظر آتے ہیں نامور باپ کے انتقال کے بعد وہ خانگی جھگڑوں میں مبتلا ہوئے جس سے ان کی تجارت کو نقصان پہونچا لیکن وہ اپنی فطری مستعدی اور ہمت کی بدولت ان مشکلات پر غالب آئے اور نہ صرف انھوں نے اپنی کاروباری حالت کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی بلکہ آغاز شباب سے پونا کے مسلمانوں کی تعلیمی اور سوشیل ترقی کی اصلاح میں حصہ لینا انھوں نے شروع کیا۔ لیکن بعض شہرت پسند ہمعصروں کی رقابت اور حسد نے بارہا ان کے مفید ارادوں میں پستی کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی قومی محبت اور ولولہ قومی خدمت نے ان کو کبھی مایوس نہ ہونے دیا انھوں نے شروع زمانۂ زندگی سے باوصف اس کے کہ ان کی تعلیم میٹرک سے زیادہ نہ تھی ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کی گو ان کا آبائی پیشہ تجارت تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے کاروبار تجارت سے زیادہ قومی تعلیم اور قومی حقوق کی حفاظت میں مشغول نظر آتے ہیں انھوں نے نہ صرف پونا کے مسلمانوں میں تعلیم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی بلکہ صوبہ بمبئی سے باہر جو انجمنیں جو سوسائٹیاں جو درسگاہیں مفید کام انجام دے رہی تھیں ان سے تعلقات پیدا کرکے ان کے مفید اثر

کو اپنے صوبہ میں پھیلانے کی کوشش کی - وہ باہمت کارکن ہونے کے ساتھ نہایت منتظم واقع ہوئے ہیں - اور یہ پہلوان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کے اجلاس پونا میں انہیں کی توجہ سے منعقد ہوئے - بمبئی پراونشیل ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ سے انھوں نے اپنے صوبہ کی تعلیمی خدمات انجام دینے میں پرحوصلہ کام کیا ہے جس کے سالانہ اجلاس ہر سال کامیابی کے ساتھ ہوتے رہے ہیں یہ کانفرنس سنہ ۱۹۰۷ء میں قائم ہوئی جس کے اجلاس سورت ، اور احمد آباد ، پونا وغیرہ میں بڑی شان اور کامیابی کے ساتھ انجام پا چکے ہیں کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ سورت کے صدر نواب محسن الملک چوتھے اجلاس منعقدہ احمد آباد کے صدر نواب وقار الملک تھے اسی کانفرنس کی کوشش سے سنہ ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ اسکول پونا میں قایم ہوا چودہ ہزار روپیہ کانفرنس نے تعمیر اسکول کے لئے دیا زمین خان بہادر ہارون جعفر مرحوم نے عطا کی -

سر ابراہیم گورننگ بورڈ اسلامیہ اسکول کے سکرٹری پہلے سے تھے سنہ ۱۹۲۴ء سے بعد انتقال نواب زادہ نصر اللہ بار ایٹ لا (آف سچین) سابق جنرل سکرٹری بمبئی پراونشیل کانفرنس ، کانفرنس مذکور کے بھی جنرل سکرٹری قرار پائے بلکہ یہ ظاہر کرنا داخل مبالغہ نہوگا کہ نواب زادۂ مرحوم کی زندگی ہی میں کانفرنس کی تمام تر کامیابی اس کے اجلاسوں کا انعقاد اور تعلیمی ترغیب کی مفید اغراض کو صوبہ متعلقہ میں فروغ دینا فقط سر ابراہیم کی مسلسل ہمت اور دلچسپی کی وجہ سے ہے -

جنھوں نے مختلف صوبہ جات کے نامور مسلمانوں کی توجہ کو بھی مائل کرنے میں اپنے سچی خواہش کے اثر سے کام لیا سنہ ۱۹۱۸ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولٰنا حبیب الرحمٰن خان صاحب کانفرنس مذکور کے پونا میں صدر قرار پائے اس کانفرنس میں مسلم اسکول کو ہائی اسکول تک ترقی دینے کی تجویز پاس ہوئی اور ایک کمیٹی فراہمی سرمایہ کے لئے مقرر ہوئی -

سنہ ۱۹۱۸ء میں بمقام سورت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس جس کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اس کامیابی میں بڑا حصہ سر ابراہیم کی دلچسپی کا شامل تھا - انھوں نے مدارس اردو کو صوبہ بمبئی میں پھیلانے کی خاص کوشش کی ، مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ جس وقت گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش تھا اس مسئلہ کے متعلق تمام واقعات اور حالات کا باقاعدہ مطالعہ کرکے اور تیار ہوکر کونسل میں سر موصوف نے مباحثہ کیا اور مسئلہ مذکور سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرکے اپنی عملی قوت کا ثبوت دیا رکن کونسل آف اسٹیٹ کی حیثیت سے انھوں نے قومی حقوق کی حفاظت میں ایک بہترین تجویز یہ پیش کی کہ "مسلمانوں کا جس قدر روپیہ ڈاک خانہ کے "سیونگ بنکوں" میں جمع ہے

اور سرکاری کفالتوں میں لگا ہوا ہے اور نیز مسلمان جس کا منافع مذہبی احکام کی بنا پر نہیں لیتے یہ منافعہ مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کے لئے مخصوص کر دیا جائے بشرطیکہ متعلقہ صوبہ کے مسلمان اس تجویز کے موافق ہوں - قابل مبارک باد ہیں سیٹھ صاحب اور قابل شکر ہے ان کی کوشش اور توجہ کہ وہ اس تجویز کو کامیاب کرنے میں عہدہ برآ ہوئے کوئی شبہ نہیں کہ یہ تجویز نہایت دانش مندی اور غور کا نتیجہ تھی اگر مذکورہ بالا تجویز پر مسلمانوں نے متفقہ طور پر عمل کرنا شروع کر دیا تو مسلمانوں کی تعلیمی پستی بلند و بالا ہستی کی شکل میں بہت جلد تبدیل ہو جائے گی ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ ہم نے ان کو خاموشی کے ساتھ قومی کاموں کی دھن میں مصروف پایا انجام کار خادم قوم کو ایک دن مخدوم قوم بننا لازمی ہے بشرطیکہ استقلال ہمت، خلوص، اور ارادہ کی نیکی شامل عمل ہو انہیں اوصاف نے ان کی دستگیری کی اور اب وقت آیا کہ وہ مخدوم قوم بنائے جائیں چنانچہ ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کی صدارت بمقام لکھنؤ ان کو پیش کی گئی یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں صلح کانفرنس بیٹھی ہوئی تھی اور صریح وعدوں کی موجودگی میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے در پیش تھے مسلمانان ہندوستان پر ترکوں کے ساتھ ناواجب سلوک کا خاص اثر پڑ رہا تھا اور عالم اسلامی رنجیدہ جوش کے عالم میں مبتلا ہو کر برٹش حکومت کے اس رویہ کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھ رہا تھا ایسے نازک وقت میں اس عظیم الشان مجلس کی صدارت کے فرائض انہوں نے بحسن و خوبی انجام دئے - علیٰ ہذا ۱۹۲۲ء میں اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ امراوتی کے وہ صدر نشین قرار پائے -

اب مسلسل پانچ برس سے وہ وائسرائے کی اسمبلی کے ممبر ہیں اسمبلی میں ہمیشہ انھوں نے دانش مندی اور قابلیت کا اظہار کر کے ملکی اور قومی خدمت کی حفاظت میں فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے انھوں نے ایک طرف قوم کی خدمت زندگی کا فرض سمجھا تو دوسری طرف گورنمنٹ سے بھی خوش گوار تعلقات قایم رکھنے کی کوشش کی" گورنمنٹ کو ان کی قابلیت اور پوزیشن پر جس طرح کا اعتماد ہے وہ ان کے خطابات اور اعزازات سے نمایاں ہے پہلے وہ خان بہادر بنائے گئے اور اب ۱۹۲۶ء میں سر کے ممتاز خطاب سے سرفراز ہوئے - مختصر یہ کہ ان کی پبلک اور پرائیوٹ لائف ہمت، استقلال اور دھن کے پکے ہونے کا ایک ایسا امتیازی نشان ہے جس کے اختیار کرنے سے زندگی کی کٹھن اور دشوار منزلیں بہت کچھ تسکین خاطر کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور جو لوگ حکام اسی عزت و جاہ اور خطابات کے طالب ہیں آنریبل موصوف خصوصیت کے ساتھ ان کے لئے شمع راہ عمل ہیں -

خطبۂ صدارت

حضرات! ہماری آل انڈیا ایجوکیشنل کا یہ اجلاس ایک ایسے نازک و ہنگامہ خیز زمانہ میں منعقد ہو رہا ہے جب کہ ہمارے ملک میں غیر معمولی تغیرات اور انقلابات رونما ہیں۔ حالات اس درجہ ناخوشگوار ہیں اور تبدیلیاں اس قدر جلد جلد ہو رہی ہیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا۔ ایک طرف تو ریفارم اسکیم کے ماتحت ہندوستان کے نظامِ حکومت میں اہم اور اکثر باشندگانِ ملک کے خیال میں امید افزا تبدیلیاں ہونے والی ہیں جو سالِ نو سے عملی صورت اختیار کریں گی۔ لیکن برخلاف اس کے دوسری طرف یہ حالت ہے کہ بے اطمینانی اور بے چینی روز افزوں ہے اور "سوراج" کے دل آویز تخیل نے، جس کے حصول کا ذریعہ نان کواپریشن بتایا جاتا ہے، ملک کے سامنے ایک نئی دنیا لا کر کھڑی کر دی ہے۔ جو خوشگوار امیدوں سے بھری ہوئی ہے۔

غرض موجودہ حالت یہ ہے کہ ملک کے سیاسی رجحانات نے تمام اہم اور ضروری قومی مسائل کو پس پشت ڈال دیا ہے یہاں تک کہ تعلیم جیسی ضروری چیز جو ہر قسم کی پاکیزہ تحریکات اور جذباتِ عالیہ کا سرچشمہ ہے اور جس سے ہمارے ملک کی موجودہ بیداری اور جذبۂ حریت نے نشوونما پایا ہے آج عملاً وہ بھی نظر انداز کر دی گئی ہے اور سیاسی جلسوں کی رونق و چہل کے مقابلہ میں تعلیمی جلسوں کی بے رونقی و افسردگی اس کا زبردست ثبوت ہے۔ اس افسردگی سے قطع نظر مسئلہ تعلیم کے متعلق اور بھی جدید مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ یعنی تحریک عدمِ تعاون نے اس مسئلہ کو اپنے حلقۂ عمل کے اندر لے کر ملک کے موجودہ تعلیمی نظام کو یک قلم برباد کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان حالات نے ہماری راہ میں ایسی مشکلات پیدا کر دی ہیں کہ مجھ کو شبہ ہے کہ آیا ہم اُن سے بسہولت عہدہ برآ ہو سکیں گے یا نہیں؟

حضرات! ملک کی حالت کا یہ مختصر خاکہ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے آپ اس سے بے خبر نہیں ہیں اور نہ آپ ان دشواریوں سے ناواقف ہیں جو حالات تبدیل ہو جانے سے ہماری راہ میں پیدا ہو گئی ہیں تو کیا میں یہ سوال کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ان پُر اضطراب حالات میں آپ نے مجھ خاکسار کو کس لئے اس جلسہ کی صدارت جلیل القدر منصب عطا فرما کر ذمہ داری کا ناقابلِ برداشت بار [illegible] پر رکھا۔ اور تعلیمی رہنمائی کی باگ میرے سپرد کی۔

حضرات! میں اس شائستہ رسم سے ناواقف نہیں ہوں کہ قوم جس شخص کو اس عظیم الشان تعلیمی مجلس کی صدارت کا اعزاز عطا کرتی ہے تو وہ شکر گزاری اور امتنان کے جذبات کا اظہار کرتا ہے لیکن معاف کیجئے میری یہ حالت ہے کہ مشکلات کا خیال کرتے ہوئے کئی دفعہ حرف شکایت زبان پر آیا کہ ان نازک اور پرخطر گھڑیوں میں یہ منصب عطا کرنا — گویا مشکلات کی دلدل میں مبتلا کرنا ہے لیکن اے حضرات! میں نے زبان کا لفظ استعمال کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میرا دل شکر گزاری کے جذبات سے لبریز ہے اور اس اہم زمانہ میں آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے جو اعزاز عطا فرمایا ہے میں اس کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کرتا ہوں اور اپنی زندگی کے ان قیمتی لمحوں کو ہمیشہ فخر آمیز مسرت سے یاد رکھونگا۔

حضرات! حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت شکر و شکایت کا نہیں ہے اور نہ اس کا زمانہ ہے کہ آپ کسی فصیح و بلیغ خطبۂ صدارت کا لطف اٹھائیں یا کسی ایک شخص کی رہ نمائی اور قوت دست و بازو پر اعتماد کریں۔ ہماری تعلیمی کشتی گرداب مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے اور اس کا ساحل مقصود تک پہنچانا ہم سب کا مشترک فرض ہے اس لئے ہم سب یہاں ایک ہی مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ باہمی مشورت اور سنجیدہ مباحثہ سے اپنی تعلیمی مشکلات کا حل کریں اور قوم کے لئے ایک صحیح شاہ راہ تجویز کریں امید ہے کہ کانفرنس کے سہ روزہ اجلاس میں ہم ضرور کسی مفید نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔

مسئلہ خلافت

حضرات! میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے حالات رونما ہو رہے ہیں کہ اُن کے مقابلہ میں تعلیم کی اہمیت بالکل نظر انداز کر دی گئی ہے اگرچہ میں نے اس خیال کو کسی قدر نکتہ چینی اور تاسف کے لہجہ میں ادا کیا ہے لیکن بدقسمتی سے میں خود مجبور ہوں کہ سب سے پہلے انھی مہتم بالشان اور اندوہ ناک واقعات پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں۔ کیوں کہ آج جو ہنگامہ ہمارے گرد و پیش برپا ہے کیا بہ حیثیت ایک مسلمان اور کیا بحیثیت ایک ہندوستانی کے ہم اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ بلکہ بہ حیثیت ایک مسلمان کے ہماری مصائب و مشکلات برادران وطن سے بہت زیادہ ہیں۔

حضرات! یہ حقیقت بار بار ظاہر کی جا چکی ہے کہ ہم مسلمانان ہند کی ایک خاص حالت ہے اور ہمارے فرائض اور مذہبی و اخلاقی ذمہ داریاں بہ نسبت برادران وطن کے کہیں زیادہ ہیں۔ ان کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور سیاسی جد و جہد کا جولان گاہ صرف ہندوستان ہے اور بیرونی دنیا سے ان کی قومیت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس محدود دائرہ کے اندر اطمینان خاطر کے ساتھ

اپنی مجموعی قوت سے اپنے ملک و قوم کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت اُن سے مختلف ہے۔ ہماری وطنیت و قومیت صرف ہندوستان سے وابستہ نہیں بلکہ خدا کی اس وسیع زمین پر جہاں جہاں ہمارے برادرانِ ملت آباد ہیں وہ ہمارا وطن ہے ؎

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اسی طرح دنیا کے وہ تمام انسان و جن کو رشتۂ اسلام نے پیوستہ کر دیا ہے۔ ہمارے بھائی ہیں اور ہماری قومیت میں داخل ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارا مذہب ہماری قومیت ہے پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ ہماری مذہبی روایات بیرونی ہند سے وابستہ ہیں۔ اور ہمارے مذہب کا سرچشمہ سرزمین حجاز ہے جہاں تمام مسلمان اپنا ایک مقدس مذہبی فرض (حج) ادا کرنے کے لئے ہر سال جاتے ہیں۔

ان حالات کا یہ تقاضا ہے کہ بیرون ہند کے مسلمانوں پر جو کچھ گزرتا ہے اس سے ہم قدرتی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی ہماری مصیبت کی داستان بیرون ہند سے شروع ہوئی ہے جس نے نہ صرف ہم کو بلکہ تمام مسلمانانِ عالم کو مضطرب کر رکھا ہے اس سے میری مراد مسئلہ خلافت ہے جس نے حالت کو اس درجہ نازک بنا دیا ہے۔ زمانۂ جنگ میں مسلمان صبر و سکون کے ساتھ نتائج کا انتظار کرتے رہے۔ ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بدگمانی نہ تھی کہ یورپ ترکی کے ساتھ ایسا نامنصفانہ رویہ اختیار کرے گا۔ لیکن صلح کانفرنس کے آغاز میں ایسے آثار محسوس ہونے لگے جس سے بجا طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید ترکی کے ساتھ انصاف نہیں کیا جائیگا۔ ان خطرات کو محسوس کر کے مسلمانوں نے ہر ممکن طریقہ سے صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار گورنمنٹ کے سامنے کیا اور آخر کار ستمبر ۱۹۱۹ء میں ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا اور آپ کے اس ناچیز خادم کو صدارت کا اعزاز عطا فرمایا۔ جس میں نہایت پرزور طریقہ سے اسلامی مطالبات کو صفائی سے ظاہر کیا گیا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کے خطبہ صدارت میں اُس وقت میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اُس کے بعض اقتباسات آپ کے سامنے اس موقعہ پر پیش کر دوں۔

حضرات! میں نے عرض کیا تھا کہ۔

"ترکی حکومت برطانیہ کے درمیان جنگ" چھڑ جانے کی خبر نے مسلمانوں کو جس بے چینی اور تکلیف میں ڈال دیا تھا اس کا اندازہ صرف ایک مسلم دل ہی کر سکتا ہے۔ ہماری ہندوستان کی زندگی کی تاریخ میں کبھی ایسی کشمکش جذبات کا وقت نہیں آیا

تھا۔ ہم نے ایک صدی زائد سے دولت برطانیہ کی وفاداری کو اپنا شعار بنا لیا تھا ہم امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور بہ حیثیت عقیدتمند وفادار رعایا سرکار برطانیہ کو ہمیشہ ہر طرح کی امداد دیتے تھے اور دینے کو تیار رہتے تھے۔ ہم نے گورنمنٹ ہند کے استحکام و قیام ہی میں مدد نہیں کی بلکہ ہندوستان سے باہر جا کر برٹش مقبوضات کی پاسبانی میں اپنا خون بہایا۔ چین۔ عدن اور افغانستان میں ہمارے کارنامے قابل تحسین خیال کیئے گئے۔ ہماری اس ایک صدی سے زائد محکومیت کے زمانہ میں ہمارے مذہبی جذبات اور دینوی مفاد میں اسقدر سخت تناقض کبھی واقع نہیں ہوا تھا۔ احکام مذہب پاس اخوت کی یاد دلاتے تھے۔ اور اغراض دینوی وفاداری کے سبق کی تلقین کرتے تھے۔ ہماری اس بے چینی کی بڑھتی ہوئی آگ کے روکنے کے لیئے مقامات مقدسہ کے احترام کی بابت اعلان کیا گیا اور اتحادیوں کے جنگی اغراض کی مسلسل اور بسیط تشریح کی گئی۔ مسلمانوں کو یقین دلایا گیا کہ یہ جنگ چھوٹی اور بے بس قوموں کی آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ دنیا پر یہ ظاہر کیا گیا کہ برطانیہ اور اس کی طرفدار قوم نے جرمن کے فاتحانہ خواہشوں پر شدید ضرب لگانے کے لیئے تلوار اٹھائی ہے۔ اس سے ملک گیری یا حکومت پرستی مقصود نہیں۔ ہمیں باور کرایا گیا کہ یہ جنگ کوئی مذہبی پہلو نہیں رکھتی اور تمام اصول عدل و انصاف جو دوسری چھوٹی اقوام پر صرف کیئے جائیں گے۔ وہ بلا تشخیص مذہب و ملت ہو نگے کسی قوم پر ظلم روا نہ رکھا جائیگا۔ حتیٰ کہ مفتوح اقوام پر بھی تشدد اور ظلم سے گریز کیا جائیگا۔ اور اُن کے جائز حقوق کا پاس رکھا جائیگا"

حضرات! ان اعلانات کا جو حشر ہوا اور ترکی کے ساتھ جو غیر منصفانہ سلوک کیا گیا وہ ظاہر ہے۔ میں نے اُس وقت بھی عرض کیا تھا جبکہ صلح کانفرنس نے ترکی کے متعلق فیصلہ صادر نہیں کیا تھا کہ اگر یہ فیصلہ ہمارے مطالبات و جذبات کے خلاف ہوا تو ہم ہرگز اس کو تسلیم نہ کریں گے۔ اور ہم کو یہ حق حاصل ہو گا کہ ہم اپنی تمام آئینی کوشش اور جد و جہد سے جو کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں کریں۔ اور آج بھی میں یہی عرض کرتا ہوں کہ اس معاملہ کے متعلق ہم کو اپنی آئینی جد و جہد استقلال کے ساتھ جاری رکھنی چاہیئے۔

عدم تعاون یا نان کواپریشن

حضرات! میں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے موقعہ پر یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر اس مسئلہ کا تصفیہ مسلمانوں کے جذبات کے مطابق نہ ہوا تو خطرناک نتائج کا ظہور ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ جس خطرہ کا ہم کو احساس تھا وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے یعنی مسئلہ خلافت کے غلط فیصلہ نے مسلمانانِ ہند کے جذبات کو اس قدر زخمی کر دیا تھا کہ جب واقعہ پنجاب اور دوسرے اسباب سے متاثر ہو کر مسٹر گاندھی نے نان کواپریشن کی تحریک ملک کے سامنے پیش کی تو مسلمانانِ ہند نے اس کا خیر مقدم کیا اور خلافت کمیٹی نے بنام ترک موالات بہ طور ایک مذہبی فرض کے اس کو مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا اور بہت سے علماء نے اس کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیا۔ درحقیقت یہ نتیجہ اس غلط پالیسی کا ہے جو حکومت برطانیہ نے ترکی کے متعلق اختیار کی اور ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس غلط پالیسی کے نتائج کس قدر ناخوشگوار اور ملک کے امن و سکون کے لیے کس حد تک مضرت رساں ہونگے۔

حضرات! تحریک ترک موالات کی مذہبی حیثیت کے متعلق کچھ عرض کرنا میرا منصب نہیں یہ علما کا کام ہے اور وہی بتا سکتے ہیں کہ مذہب نے کس حد تک غیر مسلم اقوام سے ترک موالات کی اجازت دی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابھی تک ہمارے علما بھی کسی آخری فیصلہ تک نہیں پہونچے ہیں اور وہ اس بارہ میں مختلف الرّائے ہیں کہ کون چیزیں ترک موالات کے سلسلہ میں داخل ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں طریق عمل کے متعلق بھی ابھی تک اختلاف ہے۔ اس تعلیمی کانفرنس میں اس تحریک کے تمام اجزا کے متعلق بحث کرنا کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے میں صرف تعلیم کے متعلق عرض کرونگا۔

اس تحریک کے سلسلہ میں نوجوان طلبا کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سرکاری درسگاہوں کو نیز اُن درسگاہوں کو جو سرکار سے مالی اعانت لیتی ہیں چھوڑ دیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مذہبًا ایسا کرنا اُن کے لیے ضروری ہے۔ میں اگرچہ اس کی مذہبی حیثیت کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا تاہم ہر شخص اسقدر تو محسوس کریگا کہ دنیوی نقطۂ نظر سے تعلیم سے اس طرح دفعتًا دستکش ہو جانا ہر قوم کے لیے اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے سخت مضرت رساں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تا وقتیکہ علماء

کا کوئی مستند فیصلہ اس کے متعلق صادر ہو مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ مذہب ہمارے اس نقصان کو جائز رکھتا ہے - بہرحال یہ مسئلہ اس قابل نہیں کہ اس کو زیادہ مدت تک نظر انداز کر دیا جائے یہ ضروری ہے کہ اس کا جلد سے جلد کوئی اطمینان بخش فیصلہ ہو تاکہ قوم کو یکسوئی حاصل ہو -

ترک موالات کے متعلق اس وقت تین مختلف الخیال گروہ موجود ہیں - ایک گروہ اس ہتھیار سے ملک کو "سوراج" دلانے کا مدعی ہے - دوسرا مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کو اس پر کاربند ہونے کی ہدایت کرتا ہے - ان دو کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو کسی معتدل و درمیانی راستہ کی تلاش میں ہے - اور اب تک کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہونچا ہے -

اس تحریک کے مذہبی پہلو کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ سب سے زیادہ اس تعلیم کی جو حکومت کے واسطہ سے دی جاتی ہے جڑ کاٹنے کو مذہبی فرض بتایا جاتا ہے - لیکن اس کی مذہبی حیثیت کے متعلق یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قومی مرکزی دارالعلوم علیگڑھ میں جب تک قانوناً یونیورسٹی کی تعلیم تعلیم دینیات سے معرا اور بے لگاؤ تھی ہمارے دوست اس کے مخالف نہیں ہوئے - بلکہ اس کے ترویج کے حامی رہے - اور آج جبکہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ نے تعلیم دینیات پر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی کر دی ہے تو مسلمانوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی سے دستبردار ہو جانا چاہیے -

بہرحال اب تک جو مباحثہ اس مسئلہ پر ہوا ہے - اور جو جو تقریریں اور تحریریں اس بحث پر شائع کی گئی ہیں - نیز جو فتوے بعض علمار نے دیئے ہیں اور مذہبی حیثیت سے جو ہدایتیں کی گئی ہیں میں صداقت کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ اب تک سیاسی اور مذہبی پہلو سے میرے دل کو تسکین حاصل نہیں ہوئی - اور اس ذریعہ سے اور اس دستورالعمل سے جو نقصان میرے نزدیک ملکی و قومی مفاد کو پہنچتا نظر آتا ہے وہ اس خیالی اور مشتبہ فائدہ سے بہت زیادہ ہے جو ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے -

بحیثیت ایک ادنیٰ خادم قوم اور بہ حیثیت ایک ناچیز مسلمان کے مذہبی احکام کے سامنے میں سب سے پہلے اپنی گردن جھکانے اور ہر قسم کے پرخطر راہ میں قدم رکھنے کو اگرچہ اس میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے - اپنا مقدس مذہبی فرض خیال کرتا ہوں - بشرطیکہ کوئی ایسا فیصلہ مذہبی حیثیت سے میرے سامنے موجود ہو جو قوم کے لیے آخری حکم رکھتا ہو - مگر بدقسمتی سے میں اب تک جو کچھ دیکھتا رہا ہوں اس کے لحاظ سے ایسا کوئی فیصلہ میرے سامنے موجود نہیں ہے - میرے خیال میں ایسے فیصلہ کا صادر کرنا درحقیقت اُن باخبر علمار کا کام ہے جن کو مسلمانوں کی دینی و دنیوی دونوں ضرورتوں کا پورا پورا علم ہے -

مسلمانوں کی سیاست مذہب سے کوئی جداگانہ چیز نہیں ہے - قانون الٰہی ہماری دونوں ضرورتوں کا کفیل اور ہماری معاشرت کے ہر پہلو کے لیئے مشعل ہدایت ہے - لہذا اس بارہ میں سنجیدگی سے بحث کرکے ایسا فیصلہ صادر کرنا جو مسلمانوں کی کافی طور سے رہنمائی کرسکے - درحقیقت اسی قسم کے باخبر علمار کا کام ہے -

غرض نہایت اصرار کے ساتھ میری یہ رائے ہے کہ صاحب بصیرت علمار کی ایک جماعت جو سیاسی و شخصی اثرات سے متاثر ہو نشست کرکے ایک ایسا باضابطہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہو - علما کی اس کانفرنس میں ہر طبقہ و ہر گروہ کے علمار کا شامل ہونا ضروری ہے تاکہ ان کا فیصلہ ایک متحدہ فیصلہ ہو اور کسی طبقہ کو اس کے بعد انحراف و اعتراض کا موقع نہ ملے - پس اس بارہ میں جو کچھ رائے میں دیکھتا ہوں وہ اسی قدر ہے اور جہاں تک میں نے غور کیا ہے جبتک کہ علمار کی جماعت کو بطور خود اس کا احساس نہ ہوگا اور جبتک وہ کسی آخری مذہبی فیصلہ کے لیے تیار نہ ہونگے قوم کا موجودہ اختلاف دور نہ ہوگا - اور اضطراب و پریشانی باقی رہے گی - اور اسوقت جو چند حضرات مذہبی جامہ پہن کر قوم کو غلط راستہ پر لے جارہے ہیں مسلمانوں کو نقصان پہونچائیں گے -

ان حالات میں میں اپنے کو تیسرے گروہ کا ایک ناچیز فرد خیال کرکے معتدل و درمیانی راستہ تلاش کرنے کے لیے اس وقت تک قوم کو اپنی رائے نہ دونگا - جب تک کہ علمار کا متحدہ فیصلہ میرے سامنے موجود نہ ہو - اور میں ایسی حالت میں وہ تمام حقوق جو اہل ملک اپنی گورنمنٹ سے طلب کرسکتے اور حاصل کرسکتے ہیں ان کو طلب کرنا اور حاصل کرنا اپنی قوم کا حق سمجھ کر ایک جائز فعل سمجھتا ہوں خصوصاً تعلیمی حق کا حاصل کرنا میں سب حقوق پر مقدم سمجھکر اس کے حاصل کرنے کی جدو جہد کو فرض اور اس کے چھوڑنے کو قومی گناہ قرار دیتا ہوں اور اس لیے میں تحریک عدم تعاون کے ماتحت تعلیمی امداد نہ طلب کرنے یا اس کے واپس کردینے کو اپنی قوم کی ناداری و افلاس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناپسند کرتا ہوں - اور یہ خیال کرتا ہوں کہ تعلیمی حقوق کے حاصل کرنے میں ہم کو ایک لمحہ کے لیے بھی غفلت نہ کرنا چاہیئے -

میرے نزدیک گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کرنا ہر دانشمند کا فرض ہے - البتہ جو لوگ جا و بیجا طریقہ پر حکام کی رضامندی اور اشارہ ابرو کے ماتحت کام کرنا چاہتے ہیں - میں ان لوگوں کو نہ قوم کا دوست سمجھتا ہوں نہ گورنمنٹ کا - اس لیے میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ بیشک جو واقعا

مسئلہ خلافت اور ہنگامۂ پنجاب کے متعلق پیش آئے وہ عام طور پر تمام ملک اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے نہایت تکلیف دہ اور دل دکھانے والے ہیں۔ بیشک یہ واقعات اس درجہ اندوہ ناک ہیں کہ اُن کے تصور سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیئے یہ صحیح ہے کہ جو کچھ گذرا ہے اگر ہم اُس کو جلد سے جلد بھول جائیں تو یہ نہایت اچھا ہوگا۔ لیکن محض بعض ذمہ دار حکام کے یہ الفاظ "کہ تم گذشتہ تکلیف دہ واقعات کو بھول جاؤ" ہمارے تسکین قلب کے لیئے کافی نہیں۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ زخم خوردہ دلوں پر مرہم بھی رکھا جائے تاکہ خونچکاں زخم بڑھتے بڑھتے ناسور نہ بنجائیں۔ ورنہ محض الفاظ تو نمک بر جراحت کا کام کرتے ہیں۔

حضرات! جس طرح میں تحریک نان کوآپریشن کے ماتحت ترک تعلیم کا مخالف ہوں اسی طرح گورنمنٹ کے اس طریق عمل کا بھی مخالف ہوں کہ ملک میں جو عالمگیر بے چینی اور گورنمنٹ کے خلاف بے اعتمادی کا جوش روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ گورنمنٹ اس سے ابتک غافل ہے حالانکہ اس کی ضرورت ہے کہ مسئلۂ خلافت اور ہنگامۂ پنجاب کے متعلق جو کچھ کیا گیا ہے سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ اس پر نظر ثانی کرکے اس کی تلافی کی جائے۔ اور گورنمنٹ پبلک کے عام جذبات اور نیز اس کے حقوق کی نگہداشت کو اپنا اولین فرض تصور کرکے اس مصیبت کو ہلکا کرنے کی طرف قدم بڑھائے۔ گورنمنٹ کا یہ طریق عمل تمام ملک میں بنظر اطمینان ومسرت دیکھا جائیگا۔ اور ملک کی امن وخوشحالی کا باعث ہوگا۔ جبری حکومت سے کسی گورنمنٹ یا ملک کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوئی۔

اگر گورنمنٹ اپنی پالیسی میں اس تغیر پر آمادہ ہو تو اعتدال پسند طبقہ جو گورنمنٹ کے ساتھ ملکر کام کرنا چاہتا ہے۔ گورنمنٹ کی اعانت کریگا۔ اور اس کے ہاتھوں کو مضبوط کریگا۔ پس اگر کوئی چیز ملک کی مصیبت کو ہلکا کرسکتی ہے تو وہ یہی ایک چیز ہے لہذا اگر بجائے یہ ہدایت کرنے کے کہ ہم پچھلے واقعات کو بھول جائیں اگر بے چینی کے اسباب کو دور کرنے کی طرف توجہ کی جائے تو یہ زیادہ مفید اور کارآمد ہوگا۔ اور ملک کی مصیبت کو ہلکا کردیگا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ پالیسی کی اس تبدیلی سے گورنمنٹ کی کمزوری ثابت ہوگی تو یہ ایک غلط خیال ہے۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ شکریہ واحسان پذیری کے جذبات تمام ملک میں پھیل جائیں گے۔ اور اطمینان ومسرت کا نیا دور شروع ہوگا۔ جو لوگ گورنمنٹ کو یہ صلاح دیتے ہیں کہ پبلک کے جذبات کو بزور دبایا جائے وہ ایک طرف تو ملک کے جذبات کی تحقیر کرتے ہیں اور دوسری طرف گورنمنٹ کو غلط راستہ پر ڈالکر برباد کرنا چاہتے ہیں۔

گورنمنٹ کی تعلیمی اعانت

ترک موالات کے سلسلہ میں نہایت زور و شور سے یہ بحث اُٹھائی گئی ہے کہ گورنمنٹ جو مالی اعانت قومی اسکولوں اور کالجوں کو دیتی ہے یہ مسترد کردیجائے بحث طلب یہ امر ہے کہ کیوں واپس کردیجائے؟
اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ گورنمنٹ غیر مسلم ہے اس لیے ہم کو اُس سے کسی قسم کی اعانت نہ حاصل کرنا چاہیئے۔ تو میں یہ عرض کرونگا کہ پہلے اس اعانت کی حیثیت کا فیصلہ ہوجانا چاہیئے کہ یہ ہے کس قسم کی دنیا کے کاروبار میں ہم روزمرّہ دیکھتے ہیں کہ ہم ایک غیر مسلم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں اس سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک غیر مسلم پر ہمارا قرض آتا ہے تو اس کا مطالبہ کرنے اور اس کے وصول کرنے میں ہم کو تامل نہیں ہوتا یہی حالت درحقیقت گورنمنٹ کے مالی اعانت کی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض اس کو عطیہ یا انعام سے نامزد کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ کاروبار کی ایک صورت ہے یعنی گورنمنٹ ایک ہاتھ سے خود ہم سے لیتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے واپس کرتی ہے یہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہم سے تعلیمی ٹکس وصول کرتی ہے یہ وہ روپیہ ہوتا ہے جو ہم اپنی محنت وکمائی سے گورنمنٹ کو دیتے ہیں اور جب تک موجودہ نظام حکومت قائم ہے خواہ مخواہ دیں گے۔
بہرحال یہی روپیہ ہم کو اس کے بعد تعلیمی اعانت کی صورت میں ملتا ہے یا ہمارے بچوں کی تعلیم کا ہوں پر صرف ہوتا ہے جو کم و بیش بارہ کروڑ سالانہ ہے میں نہیں خیال کرتا کہ یہ کونسی دانشمندی ہے کہ ہم اپنے اس واجبی حق سے دست کش ہوجائیں اور جو کثیر رقم ہم گورنمنٹ کو دیتے ہیں وہ واپس نہ لیں۔

حضرات! براہ کرم پہلے اس صورت واقعہ پر بھی تو غور کیجئے کہ آپ کی قوم میں تعلیم کے متعلق کہاں تک احساس پیدا ہوا ہے حالت یہ ہے کہ اسی کانفرنس کو غل مچاتے ہوئے اور تعلیم کی تحریک تمام ملک میں پھیلاتے ہوئے (۳۴) سال گذر چکے ہیں لیکن اس کوشش کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کو یقیناً تسلی بخش نہیں کہا جاسکتا۔ یہ حالت تو گویا ہماری بیداری اور ہمارے احساس کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جب قدرتی موانع بھی شامل ہوجائیں تو ہماری مشکلات اور بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ ان مشکلات سے میری مراد قوم کا افلاس ہے جو ہمیشہ اعلیٰ تعلیم کے لیے سدّراہ ثابت ہوا۔
پس میں نہیں خیال کرتا کہ ان مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم میں سے کوئی شخص اس کے لیے تیار ہوگا کہ حکومت میں اس کا جو واجبی حصہ ہے وہ اس سے دست کش ہوجائے اور قوم کے بچوں کو جہالت کی

حالت میں آزاد پھرنے کے لیئے چھوڑ دے۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے اور قوم میں فی الحقیقت اسقدر احساس و تمول پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے بل پر قومی اسکول و کالج قائم کر سکتی ہے تو بسم اللہ میں بڑی خوشی سے اپنی رائے واپس لونگا اور اپنی قوم کی اس حوصلہ مندانہ کام کا نہایت جوش سے خیر مقدم کرونگا۔ لیکن بغیر تجربہ و مشاہدہ میں بالفعل اس کے قبول کرنے کے لیئے تیار نہیں ہوں کہ ہماری قوم اس منزل تک پہنچ گئی ہے۔ واقعات اور حالات اس کے شاہد ہیں کہ یونیورسٹی اور کالج تو درکنار کسی ایک اسکول کو بھی ہماری قوم نے بدون امداد و اعانت گورنمنٹ کے کامیابی کے ساتھ چلا کر نہیں دکھایا بلکہ آج جن اسکولوں کی گرانٹ بند کی گئی ہے وہ خطرہ کی حالت میں آگئے ہیں اور اُن کے منتظمین کو آیندہ کے لیئے مشکلات ہی کا نہیں بلکہ مایوسی کا سامنا ہے۔

تعلیمی دوڑ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی رفتار

حضرات! میں آپ کے صبر و سکون کی زیادہ آزمایش نہ کرونگا مجھے اجازت دیجیئے کہ میں مسلمانان ہند کی تعلیمی حالت کے متعلق چند الفاظ عرض کرونگا یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانانِ ہند کا قومی زوال اور انحطاط درحقیقت ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا لیکن ہزار سالہ حکومت کے اثر سے ایک ظاہری ڈھانچہ اور رکھ رکھاؤ قائم تھا۔ اور قوم اپنی نادانی سے یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ بدستور اپنے اقتدار پر قائم ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا کامل طور پر خاتمہ ہو گیا مرہٹوں اور سکھوں نے پہلے ہی مسلمانوں کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور مسلمانوں کی شاہی حیثیت درحقیقت صرف دہلی اور نواح دہلی تک باقی رہگئی تھی اور انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار یہ خبر دے رہا تھا کہ دولت مغلیہ کا یہ ظاہری ڈھانچہ بھی صرف ایک ضرب کا محتاج ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۱۸۵۷ء نے دولت مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ہمیشہ کے لیے گل کر دیا زوال سلطنت تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے چنانچہ مسلمانوں کے بڑے بڑے نامور خاندان جو دنیوی دولت و حشمت اور اقتدار و منصب رکھتے تھے ایسے تباہ و برباد ہوئے کہ دریوزہ گری پر مجبور ہو گئے اور مسلمانوں کی تمام عزت و منزلت ایک افسانہ ہو گئی ایسی حالت میں علوم و فنون کا زوال و انحطاط یقینی ہے کیونکہ سلطنت کی حالت یہ ہے کہ تمام اوصاف و کمالات ایک سایہ کے طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں اور جہاں سلطنت کو زوال ہوا ان سب چیزوں کا خود بخود اس کے ساتھ خاتمہ ہو جاتا ہے۔

حضرات! مسلمانوں کی تباہی اور زوال سلطنت درحقیقت خود اُن کے اعمال کا نتیجہ تھا۔ جوں جوں اپنے پاک اور مقدس مذہب اسلام سے دور ہوتے گئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے گئے حکومت ان سے کنارہ کرتی گئی اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم زمین کا وارث ان لوگوں کو بناتے ہیں اور سلطنت ان لوگوں کو دیتے ہیں جو متقی و پرہیزگار ہیں۔ جب یہ حالت مسلمانوں سے جاتی رہی تھی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت اور سلطنت کے ساتھ تمام محاسن بھی یکقلم رخصت ہو گئے اس وقت مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ بمصداق بما کسبت ایدیھم جو کچھ خود ان کے ہاتھوں اُن پر گذرا تھا اس کو صبر و ہمت کے ساتھ انگیز کرتے اور اپنے کو اسلام کا زیادہ اہل بنا کر جدید حالات کے موزوں و مناسب از سرنو جد و جہد شروع کر دیتے۔ تاکہ بحیثیت ایک زندہ قوم کے جو زیادہ سے زیادہ اقتدار اس ملک میں حاصل کر سکتے تھے کم از کم اس سے تو محروم نہ رہتے اور اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ جدید علوم و فنون سیکھتے اور ملک میں اپنی جگہ حاصل کرتے۔ لیکن جہالت و تعصب کا برا ہو کہ اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کو انگریزوں سے ایک گونہ نفرت پیدا ہو گئی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز ان کی حکومت و اقتدار کے زوال کا باعث ہیں۔ بیشک یہ نفرت ایک قدرتی چیز ہے جو ایسے موقع پر پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ ایک ایسی بیرونی حکومت نے جو اندرونی تعصبات سے علیحدہ تھی اور ہندوستان کی جملہ اقوام سے ایک علیحدہ مذہب اور آئین رکھتی تھی ہندوستان پر قبضہ کیا۔ غرض یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اوائل حکومت برطانیہ میں تعلیم کی طرف سے غفلت برتی اور خدا جانے کس بُری گھڑی میں اُنھوں نے تعلیم سے اپنی علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا کہ آج تک اُن کی حالت نہیں سنبھلی اور اب تک وہ اس کے تلخ نتائج بھگت رہے ہیں۔ کیا یہ واقعہ کچھ کم قابل عبرت ہے کہ ہندوؤں نے تو جو ہمیشہ زمانہ کے رُخ پر چلتے ہیں باوجود اپنے مذہبی تعصبات اور چھوت چھات کی پابندیوں کے فوراً انگریزی علوم کا سیکھنا شروع کر دیا اور تحصیل علم کے لیے ولایت کے سفر کو بھی جائز قرار دے لیا درآنحالیکہ اُن کی خانگی معاشرت اور اکل و شرب کی مخصوص پابندیوں کی وجہ سے بمشکل اس کی توقع کی جا سکتی تھی اور اس کے علاوہ خود ہندوؤں کی گذشتہ تاریخ میں شاذ و نادر اس کی مثالیں مل سکتی ہیں کہ اُنھوں نے بیرونی دنیا سے ایسے تعلقات قائم رکھے ہوں لیکن مسلمان جو قدرتی طور پر سیر و سیاحت کے عادی اور نئے اور ترقی یافتہ علوم و فنون سیکھنے اور ان کو ترقی دینے میں بے تعصب اور روشن خیال واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے تعصب و نفرت کی بنا پر نہ صرف علوم سے بے پروائی کی بلکہ ۱۸۳۵ء میں جس کو ابھی ایک صدی بھی نہیں گذری آٹھ ہزار

دستخطوں سے گورنمنٹ میں ایک میموریل بھیجا کہ بجائے مشرقی تعلیم کے انگریزی تعلیم پر کوئی رقم صرف نہ کی جائے۔ کیونکہ انگریزی پڑھنے سے لوگ کرسٹان وعیسائی ہو جائیں گے۔ برخلاف اُن کے ہندوؤں نے بسرکردگی راجہ رام موہن رائے خود اس امر کی خواہش کی کہ جس قدر رقم مشرقی علوم پر صرف ہوتی ہے وہ اس پر صرف کرنے کے بجائے علوم مغربی کی ترویج میں صرف کی جائے وشتان ما بینهما (اون دونوں میں بڑا فرق ہے)

حضرات! اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ حالت کس قدر افسوسناک تھی جب کسی قوم کو علوم وفنون سیکھنے سے اس حد تک نفرت ہو تو اس کا اللہ مالک ہے۔ ایسی قوم کو تحصیل علم پر آمادہ کرنا اور جہالت کی تاریکی سے نکالنا کوئی سہل کام نہ تھا۔ لیکن خدا کو بظاہر مسلمانوں کی کچھ بہتری منظور تھی کہ ایک دردمند دل رکھنے والے محب ملک وملت کو اس کام کے لیے کھڑا کیا۔ اور اس نے اپنے مسلسل اور انتھک محنت اور پیہم کوشش سے مسلمانوں کو تعلیم پر آمادہ کیا۔ اور اپنی تمام عمر اس خدمت کے لیے وقف کردی خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کی تعلیمی جدوجہد بارآور ہوئی اور اس کے نتائج کالج وکانفرنس کی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آئے۔ اور مسلمانوں نے آہستہ آہستہ تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس بزرگ سے میری مراد سر سید احمد خاں مرحوم ہیں۔ کانفرنس نے جابجا تعلیم کی ترغیب کے لیے اپنے اجلاس منعقد کیے اور قومی اسکولوں کے کھولنے اور ایک مضبوط اور وسیع تعلیمی نظام کے قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان سب حالات کو دیکھ کر یہ خوشگوار امید پیدا ہو گئی تھی کہ شاید مسلمانوں کے دن پھر جائیں اور وہ محنت اور کوشش کر کے تعلیم میں ہندوؤں کے دوش بہ دوش آجائیں۔ اور اپنی گذشتہ غلطی کی تلافی کر سکیں لیکن آہ۔ ؎

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

ابھی ہمارا نظام تعلیم مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ تحریک نان کوآپریشن نے تمام اسلامی درسگاہوں کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ جس کی تلافی مدت تک نہ ہو سکے گی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تحریک ملک کو فائدہ پہنچائیگی اور سوراج کو ہم سے قریب تر کردیگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے برادرانِ وطن جو ملکی معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں اور جنھوں نے سب سے پہلے سوراج کا سوال ملک کے سامنے پیش کیا (جیسا کہ خود اس لفظ کی ترکیب سے ظاہر ہے) وہ کیوں فراخ دلی سے اس تحریک میں حصہ نہیں لیتے۔ میں نے ابتک نہیں سنا کہ اس تحریک کی بنا پر کوئی ہندو درسگاہ برباد ہوئی ہو۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کے اسکولوں اور کالجوں پر ہر جگہ آفت آئی اور یہ تحریک وبا کی طرح تمام اسلامی

درسگاہوں میں پھیل گئی۔ اب ذرا اپنے سب سے بڑی قومی درسگاہ کی حالت دیکھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے علیگڑھ کالج پر اس تحریک کے ماتحت حملہ کیا گیا اور وہاں جو افسوسناک واقعات پیش آئے وہ سب کو معلوم ہیں اعادہ کی حاجت نہیں۔ یہ واقعات صرف علیگڑھ تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ پنجاب۔ یو۔ پی۔ سندھ۔ اور بمبئی میں بھی رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کے تعلیمی انہماک کا اس سے اندازہ کیجئے کہ ان کی کوئی اہم درسگاہ ابتک بادحوادث کی نذر نہیں ہوئی۔

حضرات! آپ یقین کیجیے کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی تو مسلمانوں کی تمام درسگاہیں ہمیشہ کے لیے برباد ہوجائیں گی۔ اور جس طرح ہم آج یہ ماتم کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اوائل عہد حکومت برطانیہ میں غفلت کر کے مسلمانوں کو نقصان پہونچایا اسی طرح آیندہ نسلیں ماتم کرینگی۔ کہ ہم نے تحریک نان کواپریشن کے ماتحت تعلیمی نظام کو درہم برہم کر کے نوجوانوں کو خراب و خستہ کیا اور ہمارے اوپر نفریں کرینگی۔ کہ ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہونے دیا۔

ہندو ایک دانشمند قوم ہے وہ وقتی اور ہنگامی جوش کے ماتحت کوئی کام نہیں کرتی بلکہ اس پر سنجیدگی سے غور کر لیتے ہیں اور قومی نفع و نقصان کا صحیح اندازہ کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندو یونیورسٹی پر حملہ ہوا تو پنڈت مدن موہن مالوی اور اُن کے رفقا سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوگئے۔ اور صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ ہم اس تحریک کے مخالف ہیں اس پر ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں لیکن بدقسمت مسلمان اپنے ہاتھوں اپنی درسگاہوں کے برباد کرنے پر آمادہ ہوگئے ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

قومی تعلیم اور اسکا نصب العین

حضرات! ہندوستان میں سب سے پہلے ترویج تعلیم کا خیال سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور فرزند سید محمود کے دماغ میں پیدا ہوا۔ اور اُن کے دیکھا دیکھی شمالی ہند کے ہندوؤں نے دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور میں اور مسز اینی بسینٹ نے بنارس میں ہندو کالج ۔ مسٹر تلک اور اُن کے رفقا نے پونہ میں اعلیٰ تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کی غرض و غایت یہ تھی کہ علوم جدیدہ کی جو تعلیم سرکاری یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں دیجاتی تھی وہ قومی خصوصیات اور روایات اور مذہبی تعلیم اور قومی تربیت سے معرا تھی۔ لہذا لیڈران قوم نے اپنی قیمتی زندگیاں ایسی درسگاہوں کے قائم کرنے میں صرف

گیں۔ جہاں علوم جدیدہ کے پہلو بہ پہلو مذہبی تعلیم اور قومی تربیت کا خاطر خواہ انتظام ہو۔ ان کوششوں اور مساعی جمیلہ سے جو نتائج ظہور میں آئے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ مسلمانوں کی قوم کے لیے علیگڑھ تحریک اور علیگڑھ کالج (جواب مسلم یونیورسٹی ہوگیا ہے) کے قیام اور اس کی تعلیم وتربیت نے وہ کام کیا جو ابر باراں خشک و پژمردہ کھیتی کے ساتھ کرتا ہے۔ علیگڑھ تحریک کے کسی سخت سے سخت مخالف کو بھی اس امر واقعہ سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں میں آج یہ جو کچھ ہو رہا ہے خواہ وہ قومی مذہبی تحریک سے موسوم کیا جائے۔ سیاسی و پولٹیکل جد وجہد سے ان سب تحریکوں اور اس تمام جوش وخروش کا مبدأ و ماخذ اور سرچشمہ علیگڑھ تحریک ہے۔

صاحبو! انسان کا کوئی کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ نقائص کی اصلاح ہر وقت ہوسکتی ہے۔ آج "قومی تعلیم" کا جو شور وغل ہر چہار طرف برپا ہے۔ آئیے ذرہ اس پر غور کریں کہ اس سے کیا مراد ہے ابھی تک کوئی مکمل یا نامکمل خاکہ میدان تحریک نے ملک وقوم کے سامنے پیش نہیں کیا کہ قومی تعلیم سے اُن کی کیا مراد ہے بجز اس مطالبہ کے کہ سرکاری امداد اور تعلق سے انقطاع کلّی کیا جائے۔ اس قسم کی تحریکیں اس سے پیشتر بھی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ماتحت بنگال میں زیر عمل لائی جاچکی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ بنگال نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل تقسیم بنگالہ ایجیٹیشن کے وقت قائم کی گئی۔ لیکن اس تحریک کا جو افسوسناک حشر باوجود فراہمی سرمایہ کے ہوا وہ عبرت آموزی کے لیئے موجود ہے کہ بالآخر تمام سرمایہ کلکتہ یونیورسٹی کے سپرد کردیا گیا۔ مسز اینی بسنٹ نے البتہ مدراس میں قومی تعلیم کا ایک سنٹر قائم کر رکھا ہے۔ لیکن ہنوز اس کی تعلیم مقبولیت عام حاصل نہیں کرسکی اور نہ اس کے نتائج خوش آیند معلوم ہوتے ہیں۔

حضرات! قومی تعلیم سے اگر یہ مراد لی جائے کہ تعلیم کے انتظام کی باگ قوم اور اہل ملک کے ہاتھ میں ہو تو میں عرض کرونگا کہ ریفارم اسکیم کے ماتحت صیغۂ تعلیم یکسر ہندوستانیوں کے زیر انتظام کردیا گیا ہے اور اگر اس سے مقصود یہ ہو کہ ذریعہ تعلیم ملکی زبان ہو تو میں دل وجان سے اس کا مؤید ہوں مگر یہ کام موجودہ نظام تعلیم کو درہم برہم کرکے انجام پذیر نہیں ہوسکتا اول تو ملک ہند میں سینکڑوں زبانیں رائج ہیں اور شاید بنگالی مرہٹی اور اُردو زبان کے علاوہ اور کوئی ایسی زبان نہیں کہ علوم جدیدہ کے علمی خزانہ کا قدر قلیل حصہ اس میں ترجمہ کیا گیا ہو اور جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا ہے ان زبانوں میں بھی بہت سے علوم کی کتابیں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ اول اس کی ضرورت ہے کہ ہر فن کے ماہر دیسی زبانوں کو علوم کی کتابوں سے مالا مال کردیں

اس قسم کی سب سے پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ ہے جو اعلیٰ حضرت حضور پرنور نظام خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کی شاہانہ سرپرستی و حاتمانہ فیاضی کے بدولت وجود میں آئی ہے۔ خدا تعالیٰ اس جامعہ کو کامیابی بخشے۔ لیکن حضرات اگر قومی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ بنی نوع انسان نے جو ذہنی علمی اقتصادی صنعتی و حرفتی ترقی کی ہے اور علوم و فنون کے ہر شعبہ میں بالخصوص سائنٹفک تحقیقاتوں میں حیرت انگیز اور ایجادیں کی ہیں ان سب سے نوجوانان قوم کو محروم کر کے محض قدیم علوم اُن کو سکھائے جائیں تو اے حضرات! میں اس تحریک کے خلاف اپنے کامل یقین کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے اور دوسرے حامیانِ تعلیم میں سے ایک متنفس بھی اس تحریک اور اس خیال کی تائید کے لیے آمادہ نہیں ہوگا۔

حضرات! - ہمارا پاک اور مقدس مذہب ہم کو تنگ خیالی و تنگدلی اور بیجا تعصبات سے باز رکھتا اور حکمت اور علم و فن کو ایک مومن و مسلم کی گمشدہ پونجی بتلاتا ہے دنیاوی علوم نافعہ خواہ وہ چین کے ہوں یا انگلستان کے جرمنی کے ہوں یا جاپان کے سیکھنے اور حاصل کرنے پر پیروان دین حنیف کو آمادہ و مستعد کرتا ہے۔ صاحبو! اب وہ زمانہ گیا جب کسی ملک کے باشندے اپنے ملک کی حدود میں بری بھلی زندگی بسر کر لیتے تھے۔ اب تو ایک ملک کا دوسرے ملک سے اور ایک برِّ اعظم کا دوسرے سے اس طرح رشتہ ملگیا ہے کہ تمام دنیا ایک بستی معلوم ہوتی ہے کیا دنیا کی موجودہ حالت کو پیش نظر رکھ کر کوئی سلیم الطبع شخص ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ تا وقتیکہ کسی ملک کے باشندے جدید سے جدید اور تازہ سے تازہ علم و فن اور ایجاد و اختراع کے ماہر ہوں اس دنیا کی شائستہ قوموں کی انجمن میں کوئی قابل عزت جگہ حاصل کر سکتے ہیں؟ -

الحضرات! موجودہ حالات کا اقتضاء تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اسکول اور کالج قائم ہوں۔ لٹریری تعلیم کے علاوہ صنعتی و حرفتی درسگاہیں کثرت کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں۔ اور ہندوستانیوں کو اپنے نوجوانوں کے قوائے ذہنی و دماغی کے ارتفاع کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب صیغۂ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں آگیا ہے پس اس سے بڑھ کر خودکشی کی اور کونسی مثال ہو سکتی ہے کہ محض ایک خیالی اور وہمی چیز کے لیے ہم ان فوائد سے دست کش ہو جائیں اور اپنے نوجوانوں کی ذہنی و علمی ہلاکت کے فتوے پر دستخط کر دیں۔

مسلم یونیورسٹی

حضرات! ایک طرف تو ملک کی بہبودی و فلاح کے یہ آثار نظر آئے ہیں کہ محکمۂ تعلیم ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آگیا اور ہم کو امید ہے کہ سال نو سے جب عملی طور پر ہندوستانی اس صیغہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو آہستہ آہستہ ملکی تعلیم کے لیے بہترین وسائل وتدابیر اختیار کرینگے دوسری طرف یہ امر باعث مسرت ہے کہ عین اس موقع پر جبکہ قومی تعلیم کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا مسلمانوں کی دیرینہ آرزو مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ظاہر ہوئی اور مسلمانوں کا مایۂ ناز کالج مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ اور قومی تعلیم کا دروازہ جس کو ہم ایک زمانہ سے کھٹکھٹا رہے تھے آخر کار کھل گیا۔ ہم کو امید ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے اعلان کے بعد حامیان قومی تعلیم از سر نو اپنی تعلیمی پروگرام پر غور کریں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ تعلیم کے متعلق جو اختیارات ان کو مسلم یونیورسٹی کی صورت میں حائل ہوئے ہیں ان سے جس قدر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جانا ممکن ہے اٹھایا جائے اور آئندہ مزید اختیارات کے حصول اور وسعت کاروبار کے لیے جدوجہد کی جائے جس کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔

حامیان قومی تعلیم کو غور کرنا چاہیئے کہ مسلم یونیورسٹی کے حاصل ہو جانے سے بہت سے اختیارات جو تعلیم پر ہم کو حاصل نہ تھے وہ اب ہم کو حاصل ہو گئے ہیں اور ہم اپنے طلبا کے لیے ایسا کورس تیار کر سکتے ہیں جو ہماری قومی ضروریات پر مشتمل ہو لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ خود موجودہ تعلیم میں جو نقائص بتائے جاتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ طلبا میں قومی جذبات اور مذہب کی عظمت نہیں پیدا ہوتی تو یہ درحقیقت تعلیم کا قصور نہیں ہے بلکہ تربیت کا ہے اور یہ پہلے بھی ہمارے لیے ممکن العمل تھا اور اب بھی ہے کہ ہم تربیت کا ایسا معقول انتظام کریں کہ جو طلبا میں قومی و ملکی خدمت کے جذبات پیدا کرے اور آزاد وسائل سے معاش حاصل کرنے کے قیمتی فوائد ان کو بتائے اور موجودہ حالات میں ہم بخوبی اسکا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ہم نے اور ہمارے برادران وطن یعنی اہل ہنود دونوں نے اسی موجودہ نظام تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ دونوں کی حالت مختلف ہے۔ ہندوؤں میں جو آزاد خیالی اور قومی خدمت کا جوش و ولولہ اور کام کرنے کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے ہم میں کہیں اسکا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا جو اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ ہماری قوم میں کوئی خاص اسلامی جذبہ نہیں ہے اور خانگی تربیت ناقص ہے۔

اگر ہمارے نوجوان تعلیم پانے کے بعد سرکاری ملازمت کی طرف جھکتے ہیں تو یہ بھی موجودہ

تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ کچھ تو ہمارے مخصوص حالات یعنی عام افلاس و بے مائیگی کا نتیجہ ہے اور کچھ ہماری موجودہ معاشرت اور سہل انکاری کا کہ ہم برادران وطن کی طرح مختلف وسائل سے دولت کمانے کی ہمت نہیں رکھتے میرا مقصد یہ ہے کہ اگر ہمارے یہاں تربیت کا معقول انتظام ہو اور ہم اپنی معاشرت کی اصلاح کریں تو موجودہ تعلیم کے نقائص کی تلافی بخوبی ممکن ہے اور برادران وطن کی نظیر ہمارے سامنے موجود ہے۔ لیکن اگر خود ہم میں صلاحیت نہ ہو تو خواہ تعلیم ہمارے ہاتھ میں کیوں نہ ہو ہم اس سے کوئی فائدہ اٹھا نہیں سکتے کوئی تعلیمی اسکیم ایسی نہیں پیش کی جا سکتی کہ ہم خود کسی قسم کی جد و جہد نہ کریں اور پھر بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ہمارے سامنے کئی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں کو مختلف اوقات میں گورنمنٹ کی طرف سے بعض تعلیمی رعایتیں دی گئیں اور سہولتیں پہنچائی گئیں۔ لیکن انھوں نے اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھایا مثلاً گورنمنٹ بمبئی نے وظائف، فری اسٹوڈنٹ شپ وغیرہ کی شکل میں مسلمانوں کو بہت سی مراعات دیں لیکن مسلمانوں نے ان سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا جو بجائے خود افسوسناک ہے۔ اسی طرح حکومت صوبہ جات متحدہ نے ابتدائی تعلیم کی مزید وسعت و اشاعت کے لیے یہ رعایت مسلمانوں کے لیے تجویز کی تھی کہ جہاں بیس[2] مسلمان لڑکے پڑھنے والے موجود ہوں وہاں خاص مسلمانوں کے لیے ایک ابتدائی اسکول کھول دیا جائے مسلمانوں کو اگر تعلیم عزیز ہوتی اور کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تو اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر ایک ایک قصبہ اور قریہ میں اسکول قائم کر دیتے لیکن یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ مسلمانوں نے اس تجویز سے کہاں تک فائدہ اُٹھایا۔ اسی طرح کے اور متعدد واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ جو کچھ ہم کر سکتے تھے اور جو کچھ ہم کو کرنا چاہیئے تھا ہم نے وہ بھی نہ کیا اور جو رعایتیں ہم کو وقتاً فوقتاً دی گئیں ہم نے ان سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا پس جب ہماری یہ حالت ہے کہ جو کچھ ہم بسہولت کر سکتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے تو کون شخص یہ توقع کر سکتا ہے کہ ہم میں اب اس حد تک احساس اور عملی قوت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم قومی تعلیم کا اپنے تمام ملک میں تنہا اپنے بل پر انتظام کر لیں گے۔ بلکہ ہم کو اپنی صلاحیت ثابت کرنا چاہیئے اور اس کا ثبوت دینا چاہیئے کہ ہم میں ایسی عملی قوتیں پیدا ہو گئی ہیں اور اس کا ثبوت یہی ہے کہ کام کر کے دکھایا جائے اور سب سے پہلے تعلیمی تجربہ حاصل کیا جائے۔

حضرات! میرے خیال میں ہمارے لیے کام کرنے کا بہترین موقع یہ ہے کہ ہم مسلم یونیورسٹی سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور عملاً یہ ثابت کر دیں کہ جو انسٹیٹیوشن ہمارے ہاتھ میں ہو اس کو ہم بغیر استعانت کسی دوسرے کے بخوش اسلوبی چلا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے اس میں کامیابی حاصل کی تو

ہمارا دوسرا قدم قومی تعلیم کی سرحد پر ہوگا۔ اور اگر آج ہم پر کسیقدر قیود و پابندیاں لازم ہیں تو کل نہ ہونگی۔ یعنی جبکہ ہمارا عملی اقتدار مستحکم نہ ہو جائیگا اور ہمارے کام کو قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی اور مزید مطالبات میں ہمارے ہم آہنگ ہوگی۔ لہذا میں پھر عرض کروں گا کہ بہترین طریق کار یہی ہے کہ آج جو یونیورسٹی ہمارے ہاتھ میں دیگئی ہے اور جو درحقیقت ہماری پچاس سالہ کوششوں اور امیدوں کا نتیجہ ہے اس سے ہم اپنی قوم کو جہاں تک فائدہ پہنچا سکتے ہیں پہونچائیں۔

علیگڑھ مسلمانوں کی پچاس برس کی کوششوں اور ان کے بہترین دماغوں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور مسلمانوں نے اس پر بہت کچھ صرف کیا ہے لہذا اس زمانہ میں جبکہ ہماری دیرینہ آرزو مسلم یونیورسٹی کی صورت میں نمودار ہوئی ہے یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ ہم علیگڑھ سے دستکش ہو جائیں۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم جس منزل تک پہونچے تھے اس سے واپس جائیں اور از سر نو اپنا سفر شروع کریں حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ مردانہ وار آگے قدم بڑھائیں تاکہ مستقبل قریب میں قومی تعلیم کو حاصل کر سکیں۔

حضرات! ستمبر کے اجلاس کونسل میں جب یونیورسٹی بل معرض بحث میں تھا تو میں نے چند ترمیمات پیش کی تھیں جو اگرچہ سب منظور نہوئیں تاہم ان میں سے بعض منظور ہوئیں جو فائدہ سے خالی نہیں ہیں اس وقت مسلم یونیورسٹی ایکٹ کا ہندو یونیورسٹی ایکٹ سے مقابلہ کرتے ہوئے اخبارات میں اس پر اظہار افسوس کیا گیا تھا کہ مثل ہندو یونیورسٹی کے اسکولوں کے الحاق کا حق مسلم یونیورسٹی کو نہیں دیا گیا لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے گورنمنٹ نے اپنے مابعد کے اعلان میں یہ حق مسلم یونیورسٹی کو دیدیا ہے ایسی حالت میں گویا ہمارے لیئے کام کرنیکا ایک وسیع میدان موجود ہے اور اگر ہم کام کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ موجودہ حالت میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ نسبتاً ہندو یونیورسٹی ایکٹ سے بمراتب بہتر ہے اور یہ امر ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہے کہ ہندو یونیورسٹی چند سال سے بغیر گورنمنٹ کی مداخلت کے آزادی سے اپنا کام کر رہی ہے درآنحالیکہ جب ابتدا میں بعض ضابطہ کی قیود و پابندیوں کے ساتھ ہندوؤں نے یونیورسٹی کا لینا قبول کیا تو بہت کچھ شکوک وشبہات ظاہر کیئے جاتے تھے۔ لیکن واقعات نے بتادیا کہ کام کرنے والے باوجود تمام دشواریوں کے کام کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس میں بھی کچھ خدا کی مصلحت تھی کہ یونیورسٹی کے معاملہ میں تاخیر ہوتی رہی جس سے ہم کو ایک تو ہندو یونیورسٹی کے طریق عمل سے تجربہ حاصل کرنے کا موقعہ ملا دوسرے ہم نسبتاً بہتر شرائط پر یونیورسٹی حاصل کر سکے۔ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں اب بھی جن اصلاحوں کی ضرورت ہے اُن کے حاصل کرنے کے لیئے ہم کو جد وجہد برابر جاری رکھنی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں جلد تر مڈیکل اور ٹیکنیکل تعلیم کا انتظام کیا جائیگا اور رفتہ رفتہ

یونیورسٹی ان تمام ضروری شعبہائے تعلیم پر محیط ہو گی جن کی موجودہ زمانہ میں ہر زندہ قوم کو ضرورت ہے۔

کانفرنس کے پروگرام میں تبدیلی

حضرات! مسلم یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ اس امر کی ضرورت ہے کہ قوم میں بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق صحیح خیال پیدا کیا جائے اور یہ بدون اس کے ممکن نہیں کہ مسئلہ تعلیم کے متعلق ضروری و مفید معلومات اُردو زبان میں کتابوں اور رسالوں کی شکل میں مہیا کی جائیں۔ یہ کام کانفرنس کے انجام دہی کے لائق ہے میں سمجھتا ہوں کہ کانفرنس کو اب اپنے پروگرام میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے نہ صرف اس لیے کہ حالات بدل گئے ہیں بلکہ اس کے لیے بھی کہ صیغۂ تعلیم خود تمہارے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے اس کی شکل یہ ہے کہ صیغۂ تالیف و تصنیف، اسلامی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کرنا۔ ان کے لیے ٹریننگ قایم کرنا۔ کانفرنس کو اپنے دائرۂ عمل کا ضروری جزو قرار دینا چاہیے۔ اسی طرح اسے اعلیٰ پیمانہ پر تجارتی اور صنعتی تعلیم کے لیے وظائف و مدارس کے ذریعہ نوجوان مسلمانوں میں شوق و تحریص پیدا کرنا چاہیے۔ تاکہ جو بعد میں اپنی نادار قوم کو خوشحال بنانے کا باعث بنیں۔ میں اس ضرورت سے انکار نہیں کرتا کہ سالانہ جلسہ منعقد کیا جائے۔ مختلف صوبوں کے حامیان تعلیم یکجا ہو کر تبادلہ خیال بھی کریں اور آپس کے مشورہ کے بعد تجاویز قرار دیں لیکن یہ کام ہر صوبہ کی پراونشل کانفرنسیں زیادہ سہولت اور عمدگی کے ساتھ انجام دے سکتی ہیں۔ آل انڈیا کانفرنس کے اجلاس صرف ان حضرات ہی تک محدود رکھے جاویں جن کو اپنی قوم کی تعلیمی ضروریات کا ذاتی علم ہو اور جو عملاً یہ کام انجام دے رہے ہوں لیکن ہر صوبہ میں آل انڈیا کانفرنس کی شاخیں قائم ہوں جو تبلیغ و اشاعت کا کام اپنے ذمہ لیں۔ آل انڈیا کانفرنس کے جلسے اس شان و نوعیت کے ساتھ منعقد کرنے کی ضرورت نہیں جیسے اب تک ہوتے آئے ہیں۔ اس کانفرنس نے اپنا بڑا فرض بخوبی انجام دیدیا۔ اب جو کام ہے ایکسپرٹ لوگوں کے باہمی مشورہ کے بعد ضروریات قوم پر اظہار رائے کے طور سے کیا جائے اور اس کام کے لیے کسی عام اژدہام کی نہ ضرورت ہے اور نہ حاجت۔ یہ دونوں مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ کانفرنس کے قبضے میں کافی سرمایہ ہو اور پراونشل کانفرنس قائم کرنے اور ان کو باقاعدہ چلانے پر ہر صوبہ کے لائق اور تعلیم سے واقف مسلمان متوجہ ہوں جب تک پراونشل کانفرنسیں قائم ہو کر کام کریں اس کانفرنس کو اپنی خدمات موجودہ شکل میں ہی جاری رکھنی چاہئیں میں امید کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر خاص توجہ کیجائیگی

اور آیندہ کے لیے ایک معین پروگرام پیش نظر رکھا جائیگا۔

مسلمانان برار کی تعلیم

حضرات! ہمیں بتایا گیا ہے کہ شروع میں برار میں بہت کم اسکول تھے اور ان میں مسلمان طلبا کی تعداد بہت کم تھی۔ خان بہادر منشی نظام الدین انسپکٹر مدارس صوبہ متوسط کی مساعی جمیلہ کے باعث ایک محمڈن ہائی اسکول امراوتی میں قائم کیا گیا جو شاید ملک بھر میں اپنی مثال نہیں رکھتا ہے اس مدرسہ کا ایک اور مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اس کے متعلق ایک مسجد موسوم بہ عثمانیہ مسجد تعمیر کی گئی ہے جس کے لیے چندہ جناب مولوی عبدالقادر صاحب۔ اور خواجہ لطیف احمد صاحب نے بسعی تمام جمع کیا اور جس کو ہز اگزالٹیڈ ہائنس حضور نظام کی جانب سے گرانقدر عطیات متعدد بار دیئے گئے حقیقت یہ ہے کہ مسلمانان ہند حضور نظام والی دکن کے مراحم خسروانہ کے ہر موضع اور ہر موقع پر ممنون و مرہون ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اور ہر جگہ مذہبی تعلیم پر زور دیا ہے اور امراوتی ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسجد عثمانیہ کے وجود سے صوم و صلوٰۃ کی پابندی پر یکساں زور دینا ان کی طبائع کے عین موافق ہے۔ جہاں امراوتی ہائی اسکول کی بابت تمام معاملات مسرت انگیز ہیں۔ وہاں یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ بعض پرائمری اور مڈل اسکول جن کو امتحاناً کچھ عرصہ کے لیے کھولے رکھا گیا تھا۔ عنقریب بند کر دیئے جائینگے۔ کیونکہ ان میں طلبا کی کافی تعداد نہیں پائی جاتی استقبالیہ کمیٹی کے محترم صدر جناب خان بہادر نواب محمد سلام اللہ خانصاحب نے ابھی فرمایا ہے کہ اس ہائی اسکول کے لیے کمتر درجہ کے اسکولوں کا وجود بھی ضروری ہے تاکہ وہاں سے طلبا ابتدائی تعلیم حاصل کر کے اس مدرسہ میں شریک ہوا کریں میری رائے میں حکام سے گزارش کرنی چاہیئے کہ کم از کم میعاد امتحان کی توسیع کر دی جائے اور ساتھ ہی اُس کے ہم کو سخت کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ نقص جو قلیل تعداد طلبا کی وجہ سے بیان کیا جاتا ہے فوراً رفع ہو جائے ہم کو حکام سے ایک اور مسلمان ڈپٹی انسپکٹر اسکول کے لیے گزارش کرنا ہے تاکہ برار کے ہر ایک ضلع میں ایک ڈپٹی انسپکٹر ہو جائے۔ اور یہ بھی التماس کرنا ہوگا کہ ان افسروں کے دفاتر باقاعدہ مکانوں میں رکھے جائیں جیسے کہ اور افسروں کے رہا کرتے ہیں۔

آپ صاحبوں نے ابھی سنا ہے کہ کون کون سی رکاوٹیں تعلیم نسواں کی راہ میں صوبہ برار میں

حائل ہیں۔ یہ رکاوٹیں اس صوبہ کے لیئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے تمام اقطاع میں پائی جاتی ہیں لیکن یہ مسئلہ تعلیم نسوان اب ایک پیچیدہ مسئلہ نہیں رہا۔ قوم نے اس کی طرف توجہ کرنی شروع کر دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ دن بدن تعلیم نسوان عروج پکڑے گی اور قوم اس سے مستفید ہوگی۔

تتمہ

حضرات! قبل اس کے کہ میں خطبۂ صدارت کو ختم کروں میں اپنے مخدوم و مکرم جناب مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کی کمال دوراندیشی اور بصیرت کا اعتراف کرونگا کہ انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس برار میں منعقد تجویز فرمایا۔ جب سے جناب نے اس کانفرنس کی باگ اپنے مبارک ہاتھوں میں لی ہے آپ نے ایسے مقامات میں اجلاس کیئے کہ جہاں مسلمان تعلیم سے بہت ہی کم دلچسپی لیتے تھے اور جہاں تعلیم کی منادی کرنا نہایت ضروری امر تھا میں امید کرتا ہوں کہ جناب اس طرز عمل کو جاری رکھیں گے جس سے قوی امید ہے کہ تعلیم کی روشنی بہت جلد پھیل جائیگی۔ دو ہی سال ہوئے کہ اس کانفرنس کا اجلاس شہر سورت میں ہوا تھا جہاں اب مسلمانوں نے طلبا کے لیئے ایک شاندار دارالاقامہ قائم کر دیا ہے اور سنا گیا ہے کہ وہاں کے ایک معزز تاجر نے چالیس لاکھ کی گرانقدر رقم مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دینے کی نیت کی ہے۔ قوم اسی طرح بنتی ہے کہ ہر شخص اپنی حیثیت کے موافق قومی ترقی میں امداد و اعانت کرے دولتمند اپنی دولت سے علمائے کرام اپنے علم سے۔ مشائخان عظام اپنی برکت سے۔ سپاہی اپنی جرات سے اصحاب فنون اپنے صنعت و حرفت سے غرضکہ ہر ہر شخص اپنے معلومات اور قدرت کے موافق قومی تعمیر کا اسباب مہیا کرنے میں کوشش کرے۔

تا توانی بجہاں حاجت محتاج برآر
بدرمے یا قدمے یا درمے یا سخنے

آؤ ہم سب مسلمانوں اور خاصکر برار کے مسلمانوں کے دینی اور دنیوی ترقی کی خدا سے دعا مانگیں کہ خدا تعالیٰ اس صوبہ کے مسلمانوں کے دلوں کو قومی ترقی کی طرف مائل کر۔ ان کی تمام جائز اور مناسب کوششوں میں برکت دے۔ ایجوکیشنل کانفرنس اور اس صوبہ کے مسلمانوں کے ملاقات باہمی اور اختلاط کو مسلمانوں کے ترقیات دینی و دنیوی کا باعث کر۔ اے خدا تو قدرت والا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

آنریبل خان بہادر میاں سر محمد فضل حسین
صدر اجلاس سی و پنجم (علی گڑہ سنہ ۱۹۲۲ ع)

اجلاس سی و پنجم

(منعقدہ علی گڑھ ۱۹۲۲ء)

صدر خان بہادر آنریبل سر میاں فضل حسین صاحب

حالات صدر

میاں فضل حسین پشاور میں جون ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے وہ نسباً راجپوت ہیں آپ کے والد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر مامور تھے۔ چھ سات برس کی عمر میں ان کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ زمانۂ طفولیت میں میاں صاحب کی صحت خراب تھی اور بہت نحیف الجثہ نظر آتے تھے لیکن لکھنے پڑھنے میں شروع سے شوق اور ذہانت کے آثار پائے جاتے تھے۔ چنانچہ انیس برس کی عمر میں بی اے کی ڈگری لی ۱۸۹۸ء میں بغرض تعلیم قانونی انگلستان گئے اور وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۱ء میں ہندوستان واپس آئے۔ زمانہ طالب علمی میں انھوں نے علم کی مختلف شاخوں مثلاً انگریزی ادب، تاریخ، سیاست، علم نفسیات۔ قانون اور ادب عربی پر کافی طور سے توجہ کر کے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ مختلف سوسائٹیوں، انجمنوں اور اخباروں میں تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے اظہار خیالات کی عادت ڈالی تھی۔ بہ حیثیت بیرسٹر کے سب سے پہلے ضلع سیالکوٹ میں کام شروع کیا ان کی قانونی لیاقت کی شہرت بہت جلد پھیل گئی اور کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ آپ اوّل درجہ کے قانون داں بیرسٹروں میں شمار ہونے لگے۔ ۱۹۰۵ء سے آپ نے اپنی پریکٹس چیف کورٹ پنجاب میں شروع کر دی۔ چیف کورٹ میں اپنی قابلیت کو نمایاں اور ترقی دینے کا زیادہ موقع ملا اور اب آپ ضلع کے علاوہ صوبہ کے ممتاز بیرسٹروں میں تسلیم کیے جانے لگے، اسی زمانہ میں آپ نے سودیشی تحریک میں اور ترکوں کی حمایت میں خاص طور سے حصہ لیا نیز اسلامیہ کالج لاہو

کے آنریری پرنسپل کی خدمت میں کچھ عرصہ تک انجام دی۔ سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک اسلامیہ کالج
لاہور کے نظم و نسق اور انتظام کا حصہ آپ ہی کی توجہ کا منت پذیر رہا۔ اور اس کو موجودہ درجہ تک
ترقی دینے میں آپ کے مساعی کا غیر معمولی حصہ ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء تک دس سال پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر اور سنہ ۱۹۰۹ء کے بعد سے اکثر پنجاب
یونیورسٹی کے ممتحن رہے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں لیجس لیٹو کونسل میں یونیورسٹی کی طرف سے قائم مقام منتخب ہو کر آپ بھیجے گئے کونسل
میں اہل صوبہ کی حفظ صحت اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق آپ نے کافی طریقہ سے زیادہ توجہ کی اور سنہ ۱۹۱۶ء سے
سنہ ۱۹۱۹ء تک سیاسی تحریک میں پوری دلچسپی اور جوش کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا، ہندو مسلمانوں میں
یک جہتی اور اتفاق کے خیالات پیدا کرنے میں آپ کو کامیابی ہوئی اور اس وقت سے صوبہ پنجاب
میں بہ حیثیت مقتدر لیڈر کے آپ سمجھے جانے لگے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں باوجود شدید مقابلہ کے جدید کونسل پنجاب کے آپ ممبر منتخب ہوئے، اور پھر اسی
کونسل میں وزیر تعلیم کا عہدہ پایا اس عہدہ پر پہونچ کر تعلیمی امور میں آپ کی دلچسپ کوششیں، حسن
قابلیت، وبہترین تدبیر کا ذکر زمانہ دراز تک باقی رہے گا۔ گو ہندو پریس اور ہندو تعلیم یافتہ طریقہ نے محض
اتنی سی بات پر کہ آپ نے سررشتہ تعلیم میں نسبتاً اس حق سے بھی کم جو مسلمانوں کو ان کی نسبتی تعداد سے
ملنا چاہیئے تھا دیئے جانے کی خفیف ہمت کی تاہم میاں صاحب کے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا
رکھی گئی۔

سر ممدوح نے سنہ ۱۹۲۲ء میں (۶) لاکھ کا تعلیمی بجٹ منظور کرایا جس کی مدد سے ڈسٹرکٹ بورڈوں
میں ابتدائی اور دیسی مڈل اسکولوں کی عمارتیں تیار کی جاویں آپ نے ڈسٹرکٹ بورڈوں کو اعلیٰ تعلیم کے
بار سے سبک دوش کر کے ان پر صرف ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری باقی رکھی۔

ممبری کونسل کے زمانہ میں اور وزارت کے عہد میں اپنی ذمہ داری حقیقی طور پر سمجھنے کی
ضرورت کو مسلمانوں میں جس طرح آپ نے محسوس کیا اور جس قابلیت اور حسن تدبیر کا ثبوت پیش کیا اس
کی سر موصوف پہلی مثال ہیں۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کمیٹی نے آپ کو کانفرنس کے اجلاس کا صدر منتخب
کیا اس موقع پر صدر کی جانب سے جو خطبہ دیا گیا اور جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے اس وقت کے
اجلاس میں اور اس کے بعد عام طور پر جب اخبارات میں اس پر تنقید اور تبصرہ کیا گیا تو عام طور پر

یہ بات کہی گئی اور لکھی گئی کہ ایسا عمدہ اور فاضلانہ ایڈریس صدر کی جانب سے اب تک اجلاس کانفرنس میں نہیں پڑھا گیا۔

نوٹ۔ سرمیاں فضل حسین صاحب کے حالات رسالہ شباب اردو اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئے ہیں یہ انہیں کی تلخیص ہے۔

خطبۂ صدارت

انتخاب صدارت ادائیگی فرض کا مطالبہ ہے

حضرات! اگر رسوم وعوائد کی پابندی کی جائے۔ تو یہ ناگزیر ہے۔ کہ میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کا دلی شکریہ ادا کروں۔ جو آپ نے مجھے اس مہتم بالشان مجلس کا صدر منتخب کر کے مجھ پر ارزانی فرمائی ہے +

ان سربرآوردہ اکابر قوم سے واقفیت رکھتے ہوئے جو سال بسال اس ممتاز حیثیت پر فائز ہوتے رہے ہیں۔ یہ کرسی صدارت ہر شخص کے لئے مایۂ فخر ومباہات متصور ہو سکتی ہے +

اس عزت افزائی کے لئے مجھے اپنی ناقابلیت کا اس قدر اعتراف تھا۔ کہ اگر میں اس عطیہ کو صرف اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا۔ تو اس کو قبول کرنے کی جرأت کبھی نہ کر سکتا مگر میں نے محسوس کیا۔ کہ یہ مطالبہ حقیقت میں وہ مطالبہ ہے جو کسی پُرخطر زمانے میں ملک ایک سپاہی سے اس کے فرض کی ادائے گی کے متعلق کرتا ہے۔ اور جب میں نے اس پر اس زاویہ نگاہ سے نظر ڈالی تو میں انکار نہ کر سکا +

پچھلے دو برس کے دوران میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا کوئی اجلاس منعقد نہیں ہوا۔ اور یہ دو سال شاید ان سے قبل کے بیس سالوں سے زیادہ وقیع اہمیت رکھتے ہیں۔ اس عرصے میں بہت سے ایسے مشکل مسائل پیدا ہوئے ہیں جو آپ کی توجہ کے محتاج ہیں۔ اس لئے یہ کام مجھے اور بھی مشکل نظر آیا۔ اور میں اپنے آپ کی رہنمائی کے مشکل فرض کی انجام دہی کے ناقابل تصور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر میں نہ چاہتا تھا۔ کہ میں اپنی رائے کو ان لوگوں کی رائے پر فوقیت دوں۔ جن کو قوم کی طرف سے یہ عزت تفویض کی گئی ہے۔ کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے شرکائے کار میں سے کسی ایک کو اس ممتاز جگہ پر سرفراز کرنے کے لئے منتخب کریں۔ پس اس سپاہی کی طرح جو ادائیگی فرض کے مطالبہ کا جواب دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ نہ کہ ایک رہنمائے قوم کی مانند جو اپنے کام کی انجام دہی کی قابلیت محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا۔

میں کوشش کروں گا۔ کہ میں تمام نقطہ ہائے نگاہ کو مدنظر رکھوں۔ اُن کو آپ کے غور و خوض کے لئے آپ کے سامنے پیش کروں اور ایک راہ مستقیم تلاش کرنے کے عزم صمیم میں حتے المقدور آپ کی اعانت کروں۔ تاہم یہ آپ کے تعاون ہی کی توقع ہے۔ جو مجھے امید دلاتی ہے کہ میں اس مشکل خدمت سے ایک تسلی بخش طریق پر عہدہ برآ ہو سکوں گا +

خطبۂ صدارت کی مشکلات اس سے پیشتر کہ میں اس فرض کی انجام دہی کا کام شروع کروں۔ آپ حضرات متوقع ہوں گے۔ کہ میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھوں۔ ہم سب جانتے ہیں۔ کہ خطبۂ صدارت ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مگر ہم شاذ و نادر ہی اس کی اہمیت کو اس کی تیاری سے پہلے محسوس کرتے ہیں۔ اس کی مشکلات کا اندازہ کر چکنے کے بعد ہم ہمیشہ عہد کر لیا کرتے ہیں۔ کہ آیندہ اپنے آپ کو اس مشکل کا سامنا کرنے سے بچائیں گے۔ مگر انسانی فطرت اس قدر کمزور ہے۔ اور تقدیر ہم پر اس قدر مضبوط قابو رکھتی ہے۔ کہ ہم زمانہ گزشتہ کی تکلیفات کو بھول جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو پھر مشکلات میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ تاہم میرے سامنے یہ کام بے انتہا مشکلیں پیش کر رہا ہے۔ مجھ سے پہلے میرے تینتیس نامور پیش رو مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مسائل پر تینتیس خطباتِ صدارت پڑھ چکے ہیں۔ اور چیدہ سے چیدہ الفاظ میں خوبصورت سے خوبصورت خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ میرے لئے ناممکن ہے۔ کہ میں ان خیالات میں کسی قسم کی ایزاد کر سکوں۔ یا اپنے اظہار میں ان کے انداز بیان سے بہتر خوبیاں دکھا سکوں میرے ایک دوست نے مجھے ایک نرالی تجویز سجھائی۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ میں اپنے پیش رووں کے شاندار خطباتِ صدارت میں سے چیدہ چیدہ اقتباسات جمع کر کے اپنا خطبۂ صدارت ترتیب دے لوں۔ مگر یہ کام بے انتہا مشکل تھا۔ کیوں کہ نہایت ہی منتخب تقاریر میں سے انتخاب کرنا نہایت ہی دشوار ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کا خطبۂ صدارت ایک ایسی پچی کاری کی مانند ہو جاتا جس کا نظارہ محیر العقول ہوتا +

مسئلۂ تعلیم مسلمانان ماضی کے شاندار خطباتِ صدارت تاہم حضرات! اس وقت میرا ارادہ نہیں ہے۔ کہ میں اسلام کی شاندار ماضی کا ذکر شاندار الفاظ میں کروں۔ میرا ارادہ یہ بھی نہیں ہے۔ کہ میں آپ کے سامنے اسلام کے مشہور اور غیر فانی مصنفین فلاسفہ اور علما کے مرقعے پیش کروں نہ ہی میرا مقصد اس سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کہ زمانۂ قدیم کی اُن عدیم المثال درسگاہوں کے کارنامے سناؤں۔ جن کی شہرت اپنے زمانہ میں بے ہمتا تھی۔ آپ نے بغداد اور قرطبہ کی داستانیں اس قدر کثرت سے سُنی ہوں گی۔ کہ آپ ان درسگاہوں کے افسوس ناک خاتمہ سے بیزار ہو گئے ہوں گے۔ اس لئے میں فرض لئے لیتا ہوں۔ کہ آپ کا ماضی ایک ایسا ماضی ہے جو اپنے زمانہ میں کوئی دوسری نظیر نہ رکھتا تھا۔

موجودہ حالتِ زبوں | اسی سلسلہ میں ایک اور موضوع ایسا آتا ہے جو فرسودہ مباحث سے فرسودہ ہو چکا ہے۔ اور جو آپ کے دور موجودہ کی ایک داستانِ رسوا ہے۔ یہ ایک ایسی مفلوک الحال اور مایوس قوم کی دل شکن تصویر ہے۔ جو ذاتی اعتماد کھو چکی ہو۔ اور جو اپنے ماضی ہی کے نام پر مراعات کی دربدر بھیک مانگتی ہو۔ اس تصویر کو نہایت شوخ رنگ آمیزیوں سے کھینچا گیا ہے۔ اور غالباً اس قدر شوخ رنگ آمیزیوں سے، کہ وہ حقیقی حالت ظاہر کرنے سے عاری ہے۔ اگر آپ صرف اپنے ہمسایوں یا حکام کی امداد پر ہی اعتماد رکھتے تو آپ کوئی ترقی نہ کر سکتے۔ تاہم آپ کو خدا کی برکات سے ناامید نہ ہونا چاہیے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اور میں یہ بھی کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کو اُس وقت تک مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ جب تک آپ کو آخرکار اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی توقع ہے۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ اس دردناک تصویر کو آپ کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لئے اُسی شوخ رنگ آمیزی سے پیش کروں۔ کچھ تو اس لئے کہ آپ اُسے کافی سے زیادہ عرصہ تک دیکھتے رہے ہیں لیکن زیادہ تر اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ اب ایسی تصویر حقیقتِ حال کو پیش نہیں کرتی +

نظامِ عمل | اس کے علاوہ ایک اور موضوع ہے۔ کہ ہم اپنے نظامِ ملی کو اس طرح سے ترتیب دیں۔ کہ وہ گاؤں کی مسجد سے شروع ہو کر ضلع کی انجمن اور صوبہ کی کانفرنس کے منازل طے کرتا ہوا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ختم ہو جائے۔ اس موضوع پر بھی بسا اوقات بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن یہ خطباتِ صدارت، کام کرنے والی جماعت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے +

عالمِ اسلام کی بے چینی | غرض کہ ان مشکلات کے بعد جو میرے راستے میں حائل تھیں مجھے اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ صورتِ حالات اکثر وجوہ سے میرے موافق بھی ہے۔ کیوں کہ دنیا پُر آشوب دَور سے گزر چکی ہے۔ علمی مطامحِ نظر بے رحمی سے متزلزل کئے جا چکے ہیں جن کی از سرِ نو ترتیب میں ترقی یافتہ ممالک کے بہترین دماغ متوجہ و مصروف ہیں +

مسلمانانِ عالم کے دلوں پر نہایت ہی الم ناک اور وحشت خیز جذبات گزر رہے ہیں۔ اجتماعِ بشری ماضی وحال سے غیر مطمئن ہو کر معاشرت وحکومت کے نظام کو از سرِ نو ترتیب دینے کے لئے راہیں تلاش کر رہا ہے +

تحریکِ عدمِ تعاون | ۱۹۱۹ء کی تینتیسویں کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ سے ہندوستان میں بھی نئے نظریاتِ تعلیم تجویز کئے اور ترتیب دیئے گئے ہیں۔ تحریکِ عدمِ تعاون نے نہایت شدومد سے تعلیم کے مقصدوں اور طریقوں کو مطعون کیا ہے۔ اور تجویز اصلاحاتِ حکومت کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

تعلیم بحیثیت امر منتقلہ | محکمۂ تعلیم اب صوبہ واری امور منتقلہ سے متعلق ہے۔ اور اقتدار صوبوں کے حکمرانوں کی ذات، اور مرکزی حکومت ہند سے منتقل ہو کر مقامی مجلسِ واضعِ قوانین کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اور اس نقلِ اختیار نے نہایت مشکل اور نازک مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن کے لئے بہت ہی محتاط اور غائر مطالعہ کی ضرورت ہے۔ آپ کا نظامِ ترکیبی یعنی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نظام بھی نکتہ چینیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور یہ سوال اُٹھایا ہی گیا۔ کہ آیا ہم ان قومی میلوں کے انعقاد کو جاری رکھیں۔ یا اب وقت آگیا ہے کہ کام کرنے والوں کی ایسی مجلس منعقد کرنے کا انتظام کیا جائے جس کا تعلق عمل کاروبار سے ہو؟

یہ مشکل مگر دلچسپ اور اشتعال انگیز مسائل ہیں۔ اور اپنے حل وعقد کے لئے زیادہ قابلیت اور پختہ کاری کے طالب ہیں۔ لیکن میری تسکین کا باعث یہ مقولہ ہے کہ "جب خدا انسان پر ایک تیا بار ڈالتا ہے۔ تو خود ہی اُس کا سہارا بن جاتا ہے"۔

اس لئے ناگزیر ہو گیا۔ کہ ان دو یا تین اہم سنین کے بعد صنم کدۂ تعلیم کے پرستاروں کی ایک مجلس منعقد کی جائے، اور اس سے بڑھ کر اور کون سا اقتضائے قدرت ہو سکتا تھا، کہ یہ تمام پرستار علی گڑھ کی طرف کھنچ آئیں۔ جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا تھا۔

"تاثیر ہے کیا خاک میں اس نجد کی کہہ دے
تو مجھ سے تو یار ے
ہر پھر کے جو آنکلے ہے یاں ناقۂ لیلے
اسے جذبِ محبت"

تعلیمی عدم تعاون | اب میں تحریکِ عدم تعاون کی طرف، جس حد تک کہ اُس کا علاقہ مسئلۂ تعلیم سے ہے، رجوع ہوتا ہوں۔

تحریک عدم تعاون کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ مگر جہاں تک اس کا علاقہ مسئلۂ تعلیم سے ہے، اُس کا ظہور ایک سال کے بعد یعنی اگست ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

تعلیمی عدم تعاون کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی تنقیدی اور ترکیبی۔ جس حد تک تنقیدی عدم تعاون کا تعلق ہے۔ اس تحریک نے موجودہ نظام تعلیم پر حملہ کیا ہے، اور تعلیم کی بے روح یکسانیت، عدم تنوع اور فطرتِ مجہول کی طرف اشارات کئے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ تعلیم انسانوں کو بھیڑوں کے گلوں کی طرح ہنکاتی ہے۔ اور یہ نظام کوئی تشخص، یا بداعت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ تعلیم قومی نہیں بلکہ اجنبی ہے۔ اور اس کے ذریعے سے دماغوں کی پرداخت مشرقی انداز پر نہیں ہوتی بلکہ مغربی انداز پر ہوتی ہے۔ اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس تعلیم میں مشرقی مذہبیت کا رنگ مفقود اور مغربی دہریت کا عنصر غالب ہے۔ اور اس سے بھی متجاوز ہو کر کہا جاتا ہے کہ یہ تعلیم زیادہ تر نظری ہے۔ اور صرف غلامانہ ذہانت پیدا کر سکتی ہے۔ اس میں تحقیق کی روح نہیں پائی جاتی۔ یہ تمام اعتراضات تو اصول تعلیم پر وارد کئے گئے ہیں۔ اب رہا طریقہ تعلیم، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امتحانات، اس نظام کی سب سے بڑی نحوست ہیں۔ اور حکام اچھے اساتذہ پیدا کرنے اور تعلیم کو عام کرنے میں ناکام ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس مسلک کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ نظام ایک انسانی نظام تھا، اور اس میں ترقی کی گنجایش تھی۔ بعض نقائص تو اس مسلک کے رونما ہونے سے پہلے ہی پیش نظر تھے۔ مگر اس تنقید کا بہت سا حصہ اُن ممالک کے لئے دلیلِ راہ ہو سکتا ہے، جس کو حکومت خود اختیاری میسر ہے۔ اور جہاں بیرونی اقتدار کو دخل حاصل نہیں۔ اُن نقایص میں بعض جو حامیانِ عدم تعاون نے نہایت شد و مد سے بیان کئے۔ ایسے نقائص بھی ہیں جو ایسے نصاب تعلیم میں متوارث ہوتے ہیں۔ درسِ نظامیہ میں بھی آخر کار یہی نقائص پیدا ہو گئے تھے۔ کیوں کہ اس سے صرف ایک ہی طرز کے طالب علم پیدا ہونے لگے۔ اور اُس نے اجتہاد فکر اور بداعت ذہن کا مادہ سلب کر لیا۔

مغربی درسگاہیں اس حملے سے مامون نہیں ہو سکتی ہیں۔ امتحانات تکلیف دہ سہی لیکن آج تک کوئی ملک اس تکلیف دہ طریقے سے آزاد نہیں ہو سکا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اُس نظام امتحانات میں جو ہندوستان میں مروّج ہے۔ کچھ ایسے نقائص بھی ہیں۔ جو اسی کے ساتھ مختص ہیں، مگر اُن میں سے بعض لامحالہ ایسے ہیں۔ جو ہندوستان کی خاص صورت حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ناگزیر ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم ایک خاص حد تک غیر ملکی ہے۔ لیکن کیا ہمیں اُن مشکلات کا احساس نہیں ہے جن کا سامنا ہمیں اس ضمن میں کرنا پڑے گا۔ ملک میں زبانوں کی اتنی کثرت ہے، اور ہر زبان کے مدعی اپنی اپنی زبان کے حق میں پُرزور دلائل پیش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم ایک خاص حد تک غیر مذہبی ہے۔ مگر یہ اس لئے نہیں کہ یہ ہمارا اختیار کردہ ہے، بلکہ اس لئے کہ ناگزیر ہے کیوں کہ کوئی فرقہ اس بات پر رضامند نہ ہوگا کہ وہ اپنا سر نیاز ایک ایسے خدا کے سامنے جھکائے جو اُس کا خدا نہیں ہے اور مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا بہت سے مختلف فیہ مباحث اور کثیر اخراجات کا متقاضی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس نظامِ تعلیم میں ایسے نقائص بھی ہیں جو ایک حد تک رفع ہو سکتے ہیں۔ یہ نظام بہت کچھ نظری ہے۔

بہت سے ماہرینِ تعلیم نے اس کو عملی بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عوام الناس کی طرف سے اُن کی کوئی امداد نہیں کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ یہ کوششیں اس حد تک کامیاب نہیں ہوئیں۔ جس کی یہ مستحق تھیں۔

غلامانہ ذہانت | غلامانہ ذہانت کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن ہم کو نکتہ چینی کے وقت بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ انگریزی تاریخ اور انگریزی ادب ایک غلامانہ ذہانت پیدا نہیں کرتے۔ اور اُن لوگوں میں جنہوں نے ہندوستانی مدارس میں مغربی تعلیم پائی ہے۔ غلامانہ ذہانت نشوونما نہیں پائی۔ بلکہ اس کے برعکس اُنھوں نے ضرورت سے زیادہ آزاد خیالی کا اظہار کیا ہے۔ جہاں تک اس نظامِ تعلیم کا اس نا کامیابی سے علاقہ ہے، جو تعلیم کو عام کر دینے کے بارے میں نصیب ہوئی ہے۔ کوئی شخص اس کمی پر شک نہیں کر سکتا۔ مگر جنھوں نے اس باب میں عملی کام کیا ہے۔ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ مشکلات سے معمور ہے۔ اور عام تبلیغی کام، تربیت دادہ اساتذہ کی کثرت، اور فراوانئ دولت کے بغیر، جہالت سے مقابلہ کرنا، ممکن نہیں ہے۔ اس لئے تحریک عدم تعاون نے تعلیمی معاملات میں جہاں تک کہ تنقید کا علاقہ ہے، لوگوں کی توجہ کو تعلیمی مسائل میں مرکوز کر دیا ہے۔ اور اس نظام کے نقائص پر بحث کر کے بہت کچھ مفید تنقیدی کام کیا ہے جس کا ہر اصلاح سے قبل واقع ہونا لازمی ہے۔ اور اس کے لئے ہر دل دادہ تعلیم اور ہر ایسے شخص کو جو تعلیمی مفاد سے دلچسپی رکھتا ہے، اس بنیادی کام کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے اُن حضرات کا جو حامیانِ عدم تعاون ہیں ممنون ہونا چاہیئے +

نظامِ تعلیم کے مقاصد | اس لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کو عام اور لازمی بنا دیا جائے۔ جس سے ہر شخص کی اقتصادی اہمیت بڑھ جائے۔ تاکہ وہ زیادہ نتیجہ خیز کام کر سکے، اور وہ زیادہ صحت مند اور زیادہ فارغ البالانہ زندگی بسر کر سکے +

اس ابتدائی تعلیم کو ان معنوں میں قومی بنا دینا چاہیئے، کہ یہ طلبا کو مدنیت کے سیدھے سادے اصول سکھا سکے۔ اور ساتھ ہی اس میں مذہبی عنصر بھی موجود ہو۔ تعلیم کے مدارج ثانوی میں اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ صرف ذہن ہی کی نشوونما نہ ہو بلکہ طلبا میں اخلاقی جسارت بھی پیدا ہو۔ عملی اعتبار سے ثانوی تعلیم کو موجودہ حالت کی بہ نسبت زیادہ کارآمد ہونا چاہیئے۔ جب ہم کالجوں کے درجوں پر پہنچ جائیں تو ہمیں بہر صورت دیکھنا چاہیئے کہ ہماری تعلیم قومی ہے۔ تحقیق و تجسس کی رُوح پیدا کرتی ہے طلبا کے سامنے تعلیم کے صحیح مطامحِ نظر موجود ہیں؟ اور ہمارے کالج مغرب کی غلامانہ پیروی تو نہیں کر رہے ہیں؟ بلکہ اس قابل ہیں کہ ہندوستانی قومیت کی تنظیم کر سکیں۔ ہندوستانی تہذیب کو ترقی

دے سکیں۔ اور تعلیم کے بہترین اور اعلیٰ ترین مقاصد کی بنیاد ڈال سکیں۔ اب جب کہ تعلیم، ایک امر منتقلہ ہے، تو آؤ ہم مردانہ وار تعلیمی مسائل کو اپنے ہاتوں میں لے لیں۔ یہ ایسے مسائل ہیں، جن کو کسی ملک اور کسی قوم نے آج تک خاطر خواہ طریق سے طے نہیں کیا۔ یونان نے اپنے دورِ ارتقا میں، اُن کے متعلق کوششیں کیں، اور اُن کو شاندار کامیابی میسر ہوئی۔ لیکن، یقیناً، یہ مسئلہ اب بھی بہت سی ترقیوں کا محتاج ہے۔ ہند قدیم کی تہذیب نے بھی اس مشکل کو حل کرنے کی ضرور کوشش کی ہوگی، لیکن ہمیں معلوم ہے، کہ اس کی مختتم عقدہ کشائی آج تک نہیں ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں انگلستان، امریکہ اور جرمنی نے، اپنی انتہائی کوششیں اس بارے میں صرف کی ہیں۔ مگر وہ لوگ جو ان ممالک کے تعلیمی مسائل اور اُن کی کوششوں کو بہ نظر غائر دیکھ سکتے ہیں جانتے ہیں کہ وہ آج بھی کسی اطمینان بخش کشودِ کار سے دُور ہیں۔ یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم زمانۂ ماضی کی کوششوں اور کامیابیوں کا اعتراف کریں، مگر یہ حامیانِ تعاون حضرات کا حق ہے کہ ہم اقرار کریں کہ ابھی ان مسائل کے متعلق بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اور تسلی بخش ترقی کرنے کے لئے بہت کچھ اہم کوششوں کی ضرورت ہے +

تحریک عدم تعاون اور تنظیمی کام۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ تحریک عدم تعاون نے تعلیمی معاملات میں تنظیمی کام کہاں تک کیا ہے اور اس سے کیا نتائج رُونما ہوئے ہیں۔ یہ کام دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل تو انہدامی کام جس کا مقصد موجودہ درسگاہوں کو برباد کرنا اور کالجوں اور اسکولوں کو طلباء سے خالی کرانا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس اعتبار سے کوئی وقیع کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ اور جو تھوڑی بہت کامیابی حاصل بھی ہوئی ہے وہ اُس قبولیت پر منحصر ہے جو مسلمانوں کی طرف سے ظاہر کی گئی +

تنظیمی کام کا دوسرا حصہ وہ ہے جو تعمیر نظام سے متعلق ہے یعنی وہ کام جس کا مدّعا ایسی درسگاہوں کا قیام تھا، جن میں وہ طلباء تعلیم پا سکیں، جن کو موجودہ اسکولوں اور کالجوں سے علیحدگی کی دعوت دی گئی تھی +

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعمیری کام صرف موجودہ نظام پر ایک تخریبی تنقید ہی کر سکا ہے، اور جب دعووں اور نظریوں سے علٰحدہ ہو کر عمل کی نوبت آئی ہے تو نتیجہ معلوم!

قومی نظام تعلیم کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے مگر جمہور کے سامنے کوئی سنجیدہ و مرتبہ نصاب تعلیم پیش نہیں کیا گیا۔ طریقۂ امتحانات پر بھی بہت کچھ قیمتی تنقید ہوئی ہے، لیکن، پنجاب میں جامعہ

قومی کے امتحانات، پنجاب یونیورسٹی کے طریق امتحان کی غلامانہ تقلید سے زیادہ نہ تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام تحریک، ماہرین تعلیم کی توجہ کو نظام تعلیم کی اصلاح کی طرف مائل کرنے کے اعتبار سے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ مگر اس نے خود نہ تو کوئی ایسا نصابِ تعلیم پیش کیا ہے۔ جسے ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم سے زیادہ قومی کہا جا سکے، اور نہ ہی اُس نے کوئی معیاری اسکول، کالج یا یونیورسٹی بنا کر اپنے دعاوی کا عملی ثبوت دیا ہے۔ اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ یہ تحریک اس ناکامیابی کی وجہ سے مطعون نہیں کی جا سکتی۔ اسکول کالج اور یونیورسٹیاں ایک سال، یا چند سالوں میں ترتیب نہیں دی جا سکتیں، اگرچہ حامیان عدم تعاون کے نقطۂ خیال سے مکمل سوراج کا چند مہینوں ہی میں حاصل کر لینا، بالکل ممکن ہو۔ اس لئے اس تحریک کی ناکامیابی، وقت اور روپے کی کمی پر محمول کی جا سکتی ہے۔

اس بات کا اعتراف بھی لازمی ہے کہ دورانِ جنگ میں تعلیمی نظام کو ترتیب دینے کا امن طلب کام مشکل سے ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اُوپر بیان کیا ہے تحریک عدم تعاون نے دُوسری اقوام کی درسگاہوں کی بہ نسبت مسلمانوں کی درسگاہوں کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ ایک تخریبی تحریک کی حیثیت سے اب اس تحریک کا زور اختتام کو پہنچ چکا ہے، اور اس جزو تحریک کے نتیجہ پر بہت سی نوجوان زندگیوں کی بربادی شاہد ہے۔ اگرچہ اکثر صورتوں میں یہ بربادی قابل تلافی ہے۔

اگر ہمارے دوست تارکین موالات، ایمانداری سے تنظیمی کام کریں، نئے تعلیمی مطامح نظر ترتیب دیں، اُن کو عملی جامہ پہنائیں اور ان تعلیمی اصلاحات کو، کامیاب درسگاہوں کی صورت میں پیش کریں، تو ہر شخص ان مساعی جمیلہ کا خیر مقدم کرے گا۔ کیوں کہ دُوسرے محکموں کی بہ نسبت، تعلیمات میں ان اختراعات کی گنجایش ہے۔

تحریک علی گڑھ و مسلم یونیورسٹی | یہ تحریک اتفاقاً علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کی معاصر ہے۔ علی گڑھ کی تحریک ایک شاندار ماضی پر فخر کر سکتی ہے۔ اس تحریک کے بانی سرسید احمد خاں، اسلامی ہندوستان کے اس نامور بزرگ کا نام، ایک قومی بہی خواہ کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جس نے اُس جہل ظلمت اور مایوسی کے زمانہ میں، جو عالم اسلامی پر چھائی ہوئی تھی۔ تعلیم کی شمع جلا کر اس جہالت اور مایوسی کی ظلمت کو کافور کر دیا۔ لاکھوں مسلمانانِ ہند اس دُعا میں شریک ہیں کہ خدا اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

علی گڑھ کی تحریک کا ماضی جس قدر وسیع اور شاندار ہے اُسی قدر ذمہ داری کاربارِ اُن لوگوں کے

شانوں پر ہے، جن کے سپرد اب یونیورسٹی چلانے کا کام ہے۔ اس نئے اور عظیم الشان کام کو کامیاب بنانے کے لئے تمام قوم کی متفقہ کوشش کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے بہت سے روپے کی ضرورت ہے اس کے لئے بہت سے بے غرض کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کارکنوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور ان کارکنوں پر جب آپ انہیں منتخب کرلیں بڑے اعتماد کی ضرورت ہے۔ اس کا نظام ترکیبی۔ ایمانداری سے کام کرنے والوں کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے، جن سے وہ مسلمانوں کی نجات کے اسباب مہیا کرسکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیابی کے راستہ میں بہت سی مشکلات ہیں، مگر میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ وہ ایسی نہیں ہیں جن پر قابو نہ پایا جاسکے۔

یہ اس یونیورسٹی کا کام ہوگا کہ وہ دکھا دے کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی مذہبیات کے معاملہ میں وہ کیا کچھ کرسکتی ہے۔ یہ اس یونیورسٹی پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح ہندوستانی تاریخ کے اسلامی دور کی طرف اپنی توجہات مبذول کرکے، ہندوستانی قومیت کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔ ہندوستانی قومیت کے دشمنوں نے ہر غیر ملکی قوم کی نفرت پر خواہ وہ عرب ہو یا افغان، مغل ہو یا برطانوی ایک محدود قومیت کی بنیاد رکھی ہے +

اس ناعاقبت اندیشانہ تدبیر سے زیادہ ہندوستانی قومیت کے مفاد کے حق میں کوئی چیز مضر نہیں ہوسکتی۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ قومیت کے اس غلط اور محدود مفہوم کے ردعمل کی کوشش کریں، اور ایک ایسی قومیت کی بنا ڈالیں۔ جو اس قدر وسیع البنیان ہو کہ اُن تمام قوموں کو اپنے آغوشِ محبت میں جگہہ دے سکے، جو مادرِ ہند کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں +

تجویزِ اصلاحات اور متعلقہ مسائل میں نے ذکر کیا تھا کہ تجویزِ اصلاحات نے نئے مسائل کو پیش نظر کردیا ہے۔ تمام ہندوستان میں مقامی حکومتیں ابتدائی تعلیم کے مسائل کو طے کرنے کی پُرزور کوششیں کررہی ہیں ہم سب اس امر میں متفق ہیں کہ اس تعلیم کو مذہبی عنصر سے معرّا نہ ہونا چاہیئے، ہم اس بارے میں بھی متحد الخیال ہیں کہ یہ تعلیم، طلباء کو گھروں میں نہیں دی جاسکتی۔ اب اس امر پر غور کرنا آپ کے ذمہ ہے کہ ابتدائی مدارس میں جو مقامی جماعتوں کی زیر نگرانی ہیں۔ مذہبی تعلیم کس طرح دی جائے؟ اور اس امر کی ذمہ داری بھی آپ پر عاید ہوتی ہے کہ آپ فیصلہ کریں کہ آیا آپ تیار ہیں کہ ایسی ابتدائی تعلیم مقامی جماعتوں کی امداد سے خانگی طور پر دیں، یا آپ مقامی جماعتوں کی امداد کے لئے، صرف تبلیغی کاموں پر قانع ہوجائیں۔

امدادی عطایا اب اُن عطیات کا تکلیف دہ سوال آتا ہے جو حکومت کی طرف سے اُن جماعتوں کو دیئے جاتے ہیں۔ عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ نظام تمدن کا میلان اس طرف ہے، کہ دولتمند زیادہ دولتمند

ہو جائیں، اور مفلس مفلس تر ہو جائیں۔ اور اس امر کو بوضاحت بیان کیا گیا ہے کہ وہ تنظیم عطیات جو مختلف صوبوں میں جاری ہے اس نتیجہ کے بار ور ہونے میں امداد دیتی ہے۔ اگر جنگ عظیم نے کوئی سبق سکھایا ہے تو وہ یہ ہے کہ اُس نے تلخ تجربہ سے ثابت کر دیا ہے کہ ایک حکومت کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ مفلسوں کو زیادہ مفلس اور جاہلوں کو زیادہ جاہل ہو جانے سے بچائے۔ دُنیاوی حکومت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مذہبی زاویۂ نگاہ سے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ مفلسوں کو زیادہ مفلس اور جاہلوں کو زیادہ جاہل بننے سے بچائے۔ اور اُن حضرات کی طرف سے جنھوں نے جمہوری اصول کی پاسبانی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، یہ امر واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ سرکاری عطیات کی اس طور پر تنظیم کی جائے جس سے وہ خلیج جو مختلف مدارج اجتماعی کو علیحدہ کرتی ہے، کم ہوتی جائے۔ تاہم یہ مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو مشکلات سے معمور ہے اور آپ کی محتاط توجہ کا محتاج ہے۔

دوسرے مسائل اب رہا کارآمد عملی تعلیم اور کلیات کے نظام ترکیبی کا سوال، یہ حقیقتہً ایسے مسائل ہیں، جن کے متعلق آپ کو اپنے خیالات کو ترتیب دینا چاہیئے۔

بڑی عمر کے اَن پڑھ لوگوں کی تعلیم اب میں ایک ایسے مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں جو عرصہ سے میرے زیر غور ہے۔ اس کا تعلق بڑی عمر کے اَن پڑھ لوگوں کی تعلیم سے ہے۔ اب تک ہم نے اس ابتدائی تعلیم کے مسئلہ پر غور کیا ہے جس کا تعلق اُن بچوں سے ہے جن کی عمر پانچ اور گیارہ سال کے درمیان ہو۔ اور ثانوی تعلیم پر جس کا علاقہ اُن طلباء سے ہے جن کی عمر دس اور سولہ سال کے درمیان ہو، مگر وہ آبادی کا قلیل حصہ ہے۔ اور کالجوں کی تعلیم پر جس کے حصول کے دوران میں طلباء قریب قریب اپنی عمر کے اکیس یا بائیس سال تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو جبری ابتدائی تعلیم کی شرائط کے لحاظ سے زیادہ معمر ہیں اور اس قدر غریب ہیں کہ وہ لوگ اعلیٰ تعلیم کے افادات سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ وہ لوگ جن کی عمر پندرہ اور ساٹھ سال کے درمیان ہے۔ کیا ہم اُن کو اپنی غفلت کا شکار ہو جانے دیں؟ مجھ سے کہا گیا ہے کہ اُن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو مذہبی تعلیم کی الف بے سے بھی واقف نہیں۔ کیا حکومت اُن کے متعلق کوئی فرائض نہیں رکھتی؟ کیا آپ کا بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ فرض نہیں ہے کہ اُن کی تاریک اور بیکار زندگیوں پر علم کی روشنی ڈالیں؟ یہ ہے بڑی عمر کے اَن پڑھ لوگوں کی تعلیم کا مسئلہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ مدارس شبانہ سے واقف ہیں، جو ان جماعتوں کو نوشت و خواند سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں، کہ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے بہت سے مدارس قائم کئے جائیں مگر اِن لوگوں کے لئے علمی معلومات بہم پہنچانے کا کام شام کے وقت یا ایسے

اوقات میں جب کہ وہ مصروف نہ ہوں، نہایت ہی نتیجہ خیز ہے۔ اگر آپ کی قومی درسگاہ اس کام کو اپنے ذمہ لے لے اور اُس کو ایسا تعلیمی کام سمجھ لے جس کا مقصد مذہبی اور معمولی تعلیم دینا ہو تو میں سمجھوں گا کہ یہ ایسا مفید خلایق کام انجام دیا جا رہا ہے جو اس درسگاہ کے لیے باعث نازش ہو سکتا ہے۔ یہی ہو وہ طریقہ جس سے آپ عامۂ خلایق تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ صرف اُن تک پہنچ سکتے ہیں، بلکہ اُن کو خوش و خرم بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔

وقت اجازت نہیں دیتا کہ میں اس تجویز کی تفصیلات کو معرضِ بحث میں لاؤں، مگر مجھے اعتماد ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان اس نہایت ہی مفید کام میں کسی دُوسری قوم سے پیچھے نہ رہیں گے۔

صوبہ داری درسگاہوں کے باوجود ایک مرکزی درسگاہ کی ضرورت

اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہوگا کہ یہ تعلیمی کام زیادہ تر صوبوں میں، اور مقامی مجلس واضع قوانین کے ماتحت ہی انجام پا سکتا ہے اور اس لئے صوبہ داری تنظیم کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام ہندوستان کی ایک مرکزی درسگاہ کی ضرورت مفقود ہو گئی ہے، مجھے یقین ہے کہ اب اس لئے ضرورت ہے کہ یہ مختلف صوبوں کے کام کرنے والوں کو یکجا جمع کرنے کے مواقع بہم پہنچائے تاکہ وہ اپنے اپنے مسائل پر بحث کر سکیں اور اُن اصول کو محکم کر سکیں جن کا حلقۂ اثر وسیع اور عام ہو۔ اور اپنے اپنے حلقوں میں اس مجلس شوریٰ میں نہایت سنجیدہ مباحث کے بعد اپنے کام کی انجام وہی کے واسطے زیادہ تیار ہو کر جا سکیں۔

اس دورِ ہیجان میں ہماری موجودہ حیثیت اور آئندہ تدبیر

حضرات! ہمیں آج یہ موقع نصیب ہے کہ ہم ایک ایسے دَورِ کشاکش میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں تحریکوں کی کامیابی اور ناکامیابی روز بروز مختلف ہیئتوں میں تبدیل ہو رہی ہے جس میں منتہائے نظر کے حصول کے لئے تازہ اور پُرزور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ امر لابدی ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہماری حیثیت کیا ہے؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے حصول کے لئے ہمارے پاس کیا وسائل موجود ہیں؟ اور یہ امر ناگزیر ہے کہ ہم اپنے ماضی کی کوششوں کا معائنہ کریں تاکہ ہم اس قابل ہو جائیں کہ اپنی آیندہ کوششوں کو اُن کے مطابق کر سکیں۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم اُس وقت سے ماسبق حالات پر نظر ڈالیں، جب کہ دُنیوی اختیارات مسلمان حکمرانوں کے بے طاقت ہاتھوں سے جاتے رہے۔ مسلمان حکمراں یا تو تدابیرِ سلطنت میں مصروف تھے یا ہندوستانی ادب اور صنائع لطیف کے مطالعہ میں مشغول۔ وہ اپنے بعد جواہر تعمیری کو بحیثیت ایک غیر فانی یادگار کے چھوڑ جانے پر تُلے ہوئے تھے۔ وُہ معاشرہ اسلام سے بے اعتنا رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانانِ ہندوستان

ایک غیر منتظم، علم سے بے بہرہ اور اپنی نگہداشت کے ناقابل جماعت ہوگئی۔ غدر کا زمانہ آیا اور گزر گیا۔ مسلمانانِ ہند نے بے حساب سختیاں سہیں، اور اپنے آپ کو ایک ناقابلِ عبور دلدل میں پایا۔ اور رفتہ رفتہ وہ مجبور ہوگئے۔ کہ سرکاری امداد پر اعتماد رکھیں۔

اتحادِ مقصد اور مساعی ترقی | اُنیسویں اور بیسویں صدی کے طلباء اس شوق و ذوق سے بے چین رہے ہیں کہ اُس بے حسی کو دُور کرنے کی کوشش کریں جس سے اُن کی قوم متاثر ہو چکی ہے اور اُس کو کامیابی اور عظمت کی شاہراہ پر لگادیں۔ جیسے کہ توقع کی جاسکتی تھی، ہم میں سے بعض ایک راستے پر چلے، درآں حالیکہ دُوسروں نے دُوسرے راستے اختیار کیے۔ تاہم ہمارا مقصود ایک ہی تھا۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہم منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے مختلف راستوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم میں بعض نے غلط راستہ اختیار کر لیا ہو، اور وہ راستے کی مشکلات کو محسوس کر رہے ہوں۔ اور بعض نے شاہ راہ کی نظر فریبیوں سے مسحور ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کا یقین کر لیا ہو، حالاں کہ وہ شاہ راہ اُن کو منزلِ مقصود سے ہٹا کر کہیں اور لے جا رہی ہے۔ تاہم میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اگرچہ ہم میں سے بعض سے فیصلہ کی یہ غلطی سرزد ہوئی ہو، لیکن ہمارا انتہائے نظر ایک ہی رہا ہے۔ اور میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی قومی طاقت کو متحد کر سکیں۔ اور اُن راہوں پر نہ چلیں جو شاہ راہ عظمت سے دُور ہیں۔ صورتِ حالات جیسی کچھ ہے ہم میں قومی طاقت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اور ہم اس طاقت کو ضائع نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہم اس قدر خوش قسمت ہو جائیں کہ ہم اپنی کوششوں کی مختلف لہروں کو ایک ہی دھارے میں بہا دیں تو ممکن ہے کہ یہ متحدہ بہاؤ تمام مشکلات کو سطح سے ہٹا دے۔ اور ہم کو اس قابل کر دے۔ کہ ہم نہ صرف اس ملک میں وہ حیثیت حاصل کر لیں، جس کے ہم مستحق ہیں۔ بلکہ ہمیں اس کی ترقیوں میں برابر حصہ لینے کا سزاوار کر دے۔ اس لئے اُس بیان سے جو میں نے ابھی کیا ہے، واضح ہو گیا ہوگا کہ پچھلے بیس سال میں یہ اسلامی تحریک اپنے اصلی معنوں میں اس لحاظ سے نازک صورتِ حالات رکھتی تھی کہ ہمدردی کے لئے دربدر بھٹکنے، مراعات کی بھیک مانگنے، سلوک میں خصوصیت کی التجا کرنے،، کی تدابیر نے اس تحریک کو بہت ہی بے حقیقت فائدہ پہنچایا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کو قومی اعتبار سے نقصان پہنچایا ہے۔ اور اُس کے جواب میں حکام کی طرف سے سوائے ظاہردارانہ ہمدردی کے کچھ نہیں ملا۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس تدبیر کی تبدیلی پر غور کریں +

ہمسایہ قوموں سے تعاون کی تدبیر

پچھلے دس سالوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جس میں ہم نے ہمسایہ قوموں سے تعاون کی کوشش کی ہے۔ جنگ عظیم اور وہ حصہ جو ترکی سلطنت نے اُس میں لیا، اور ہندوستان کی سیاسی ترقی کے مسائل، ان سب نے ہندوستان کے باشندوں میں باہمی رضاجوئی کا مادہ پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔

وہ اصول جن پر قومی وطن پرست اصلاحات کے متمنی رہے ہیں

ہندوستان کے عظیم القدر وطن پرستوں نے اپنے آپ کو اس کام کی طرف مائل کیا۔ اس کام کی طرف جو ایک بڑے ملک اور بڑی قومیت کی توجہ کے قابل تھا۔ اور ان موضوعات کو اصول کا زینہ بنایا۔ کہ ہمیں ایک قومیت کی بنیاد ڈالنی چاہیئے۔ اور مختلف قوموں کو ایک قومی یگانگت میں جذب کر دینا چاہیئے۔ اس بات کا اعتراف کیا گیا۔ کہ ان قوموں میں اکثر اختلافات ہیں۔ جن میں مذہبی عقائد اور معاشری رسوم کا ایک کافی حصہ ہے۔ اور اُن کو یکجا کرنے کا صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ کہ اُن کے سامنے ایک ایسا دستور العمل رکھ دیا جاسے۔ جس سے ہر قوم اس آزادی کے جہاد میں پہلو بہ پہلو رہ سکے۔ اس بات کو مکمل طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ جب تک ہم ایک ایسا نظام اخلاق ترتیب نہ دے لیں۔ جو قوم کے کسی جزو کی بحیثیت ایک کل کے جزو ہونے کے نگہداشت نہ کرے۔ آزادی کی تلاش میں کوئی عملی اور استوار قدم نہیں اُٹھایا جاسکتا +

انفرادی حقوق کو ہیئت اجتماعی کے ماتحت ہونا چاہیئے

انفرادی اقتدار جو انسان کا فطری حق ہے اُس کو واپس دلانا چاہیئے۔ پچھلے چند سال میں یہی خیال ہر تحریک کا روح رواں رہا ہے۔ جسے اگر روح زمانہ اسپرٹ آف دی ایج کہا جائے۔ تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ زمانہ ماقبل جنگ میں یہی خیال دنیا میں ساری رہا ہے۔ اور جنگ نے اسی خیال کو زیادہ نمایاں کر دیا +

حضرات! میرا دعوےٰ ہے کہ یہ روح زمانہ جو بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ حقیقت میں اُس شخصی اقتدار کا ردعمل تھی۔ جو اُنیسویں صدی کے آخری حصہ میں دنیا پہ محیط ہو چکا تھا۔ میرا یہ بھی دعوےٰ ہے کہ یہ روح زمانہ اشتراکیت یا بالشوزم اور سرمایہ داری یا مغرب اور نئی دنیا کی موجودہ مہذب ہیئت اجتماعی کے بین بین تھی۔ اسلام کا مقصد ایک باسطوت جمہوریت کا قیام ہے جو انفرادی حقوق کو ایک مقدس امانت سمجھتی ہو۔ لیکن اُنہیں ہیئت اجتماعی کے ماتحت رکھتی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستان نے اپنے ہمسایہ ملکوں کے اشتراکی رجحانات کو نگاہ رغبت سے دیکھا۔ مگر ہندوستان بحیثیت مجموعی سرمایہ داری، پرانی قدامت پسند جمعیت اور مغرب کی موجودہ تہذیب کو اس قدر محبوب رکھتا تھا۔ کہ اُس پر اُن کا بہت کچھ اثر نہ ہوا۔ تاہم اس تحریک نے ہندوستان کے سیاسی مطامح نظر کو ایک خاص

جمہوری رنگ میں رنگ دیا۔ مگر اس سے زیادہ کچھ اور نہ کیا۔

سوراج میں تمام قوموں کی شرکت

کوئی ملک معراج ترقی پر نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ تمام قومیں جو اُس ملک کے اجزائے ترکیبی ہیں ایک ہی سطح مرتقیہ پر نہ ہوں۔ اور کوئی قوم اپنی مادر وطن کے نظم ونسق اور ارتقا میں حصہ لینے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اُس کے لیئے جد وجہد نہ کرے۔ جب تک تعلیم یافتہ نہ ہو۔ جب تک اُس کے سامنے تعلیم کے صحیح مطامح نظر نہ ہوں۔ حقیقت میں کوئی قوم خواہ اُس کو تمام حقوق ومراعات دے دیئے جائیں خواہ ملک کے نظم ونسق میں اُسے خاطر خواہ حصہ بھی حاصل ہو جائے ملک کے مفاد یا اپنی بہتری کے لیئے اپنے اختیارات استعمال نہیں کر سکتی۔ جب تک اُس کے سامنے صحیح مطامح نظر، صحیح اصول، اور صحیح وسائل کار نہ ہوں ؎

"گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت قبول کردن ورفتن نہ شرط انصاف است"

غرض کہ ہندوستانی قومیت کا اقتضا ہے کہ اوّل تو ہر ایک قوم ایسی کوششیں عمل میں لائے۔ جن سے وہ ملک کے نظم ونسق میں اپنے فرائض، قابلیت سے انجام دینے کے قابل ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک قوم ایسی رواداری نہ روش اختیار کرے۔ جس سے دوسری قومیں اپنے جائز حقوق حاصل کر لیں۔ دوسروں کے حصوں کو غصب نہ کرے۔ اور نہ دوسروں کے حقوق واپس دینے سے انکار کرے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ مادر ہند زندگی کی قربانیاں نہیں چاہتی۔ بلکہ مفاد اجتماعی کی خاطر معمولی مفاد کی حقیر قربانیاں طلب کرتی ہے۔ یہ ہیں وہ اصول جن پر تمام قوموں کے بے غرض محبان وطن متفق تھے اس روح زمانہ نے جو اس زمانہ پر طاری تھی۔ ان لوگوں کو متحد کر دیا اور قومیت کا امتیاز ناپید ہو گیا۔ اور ہر قوم کی جداگانہ بہتری کو ہندوستان کی اجتماعی بہبودی تصور کیا گیا +

قوموں کے بین الملی تنازعات مفقود ہو گئے۔ رقابت اور حسد کا جوش سرد ہو گیا۔ اس روح زمانہ نے ہندوستان کی مختلف قومیتوں پر اتنا قابو پا لیا۔ کہ ہر ایک نے بغیر مطالبات کے اپنی خدمات دوسروں کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ اُسی روح زمانہ کے تاثرات کا نتیجہ تھا۔ کہ بنگال کی ۵۰ فیصدی مسلمان آبادی صرف ۴۰ فی صدی کی نیابت پر اور پنجاب کی ۵۵ فی صدی مسلمان آبادی محض ۵۰ فی صدی کی نیابت پر رضامند ہو گئی۔ یعنی ہندوستان کے اُن دو صوبوں میں ایک جس میں مسلمانوں کی کثرت تھی اپنی اکثریت سے فائدہ اُٹھانے سے دست بردار ہو گیا۔ اور ایک نے تو اقلیت کے درجہ کو بھی منظور کر لیا +

یہ وہ روحِ زمانہ تھی جو محسّسین قومیت کے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی ۔ یہ وہ روحِ زمانہ تھی جو ایک ایسے ملک کے لئے جو منازل ترقی طے کر رہا ہو ۔ خدا کی سب سے بڑی رحمت ہے ۔

تجویز اصلاحات حکومت کو کامیاب بنانے میں مشکلات

اصلاحاتِ حکومت کی پہلی قسط جس کا عرصہ سے انتظار تھا وصول ہو گئی ۔ بدقسمتی سے اس وقت ملک میں قومی کام کرنے والوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا ۔ ہمارے بعض دوست جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنے ملک کے لئے سب سے زیادہ سختیاں اٹھائی ہیں تارک موالات ہو گئے اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے ملک کے مفاد کے لئے کام تو کیا مگر تعاون کے حامی تھے اُن لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر مجبور ہو گئے جنھوں نے اپنے ملک کے لئے کوئی زحمت گوارا نہ کی تھی اور جو اُن اعلیٰ اصول سے نابلد تھے ۔ جو انسان کو خود غرضی اور نفس پرستی سے بالاتر کر دیتے ہیں ۔ ان قوم پرستوں کا کام جو کونسلوں میں داخل ہوئے بے انتہا مشکل ہو گیا وہ نہ صرف اپنے اُن برادرانِ ملت سے علٰحدہ ہو گئے جن کے متعلق اُن کے دلوں میں بے انتہا عزت اور احترام تھا ۔ بلکہ ان کو ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنا پڑا ۔ جو اُن اصول سے ناآشنا تھے ۔ جنھوں نے ان وطن پرستوں کے دلوں میں ملکی خدمت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا ۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا ۔ یعنی یہ دونوں جماعتیں علٰحدہ علٰحدہ روشِ عمل پر کام کرنے لگیں ۔

ایک جماعت تو ان اصول پر کاربند ہو گئی جن پر وہ اور اُن کے شرکائے کار اصلاحات کے حصول کی کوشش کرتے وقت متحد الخیال ہو چکے تھے یعنی وہ ساعی ہوئے کہ پس افتادہ قوموں کو اس قدر اُبھاریں کہ وہ اقوامِ مرتقیہ کے پہلو بہ پہلو ہو جائیں تاکہ تمام قومیں زیادہ اصلاحات کے مطالبہ میں برابر کے مفاد کی امید سے دلچسپی رکھ سکیں اور مکمل سوراج کے حصول کی جد وجہد میں کوئی قوم پیچھے رہ کر دوسری قوموں کے لئے سدِ راہ نہ ہو جائے ۔ اس لئے ہر وہ سعی عمل جو ملک کے نظم و نسق میں ان قوموں میں دلچسپی پیدا کرنے کے کی گئی ۔ جو اب تک اُس سے محروم تھیں ، اگرچہ حقیقت میں تاسیس قومی کا ایک ضروری جزو تھی ۔ ان لوگوں کے لئے موجبِ غلط فہمی ہو گئی ۔ جن کے دلوں میں نہ تو آزادی کی محبت ہے اور نہ ہی جنھوں نے اُس کے اصول میں کوشش کی ہے ۔ یہ اُن غلط فہمیوں کی داستان ہے ۔ جو تعمیرِ قومیت کے راستے میں حائل ہو گئیں اور جنھوں نے باہمی تعلقات کے اُس رابطہ کو صدمہ پہنچایا جو آزادی کے حصول کی جد وجہد میں قوموں کی متحدہ کوششوں کے لئے ضروری ہے تاہم یہ وہ مسائل ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے تاکہ غلط فہمیاں پھر ترقی اور

سوراج کے راستہ میں حائل نہ ہو جائیں۔

لیکن ایک بات کو اچھی طرح سے یاد کر لینا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے جائز حقوق کے حصول کے لئے صرف اپنی ذاتی کوششوں پر بھروسہ کرنا ہوگا ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی

مسلمانان ہند کے تعلیمی مطامح نظر۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانان ہند تعلیمی دستور العمل کی پیروی میں اپنے سامنے کون سے صحیح مطامح نظر رکھیں؟ اور وہ کون سے طریقے ہو سکتے ہیں جن سے ان مطامح نظر کو واقعات کی صورت میں تبدیل کیا جا سکے۔

مسلمان ہند کا مطالبہ صرف انصاف ہے

اس سے پیشتر کہ میں اس کے متعلق کچھ کہوں، اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند صرف ایسے سلوک کے متمنی ہیں جو انصاف پر مبنی ہو۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ اُن کو ملک کے نظم ونسق میں وہ حصہ دیا جائے جس کے وہ ہر طرح سے اہل نہیں وہ نہیں چاہتے کہ اُن کے سپرد اُن مشکل اور نازک معاملات کی ذمہ داری کی جائے اگر وہ اُنھیں بوجہ احسن سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ان کی شکایات

اُن کی شکایت ہمیشہ سے یہی رہی ہے اور اب بھی یہی ہے کہ زمانہ گزشتہ اور موجودہ میں اُن کے لئے اُن ملازمتوں کے دروازے بند رہے ہیں جن کے کھولنے کے لئے وہ کافی رسوخ رکھتے اور بہت سی صورتوں میں اگر اُن کو کسی ایسی ملازمت میں داخل کر لیا جاتا ہے اور اگرچہ وہ ان عہدوں کے فرائض کو پوری قابلیت سے انجام دینے کے اہل بھی ہوتے ہیں تو ان کو صرف اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں سوائے علیحدگی کے کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

یہ شکایات کہاں تک واقعات پر مبنی ہیں آپ میں سے ہر شخص اپنے تجربہ، یا قابل اعتماد معلومات سے بتا سکتا ہے۔ لیکن اگر ان شکایات میں کچھ حقیقت ہے تو یہ اس ملک کے اجتماعی مفاد کے لئے ضروری ہے کہ ان کو رفع کیا جائے۔ یاد رکھئے کہ کسی ملک کا نظم ونسق ترقی کے مدارج طے نہیں کر سکتا۔ جہاں ایک بڑی اور وقیع قوم سے جس نے جہالت اور سستی پر عظمت اور ترقی حاصل کرنے کے لئے ایک پرجوش کوشش سے فتح حاصل کر لی ہو۔ ہمسایہ قومیں یا حکام اس قسم کا سلوک روا رکھیں۔ پس یہ امر ان تمام لوگوں پر جن کا ان شکایات سے کسی قسم کا بھی تعلق ہے۔ واضح ہو جانا چاہیئے کہ مسلمان کسی قسم کی مراعات کے خواہشمند نہیں وہ ایسے عہدوں اور ملازمتوں کو حاصل کرنا نہیں چاہتے جن کے وہ

اہل نہ ہوں۔ اور جن پر فائز ہونے کے لئے وہ دوسری قوموں کے لوگوں کے برابر قابلیت نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کو محض اس لئے محروم نہ کیا جائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اور مسلمانوں کی قوم محسوس کرتی ہے کہ یہ ناگوار صورت حالات عام ہے۔

نظم ونسق کے نظام میں ایسے شعبے بھی ہیں جن میں داخلہ، طریقۂ انتخاب پر منحصر ہے۔ مسلمانان ہند چاہتے ہیں کہ ان شعبوں میں ان کی نیابت اُن کے مفاد کے معیار پر ہونی چاہیئے۔ اور اس معیار قابلیت پر جس سے وہ دوسری قوموں کے ہم پایہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ چوں کہ اُن کی قوم میں تعلیم یافتہ افراد تعداد میں اس قدر زیادہ نہیں جس قدر ہمسایہ قوموں کے ہیں وہ بحالات موجودہ ان شعبوں سے دُور دُور ہی رکھے جاتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ایسی خاص جماعتوں میں کام کرنے کے لئے صرف دس یا بارہ اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لئے ان کی قوم میں تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہونے کی ضرورت نہیں۔ بارہ آدمی ساٹھ آدمیوں میں سے اُسی خوبی منتخب کئے جا سکتے ہیں جس طرح چھ سو آدمیوں میں سے اور اگر یہ خاص خاص جماعتیں، صرف قابلیت ہی کی مقتضی ہیں اور اگر ایک درجن اچھے اور قابل آدمی ساٹھ پڑھے لکھے آدمیوں میں سے مہیا کئے جا سکتے ہیں تو اُن کو ان عہدوں سے محروم نہ رکھنا چاہیئے۔ تاہم یہ امور تفصیل طلب ہیں اور یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مسلمانان ہندوستان کا ادعایہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی مقدس بارگاہ میں وہ اس لئے باریابی نہیں چاہتے کہ ان کی وجہ سے قابلیت کا معیار کم ہو جائے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اس معیار کو بلند کر دیں اس لئے نہیں کہ انصاف پر ظلم کیا جائے بلکہ اس لئے کہ مقصد انصاف کو مکمل کر دیا جائے وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بسا اوقات اس لئے نظر انداز نہیں کئے جاتے کہ ان کے ہم چشم زیادہ قابل ہیں بلکہ اس لئے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں کہ ان ہم چشموں کے حق میں ایک ایسی کثرت رائے ہے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ انتخابات ہیں۔ یہ شکایات بے بنیاد ہیں یا مبنی بر حقیقت، اس کا فیصلہ بھی آپ اپنے تجربہ اور قابل اعتماد معلومات کی مدد سے کر سکتے ہیں۔ بعض اوقات نہایت خوش آہنگ تلمیحات کے ذریعہ سے جن سے غیر مشتبہ انصاف اور بے نظیر دانائی جھلکتی ہے۔ یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کی مقدس بارگاہ میں فرقہ بندیوں کو جگہ نہیں دی جانی چاہیئے۔ مگر کیا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ یہی مقدس جماعتیں عملہ اساتذہ کو بالکل ہندوستانیوں پر محدود کرنے پر مصر ہیں حتیٰ کہ انھیں میں سے ایک میں، ایک مسلمان طالب علم، جو اپنی علمی تشنگی سنسکرت کے امرت سے بجھانا چاہتا تھا۔ صرف اس لئے حصول مدعا میں ناکامیاب رہا کہ وہ مسلمان تھا۔ کیا موجودہ عہد رواداری

صدیوں قبل کے اس دور سے کوئی نسبت دی جاسکتی ہے۔ جب کہ البیرونی ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے ادبیات سنسکرت اور علوم ہند قدیم کا امام بنا دیا گیا تھا۔ اور ایک البیرونی ہی کیا مسلمان طلباء گروہ در گروہ البیرونی ہی کی طرح استفادہ کرتے رہے ہیں۔

مسلمانان ہند کے تعلیمی نصب العین کی طرف رجوع کرتے ہوئے مجھے صرف پانچ امور پر توجہ دلانی ہے۔

۱۔ توحید | اسلامی تعلیم کا کوئی اصول کسی نصب العین کا خواہ وہ ہندوستان میں ہو یا کسی دوسرے ملک میں، وہ مخصوص احترام نہیں کرتا جو وحدانیت کے لئے مخصوص ہے۔ اسلام ہندوستان میں توحید کی تبلیغ کے لئے آیا۔ اُس کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ اس قدر کامیابی کہ آج ہندوؤں کے بہت سے فرقے خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور اس بات کے معترف ہیں کہ ہندو مذہب کے اکثر مسالک میں پرستاران توحید موجود ہیں۔ بھگت کبیر اور گرو نانک صاحب جیسے بزرگوں نے خدا کی وحدانیت کی شد و مد سے تبلیغ کی۔ یہاں تک کہ عالم مسیحی باوصف اپنے عقائد تثلیت کے توحید کے اعتراف پر مائل نظر آتا ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ توحید کے اصول آج پہلے سے بھی زیادہ محکم اور مضبوط حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کے دستور العمل میں اولین نصب العین وحدانیت کی تبلیغ ہونا چاہیئے۔

۲۔ اخوت نوعی | دوسرا اہم جزو وہ اثر ہے جس سے اسلام نے دنیا کو متاثر کیا ہے اور یہ اخوت نوعی کا اصول ہے۔ انسانی روح کا مصدر رحمت ہے۔ ہر انسان پرتوِ "ذات" ہے۔ گویا اس نسبت سے انسانوں میں ایک خاص باہمی ربط موجود ہے جس کو "اخوت" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اسلام میں کوئی شخص اچھوت نہیں۔

حضرات! آپ نے اسلام کے اس پیغام اخوت نوعی کو ہندوستان کے ملکی بھائیوں کے کانوں تک پہنچانے میں کوتاہی کی ہے۔ ہندوستان میں لاکھوں اچھوتوں کی موجودگی ممکن ہے کہ ہندو مذہب کے لئے باعث ذلت نہ ہو مگر یقیناً اسلامی ہند کے لئے بڑی ذلت ہے۔ ہندو الزام سے بچنے کے لئے اپنے اُس مذہب کی آڑ لے سکتے ہیں جو ان بندگانِ خدا کو اچھوت سمجھتا ہے، اور اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو اُن کا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ ان اچھوتوں کو اپنی آغوش اخوت میں جگہ دیں۔ مگر آپ اس قسم کی کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ کوئی انسان اچھوت نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نے خدا کی وحدانیت کی برکتیں اور اپنے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہندوستان کے ان لاکھوں بندگان خدا تک پہنچایا ہے؟ کیا آپ نے ان لاکھوں انسانوں کو اسی خیال میں زندگی گزار کر مر جانے کی اجازت نہیں دی کہ وہ اچھوت ہیں؟ آپ کو اور آپ کے آباؤ اجداد کو اس غفلت کا جواب دہ ہونا پڑے گا کہ آپ نے ان غریب انسانوں کو اپنی اس برادری میں شامل ہونے کی دعوت نہیں دی جس کے وہ حق دار تھے۔ پس توحید اور رسالت پر ایمان رکھنے کے بعد آپ کا دوسرا فرض یہ ہے کہ آپ اخوتِ نوعی کو استوار کریں جو اسلام کا دائرہ وسیع کرتی ہے۔ اور اس کو اپنے تعلیمی دستور العمل میں نمایاں جگہ دیں ؎

بنازم بہ بزمِ محبت کہ آں جا
گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

۳۔ خدمتِ خلق | یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی تعلیم کا تیسرا النصب العین ایک آسان معاش کے ذرائع پر قدرت پانا نہیں ہے۔ بلکہ بنی نوع انسان کی خدمت کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ اسلامی تعلیم کا نصب العین ایک مغرور حیثیت اختیار کرنا نہیں ہے اور نہ دوسروں کو ماتحت بنانے کی غرض سے ایک شان برتری پیدا کرنا ہے بلکہ اُس کا نصب العین یہ ہے کہ اپنے بدقسمت بھائیوں کی خدمت کی جائے۔ تاکہ وہ اس ہمدردی، اس محبت، اُس اخوت سے مستفید ہو سکیں جو ان کے دلوں میں بھی ایسے ہی جذبات پیدا کر سکے۔ اس لئے اسلامی تعلیم کا تیسرا النصب العین یہ ہے کہ اس کے پرستار اپنے دلوں میں اس عزم صمیم کو لے کر دنیا میں جائیں کہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت کریں گے۔ غریبوں کا سہارا ہو جائیں گے۔ بیماروں کے لئے درماں ہوں گے۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑیں گے۔ گرے ہوؤں کو سنبھالیں گے اور کس مپرسوں کو پناہ دیں گے۔

۴۔ مشرقیت | چوتھا النصب العین مشرقی تہذیب کا نشو و نما ہونا چاہیئے۔ یہ جمہوریت کا اصول ہے۔ شخصی تقدیس کا اصول ہے۔ اور ہر فرد کو ہیئت اجتماعی کا ایک جزو سمجھنے کا اصول ہے۔ ممکن ہے کہ آپ ایک شاہنشاہ کے سامنے بحیثیت ایک شاہنشاہ کے نہ جھکیں مگر اس ہیئت بشری کے ناظم کی حیثیت سے جس کے آپ ایک رُکن ہیں وہ آپ کی متابعت کا استحقاق رکھتا ہے، بشرطیکہ یہ متابعت آپ کے دوسرے مقاصد کی منافی نہ ہو۔ مشرقی تہذیب میں ہند قدیم کی تہذیب سے ہمدردی رکھنا اس کی تہ کو پہنچنا اور اس کی قدر کرنا شامل ہے۔ یہ آپ کے لئے بھی ایک ایسی ہی قیمتی وراثت ہے جیسی کہ مغل تہذیب زمانہ حال کے ہندوستان کے لئے ہے۔

۵۔ مادر وطن کی خدمت | پانچواں نصب العین مادر وطن کی خدمت ہے۔ ہندوستان آپ کا ہے اور آپ ہندوستان کے ہیں۔ ہندوستان آپ کے بغیر عظمت حاصل نہیں کر سکتا اور آپ ایک پرعظمت ہندوستان کے بغیر کوئی اہمیت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس ہندوستانی حب الوطنی کے ساتھ ساتھ۔ جیسے آپ کو دل میں جگہ دینی چاہیئے جس پر آپ کو ایمان رکھنا چاہیئے اور جیسے آپ کے بچوں کو قیمتی وراثت سمجھنا چاہیئے۔ کیوں کہ وہ اُسی ملک کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ اسی ملک کا دودھ پیتے ہیں اور اسی کی پیداوار سے پرورش پاتے ہیں۔ آپ کو یاد رکھنا ہوگا کہ آپ دنیا بھر کے عالم اسلامی کے ایک جزو ہیں۔ وہ پیغام جو آپ دنیا کو دینے والے ہیں ایک ایسا پیغام ہے جسے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر پہنچنا چاہیئے اور اس پیغام کے مبلغین اور معتقدین، خواہ وہ یورپ میں ہوں یا امریکہ میں یا افریقہ میں، آپ کے بھائی ہیں۔ یاد رکھئے کہ جیسے بعض کا خیال ہے، یہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ باعتبار صورت حالات کے ہندوستان کی عظمت کا انحصار آپ کی ترقی اور اُس تعاون پر ہے، جو آپ اپنی ہمسایہ قوموں سے کریں گے۔ آپ کی عظمت ہندوستان کی عظمت ہے جیسا کہ ہندوستان کے ایک نہایت ہی ممتاز فرزند نے کہا ہے۔

" ایک پرعظمت اور خودمختار اسلامی حکومت کے لئے ایک پرعظمت اور آزاد ہندوستان کی ضرورت ہے۔ اور ہندوستان کی عظمت و آزادی کے لئے ایک پرعظمت اور خودمختار اسلامی حکومت کی ضرورت ہے۔"

یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں مقدم کون ہوگا؟ ممکن ہے کہ اپنے اپنے موقع پر دونوں مقدم ہوں۔

حصول مقصد کے ذرائع | اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعلیمی نظریات کس طرح عملی صورت اختیار کر سکتے ہیں؟ آپ نے اس مضمون کی بہت سی شاندار تجویزیں سنی ہوں گی بعض تو گاؤں کی مسجد سے شروع ہو کر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس پر ختم ہوتی ہیں۔ اور بعض اس منتہے سے شروع ہو کر اس ابتدا پر پہونچتی ہیں۔ مگر یہ سب یا تو ان جوشیلے نوجوانوں کے خیالی تصورات جنھوں نے تجربہ سے کچھ نہیں سیکھا، یا گوشہ نشین فلسفیوں کے تخیلات کے نتائج ہیں اُس شخص کی حیثیت سے جو ایک مقامی اسلامی درس گاہ کے لئے بازاروں میں پیسہ پیسہ جمع کرتا پھرا ہو اور جس پر نوجوانی کے جوش کا زمانہ گزر چکا ہو۔ میں اس مضمون کے متعلق کوئی غلط فہمیاں نہیں رکھتا۔ ہم وسعت نہیں رکھتے کہ ایسی تنخواہ دار جماعت کے قیام کا انتظام کر سکیں

جو اس نظام کی انتہائی منزل کو ابتدائی منزل سے وابستہ کرنے کا کام انجام دے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اعزازی کام خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے۔ دیانت میں کم زور اور نگرانی کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیئے، اور وہ کونسی جماعت ہے جو اس کام کو انجام دے گی۔ میرے خیال میں ان دونوں طریقہ ہائے کار کا مدغم کر دینا ناگزیر ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی تعداد کی زیادتی کے ساتھ ساتھ اس بوجھ کو اُٹھانے کے لئے زیادہ شرکائے کار پیدا ہوتے جائیں گے۔ ہمیں اس تحریک کو جاری رکھنے کی غرض سے ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی جو اپنا تمام وقت اسی کام میں صرف کر دیں۔ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ط

یہ جماعت ہماری پشتیبان ہوگی۔ لیکن ایک بڑی تعداد ہمارے اُن نوجوانوں کی ہوگی جو اس بات کا معاہدہ کریں گے کہ عملی زندگی کے پہلے دو تین سال اس کام میں صرف کر دیں۔ ان لوگوں کی کثیر تعداد اس کے علاوہ ہوگی جو مقامی طور پر کریں گے۔

مستقبل طلباء کے اختیار میں ہے۔

حضرات!

میں آج کے طلباء پر اعتماد رکھتا ہوں۔ یہی کل رہ نمائے قوم بنیں گے۔ میں کسی بے جا غرور سے متاثر ہو کر یہ دعوے نہیں کرتا کہ زمانہ ماضی کے طلباء جو آج اس تحریک میں عملی حصہ لے رہے ہیں۔ اس قدر قومیت ناشناس اور مغرب پرست نہیں ہیں، جس قدر ان کو بعض تنگ خیال نقاد سمجھتے ہیں۔ وہ اس جوش سے معمور ہیں جو انسان کے لئے بہترین نعمائے یزدانی میں سے ہے۔ اُن کے دلوں میں اعلیٰ ترین مقاصد کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ وہ خدمت کرنے اور تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہیں اور اُن کی اس آمادگی کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ زمانۂ موجودہ کے طلباء کو یہ باتیں ہم لوگوں سے بڑھ کر میسر ہیں۔

نظارۂ مستقبل امید افزا ہے

اسلامی تحریک آج ماضی سے زیادہ قوی الوسائل، زیادہ مکمل، زیادہ مضبوط، زیادہ عالی ہے۔ شاید یہ زمانۂ ماضی کی طرح مرتب و منضبط نہ ہو لیکن اُس میں ایک مقناطیسیت ہے۔ ایک جوش ہے ایک ذوق اور خلوص خدمت ہے۔

کیا یہ مقدس قوت خاک میں مل جائے گی۔ یا یہ مختلف موجیں ایک بحر رواں میں جمع ہو جائیں گی۔ مجھے جس قدر تجربہ آئندہ نسلوں کے متعلق ہے میں بہتری کی امید رکھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک دن ہندوستان اس سے زیادہ مکمل، عالی اور پر اطمینان زندگی بسر کرے گا۔

اسلامی ہندوستان، ہندوستان کا ایک جزو ہے جو ہندوستان کی عظمت وشان کے حصول میں، برابر کا حصہ دار رہے۔ اور جسے ہندوستان کے لئے عظمت حاصل کرنے کے متعلق خدمات انجام دینے میں بہترین خوشی حاصل ہے۔ میرے اس خواب کو سچا کر دکھانا ان لوگوں پر منحصر ہے جن کے ہاتھوں میں آج طلباء کی قسمتیں ہیں۔ اور اُن طلباء پر منحصر ہے جن کے ہاتھوں میں مستقبل ہند کی عنان تقدیر ہے۔ اگر میرا دماغ عالم اسلامی کے موجودہ خیالات کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے جیسا کہ اسے کرنا چاہئے تو مجھے کوئی وجہ اندیشہ نظر نہیں آتی۔ میں مسلمانانِ ہند کو پوری طاقت اور زندگی میں دیکھتا ہوں۔ میں مسلمانوں کے مقاصد کو ترقی پذیر محسوس کرتا ہوں، اور میں جانتا ہوں کہ مسلمان نوجوان اپنی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں۔ امیدوں سے معمور ہیں اور اپنے ملک، اور اپنی قوم کی خدمت کے لئے تیار رہیں۔ مگر انھیں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا پڑے گا۔ وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ اُن کا حصۂ کارزمانۂ گزشتہ میں دوسرے برادران ملک نے انجام دیا ہے اور اب اگر وہ مسلمانوں کو اپنے ملک کی خدمت میں شریک کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تو مسلمانوں کو اس سے نہ تو بددل ہونا چاہئے نہ برہم۔ کیوں کہ استقلال وہمت سے جدوجہد اور صمیمیت سے وہ جلد اپنے جائز حق کو حاصل کرلیں گے اور وہ وقت کچھ دور نہیں جب وہ اس حق کو حاصل کرکے اپنے برادران ملک کے دست بدست شاہراہِ ترقی پر گام زن ہوں گے یہاں تک کہ منزل مقصود پر جا پہنچیں اور برطانوی سلطنت اور آزاد وخود مختار خلافت کی دوستی کے ریشمین رشتوں سے مربوط ہونے کے باوصف، مادر ہند کو آزاد دیکھیں۔
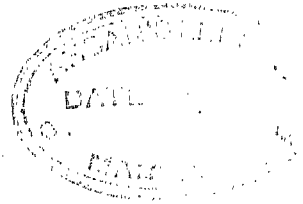
صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب
صدر اجلاس سي و ششم (علي گڑہ سنہ ۱۹۲۳ ع)

اجلاس سی و ششم

(منعقدۂ علی گڑھ ۱۹۲۳ء)

صدر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بی اے (کنٹب) بیرسٹر ایٹ لا

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حالات صدر

صاحبزادہ صاحب مئی ۱۸۶۷ء میں اپنے وطن کنج پورہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب غلام احمد خاں صاحب احمدی مرحوم نہایت روشن خیال، علم دوست، باوقار اور باوضع بزرگ تھے۔ قدرت نے حُسنِ صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی ان کو کافی حصہ دیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی عمر کے گرانمایہ اوقات ریاست گوالیار کی معزز خدمت میں بسر کئے۔ مہاراجہ گوالیار کی نظر میں ان کی بڑی توقیر اور منزلت تھی۔ گوالیار ہی کو اُنھوں نے اپنا مسکن بنا لیا تھا لیکن مدفن کے لئے علی گڑھ کی سرزمین منتخب ہو چکی تھی جہاں اپریل ۱۸۹۹ء میں انھوں نے رحلت کی۔ اور مشہور ولی حضرت شاہ جمال صاحب کی درگاہ کے قرب میں ایک خوشنما قبہ کے نیچے آسودہ ہیں۔

جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی عمر تعلیم و تربیت کے قابل ہوئی اسی وقت سے ان کی عمدہ تعلیم و تربیت پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی گئی اور جب وقت آیا کہ یہ گھر سے باہر تعلیم کے لئے بھیجے جاویں تو زمانہ شناس اور شفیق باپ نے اس زمانہ میں جب کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تعلیم سے مسلمان شرفاء کے خاندانوں میں عام طور پر نفرت کے خیالات جاگزیں تھے، ان کو ۱۸۷۸ء میں علی گڑھ اسکول میں داخلہ کی غرض سے بھیجا۔ کچھ عرصہ تک تعلیم پانے کے بعد ان کی جودت طبع، خوش تقریری اور پُرحوصلہ خواہشات نے سرسید مرحوم کی توجہ کو بہت کچھ ان کی طرف مائل کر لیا تھا۔ ایف اے کے درجہ تک اچھے طالب علم ہونے کی حیثیت سے صاحبزادہ صاحب نے مدرسۃ العلوم میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۱ء میں وہ انگلستان بھیجے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یونیورسٹی مذکور سے انھوں نے تاریخ میں بی اے آنرز کی ڈگری لی۔ بی اے کے علاوہ بیرسٹری کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی، سی، ایس، جنوبی افریقہ کے جنرل سمٹس، مسٹر آروند گھوش سرہری سنگھ انگلستان کے زمانہ طالب علمی میں ان کے دوست اور

ہم جماعت تھے۔

وہ اپنے زمانہ طالب علمی میں پرجوش کھلاڑی بھی تھے، مدرسۃ العلوم کے یونین کلب میں ان کی تقریریں دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی تھیں ۱۸۸۳ء میں تقریر کا پہلا انعام "سیرلڈ کاکس اسپیکنگ پرائز" حاصل کیا تھا۔

انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی)، جس نے لاکھوں روپیہ مدرستہ العلوم کے غریب اور ہونہار طلبہ کی اعانت میں جمع کرکے ان پر صرف کیا اور جس امداد کے ذریعہ سے قوم میں تعلیم یافتہ افراد کی کثیر تعداد مہیا ہوئی اس کے وجود کا تخیل انھیں کے دماغ کا نتیجہ اور اس کے عمدہ نتائج انھیں کی پرحوصلہ کوشش کے ثمر ہیں۔

جب صاحبزادہ صاحب انگلستان سے کامیاب ہوکر واپس آئے تو سرسید مرحوم کی خواہش کے موافق انھوں نے علی گڑھ میں مستقل طور سے بود و باش اختیار کرکے وکالت شروع کردی جن کی خوش بیانی و قانونی قابلیت نے بہت جلد ان کو کامیاب مشہور کردیا۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں سرسید نے ان کو مدرستہ العلوم کا ٹرسٹی مقرر کیا، ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد سرسید میموریل فنڈ قائم ہوا چونکہ صاحبزادہ صاحب اس تجویز کے پرجوش محرک اور موید تھے لہذا وہی میموریل فنڈ کمیٹی کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بلڈنگ ڈپارٹمنٹ کے وہ انچارج ٹرسٹی بنائے گئے۔ ممتاز بورڈنگ ہوس، کرزن ہاسپٹل، سرسید کورٹ کی بیشتر عالی شان عمارات کی تعمیر تا تمام مسجد کی رفیع الشان تکمیل انہیں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری جوائنٹ سکرٹری رہے۔ ریفارم اسکیم سے قبل ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی لیجس لیٹو کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو چکے تھے۔

زمانہ طالب علمی میں اور اس کے بعد جبکہ انھوں نے دنیائے عمل میں قدم رکھا مستقل طور پر ان کی زندگی قومی اور ملکی امور میں مصروف اور سراپا عمل نظر آتی ہے۔

خصوصیت کے ساتھ مدرستہ العلوم کے تعمیری کام میں آغاز نوجوانی سے آج تک جبکہ وہ اپنی عمر کی ساٹھویں منزل میں ہیں ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی، نمایاں خدمات اور بے انتہا حب قومی کا ثبوت مدرستہ العلوم، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی کے دائرہ عمل کے گوشہ گوشہ میں نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ سے انھوں نے قومی شیرازہ بندی کرکے مقاصد کانفرنس کو کامیاب کرنے میں اور قوم کو تعلیمی پستی سے ابھارنے میں بارہ برس تک جیسی عظیم جد و جہد کی اس مستقل اور پیہم کوشش کی وجہ سے انکی تعلیمی خدمات کا درجہ ان کے ہمعصروں میں اتنا بلند ہوگیا ہے جس کی وہ خود تابناک مثال ہیں انھوں نے کانفرنس کے دائرہ عمل کو ہندوستان کے دور دراز صوبوں میں وسعت دینے کی ہمت کی ان کے دور میں کانفرنس

کے اجلاس ڈھاکہ، مرنگون، کراچی، راولپنڈی، ناگپور، پونا، امرت سر وغیرہ میں جس شان اور کامیابی کے ساتھ سرانجام پائے وہ صاحبزادہ صاحب کے شاندار عہد کی یادگار ہیں۔ انہی کی توجہ سے کانفرنس کا صدر دفتر مضبوط اور مستحکم بنیاد پر قائم ہوا دفتر مذکور کی عمارت کی تعمیر کے لئے ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے سابق بھوپال کی توجہ کو مائل کرتے ہیں انہیں کی ہمت نے پیش قدمی کی اور تقریباً پچاس ہزار روپیہ کے صرف سے "سلطان جہاں منزل"، جیسی شاہانہ تعمیر تکمیل کو پہونچی۔

دفتر کی عمارت کی طرف سے جب ان کو اطمینان ہوا تو انہوں نے کانفرنس کے لئے مستقل سرمایہ بہم پہونچانے کے لئے اعلیٰ حضرت نظام الملک میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ کے حضور میں درخواست پیش کی اس غرض کے لئے حیدرآباد کا سفر کیا اور سرکار عالی سے ایک لاکھ ستر ہزار کا گرانقدر عطیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے سرکار عالی کے علاوہ قوم کے دیگر فیاض رؤسا کے سامنے دست سوال دراز کیا ان کی خدمت میں سفارتیں بھیجیں خریطے پیش کئے جس جماعت کے پاس ایک پیسہ خرچ کو نہ تھا بلکہ مقروض رہتی تھی انجام کار ۱۹۱۶ء میں جب وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوتے ہیں تو مستقل سرمایہ کی آمدنی ایک ہزار روپیہ ماہوار کی شکل میں چھوڑتے ہیں۔

انھوں نے نہ صرف مالی دشواریوں کے حل میں کامیابی حاصل کی بلکہ دفتر کو مکمل نظام عمل کے ماتحت لانے کی طرف توجہ کرکے لایق کارکن مہیا کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

قیام انگلستان کے زمانہ میں جبکہ وہ انڈیا آفس میں ہیں اور کانفرنس سے ضابطہ کا کوئی تعلق ان کو باقی نہیں ہے اس وقت بھی وہ اس مہم سے غافل نہیں چنانچہ فن تعلیم کے متعلق نہایت عمدہ ذخیرہ کتب مہیا کرنے کی انہوں نے کوشش کی اور تقریباً ایک ہزار کتابیں کانفرنس فنڈ سے خرید کرکے داخل کتاب خانہ سلطان جہاں منزل کیں جو نہ صرف انگلستان کے اصول تعلیم اور اقسام تعلیم پر مشتمل ہیں بلکہ ان میں یورپ، امریکہ، جاپان کے نظام اور اصول تعلیم کے متعلق معلومات کا مفید خزانہ موجود ہے۔

اس مفید کتاب خانہ کے علاوہ ملک کے مختلف صوبوں کی تعلیمی کیفیت کو جانچنے کے لئے اور علم الاعداد کے ذریعہ سے صحیح طور سے معلومات بہم پہونچانے کی غرض سے تعلیمی رپورٹیں، کوڈ، کیلنڈر نیز مردم شماری کی رپورٹیں اور اضلاع کے گزیٹیر بھی مہیا کئے۔ مختلف شہروں میں کانفرنس کی لوکل کمیٹیاں اور پراونشل کانفرنسیں قائم کرائیں تاکہ تمام قومی تعلیم کا پروگرام ایک مرکز کے ساتھ وابستہ رہ کر سرگرم عمل ہو، ہزارہا تعلیمی اور اخلاقی رسائل چھاپ کر ملک کے گوشہ گوشہ میں تعلیم کے مختلف صوبوں کے دورے کئے اسپیچیں دیں تقریریں کیں۔ ماضی کی شوکت حال کی دردناک پستی کا مرقع قوم کے سامنے رکھا مستقبل کے نتائج سے آگاہ کیا ۱۹۰۹ء میں ٹیچرس کانفرنس قائم کی جس میں اسلامی تعلیم گاہوں کے اساتذہ کو دعوت دیکر بلایا اس کے پروگرام میں ان مسائل کو رکھا گیا جن کے سمجھنے

اور سمجھانے کے لئے ماہرین فن کی ضرورت ہے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے رسالے لکھے اور لکھوائے ہر سال اجلاس کانفرنس میں اس مسئلہ کی اہمیت یونیورسٹی کی خواہش اور ضرورت پر بحث کر کے سرگرمی کے ساتھ حصول سرمایہ کی کوشش کی۔

ممالک متحدہ صوبہ آگرہ و اودھ کی گورنمنٹ نے اگست ۱۹۱۴ء کو جو رزولیوشن مسلمانوں کے تعلیمی حقوق کی حفاظت میں منظور کیا اور جس کے تحت میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی نگرانی کے لئے صوبہ مذکور کے واسطے مسلمان انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے یہ ان کی اس پیہم کوشش کا نتیجہ ہے جو مسلسل طور پر کئے سال انھوں نے انجام دی اور بالآخر ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ۱۹۱۳ء میں بیٹھی اور جس کی سفارش پر رزولیوشن مذکور کا ۱۹۱۴ء میں ظہور ہوا رزولیوشن اگست ۱۹۱۴ء کے ماتحت سفیران کانفرنس کے ذریعہ سے بیسیوں مکاتیب قائم کرائے گئے۔

انھوں نے نہ صرف کانفرنس فنڈ کو ترقی دی ممبران کانفرنس کی تعداد میں اضافہ کیا مقاصد و اغراض کانفرنس کی تبلیغ و اشاعت میں کوشش کی، عمارت دفتر کے لئے سرکار عالیہ بھوپال سے اور دفتر کے استحکام کے لئے اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ اور دیگر فیاض روساء سے مالی امدادیں حاصل کیں بلکہ ان تمام ذرائع سے اور اپنے پُرجوش عمل سے کانفرنس کے غیر مکمل انسٹی ٹیوشن کو اس قابل بنا دیا کہ اس نے قوم کے حق میں اور تحریکات علمی کے نشو و نما میں آب حیات کا کام دیا اگر اس قومی خدمت کو وسائل موجودہ کے تحت میں حقیقی جذبات کے ساتھ انجام دیا جاوے تو بلاشبہ اُس کامیابی سے جو حاصل ہو چکی ہے اس سے زیادہ مفید اور دور رس نتائج پیدا ہونے کی توقع کیجا سکتی ہے۔

۱۹۱۷ء میں ان کا انڈیا آفس سے تعلق ہوا اور پورے سات برس کے بعد وہ انگلستان سے ہندوستان واپس آئے۔ واپسی پر خیال تھا کہ وہ پھر قانونی پریکٹس شروع کر دیں گے لیکن ان کی قناعت پسند طبیعت نے حصول زر کی طرف ان کو متوجہ نہ ہونے دیا اور وہ پوری فرصت کے ساتھ اپنے اس محبوب مقصد یعنی مسلم یونیورسٹی کی ترقی اور قومی تعلیم کی دُھن میں مصروف ہو گئے اور مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر ان کا انتخاب ہو گیا۔

فرائض متعلقہ کی دشوار گذار منزل کو انھوں نے پوری ذمہ داری، فطری جوش، اور بکمال انہماک کے ساتھ شروع کر کے اپنا تمام و کمال وقت اس خدمت کے لئے وقف کر دیا حتیٰ کہ ۱۹۲۵ء میں ان کی صحت اس درجہ خراب ہو گئی کہ وہ احباب کے مشوروں اور ڈاکٹروں کی بار بار کی تاکید سے وائس چانسلری کی خدمت سے کئی مہینے کی رخصت لینے پر مجبور ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی انہیں کی تحریک سے جس جوش و خروش سے منائی گئی علی گڑھ میں اس وقت کا سماں اور جوش قلبی کا نظارہ دور جدید کی اجتماعی کوششوں کا قابل یادگار واقعہ تصور ہوگا۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کے عہدہ وائس چانسلری کی میعاد سہ سالہ ختم ہو گئی آیندہ انتخاب کے لئے ان کا نام پھر

پیش ہوا مگر افسوس سلسلہ علالت اور صحت کی خرابی نے ان کو اپنا نام واپس لینے پر مجبور کیا اور وہ اس خدمت جلیلہ سے سبکدوش ہو گئے ۱۹۱۱ء میں وہ پراونشیل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کلکتہ کے ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علیگڑھ کی اور ۱۹۲۵ء میں پراونشیل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ممالک متحدہ آگرہ کے الہ آباد میں صدر بنائے گئے۔

وہ اپنے تمام حصہ عمر میں کبھی کانگریس کے ممبر نہیں ہوئے ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنے والد نواب غلام احمد خاں صاحب مرحوم (احمدی) کی یادگار میں ایک نہایت مفید اور باخیر کام کی بنیاد قائم کی اور اس یادگار کو اندھوں کے مدرسہ کی شکل میں جاری کرنا چاہا جس کی عمارت کا سنگ بنیاد مشہور زماں حکیم نابینا صاحب یعنی مولوی حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری سابق طبیب خاص اعلیٰ حضرت غفران مآب نظام سابق کے ہاتھوں سے رکھا گیا یہ خوبصورت عمارت۔ ہزارہا روپیہ کے صرف سے سول لائن علی گڑھ "آفتاب منزل" اور "سلطان جہاں منزل" کے سامنے پایہ تکمیل کو پہونچ چکی ہے اور اس میں جلد مدرسہ مذکور کا افتتاح ہونے والا ہے امید ہے کہ یہ خیر جاریہ زمانہ دراز تک جاری رہ کر نیک نفس بانی اور اس کی روح کے حق میں اجر عظیم کا باعث ہوگی جس کی نشانی اور یادگار کے لئے وہ قائم ہوئی ہے اور دور جدید کے ثمر اولین کا یہ جذبۂ خیر و نیکی دوسروں کے لئے راہ عمل ثابت ہوگا

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر — زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

نوٹ۔ خاکسار جامع اوراق کی درخواست پر صاحبزادہ صاحب موصوف نے ان حالات کو ملاحظہ کر لیا ہے۔ افسوس ہو کہ ۲۵ جنوری ۲۶ء کو وہ مرض فالج میں مبتلا ہوئے باوجود ہر قسم کی طبی امداد کے تقریباً چار مہینے گزرنے پر بھی صورت حال میں نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی قوت گویائی شروع سے مفقود ہے۔

خطبۂ صدارت

شکریہ

حضرات! میرا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اس سال کی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر منتخب فرما کر آپ نے میری جو عزت افزائی کی ہے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کروں۔ مع ہذا آپ مجھے نہایت صفائی کے ساتھ یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ اس جماعت کے ایک ادنےٰ خادم ہونے کی وجہ سے مجھے جو طمانیت خاطر نصیب تھی۔ بحالت موجودہ فضائے صدارت میں (جہاں آپ کے کرم نے مجھے فائز کیا ہے) حاصل نہیں ہے۔ جیسا آپ حضرات پر روشن ہے بحیثیت آنریری جائنٹ سکرٹری مجھے اس جماعت ملی کی سالہا سال خدمت کرنے کی عزت نصیب

رہ چکی ہے اور اُن اعیانِ محترم کے اختیار و انتخاب کرنے میں میں عرصہ تک حصّہ لیتا رہا ہوں جو دورِ گزشتہ میں اس کرسی صدارت پر جلوہ افروز رہ چکے ہیں لیکن مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جو مجھے خود ان مراحل سے گزرنا پڑے گا - اس مجلس کی صدارت کا فرض میرے سپرد کیا جائے گا - بہرحال یہ واقعہ پیش آگیا اور اب میں اس جدید حیثیت میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں - میں کامل توقع رکھتا ہوں اور اس کا امیدوار ہوں کہ مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے اُسے آپ اُس مرحمت اور تحمّل سے گوش گزار فرماکر مجھے مرہونِ منت بنائیں گے جو اس کانفرنس کے حاضرین کا امتیازِ خصوصی رہا ہے -

تعلیم کی اہمیت

حضرات ! ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں مسائل تعلیمی کے بارہ میں بالعموم اور مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق بالخصوص کچھ عرض کروں - لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس مسئلہ پر اتنا کہا اور لکھا جا چکا ہے کہ اب بمشکل کوئی ایسی بات کہی جا سکتی ہے جو بالکل جدید یا آپ کے غور و توجہ کے قابل ہو - بہرحال پچھلے چند سال کے واقعات اور وہ بحرانی دور جس سے ہماری قوم گزر رہی ہے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم ان حقائق اور اصول کی یاد تازہ کرلیں جنھوں نے ہمارے ماضی کو متشکل کیا تھا جو ہمارے حال پر جاری و ساری ہیں اور جن سے ہمارا مستقبل اثر پذیر ہوگا - میں ان لوگوں میں ہوں جن کا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ہمارے مستقبل کا تمام تر دارو مدار اس حقیقت پر ہے کہ ہم کس طور پر اور کس حد تک اپنے تعلیمی مسائل کو حل کرتے ہیں - ملک یا تمام عالم میں صورت حال کچھ ہی کیوں نہ ہو - گورنمنٹ یا ہماری ملکی بھائیوں کی رویہ و روش میں کیسی ہی تبدیلی کیوں نہ ہو - یہاں یا کسی دوسری جگہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمارے تعلیمی دستور العمل اور اس کے نفاذ میں کسی قسم کی بھی مزاحمت یا اختلال نہ پیدا ہونا چاہیئے - لیکن ایسا نہیں ہوا - یہ وہ حقیقت ہے جس پر پچھلے چند سال کے واقعات شاہد ہیں جب کہ نہ صرف سالہا سال کی تعلیمی جد و جہد کے ثمرات خطرہ میں ڈال دیئے گئے بلکہ کل تحریک کو کم سے کم ایک نسل کے پیچھے ڈال دیا گیا - یہ واقعی نہایت حیرت انگیز امر ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ حالات جدید کا مطلع ، جو جنگ اور اصلاحاتِ جدید کے نتائج کا رہینِ منت ہے - نمودار ہو کر تعلیم اور اعلیٰ قابلیت کا جدید و مزید مطالبہ کر رہا تھا - مسلمانوں کے ایک طبقے نے اپنے تعلیمی نصب العین کی سرگرمیوں

کو محض روک ہی نہیں دیا بلکہ اسے ایک طرف ڈال کر نہ صرف سرد مہری اور بے تعلقی کا رویہ اختیار کر لیا۔ بلکہ اپنی اُن محبوب انجمن و مجالس و تعلیم گاہوں کو معاندانہ تگ و دو کا آماجگاہ بنا لیا جو نصف صدی تک قوم کی بہترین اور سرگرم ترین جانفشانیوں کا مرکز رہ چکی تھیں۔ یہ مسئلہ اس امر کا مقتضی ہے کہ آپ اپنی موجودہ حالت اور آئندہ توقعات کا بارِ دگر جائزہ لیں اور میں آپ کی اجازت سے ایسا کرنے کی کوشش کروں گا۔

سرسید کی یاد

حضرات! قسمت کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے عدیم المثال رہبر و رہنما سرسید علیہ الرحمۃ کی اُن عدیم المثال جاں فشانیوں کے باوجود جو وہ اسلامی جماعت اور اس کے مقاصد تعلیمی کے لئے نصف صدی سے زیادہ برسرکار لاتے رہے ہم اب تک اس ملک اور اس زمانہ میں بھی ان مسائل مہمہ کے متعلق اپنا ذہنی توازن نہیں قائم کر سکے ہیں جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ یہ منظر بھی کتنا روح فرسا ہے کہ سرسید کی خدمات اور کارگزاریوں کو فراموش کرنے والے وہ افراد ہیں جن کے لئے مرحوم نے اپنی حیات اور مساعی کا پورا سرمایہ وقف کر دیا تھا۔ اور جن کی بصیرت اور انشراح قلب کے لئے، اُنھوں نے مہتم بالشان اسوۂ حسنہ اور غیر فانی کامیابیوں کا بے پایاں ترکہ چھوڑا ہے اگر میں آپ کے قیمتی لمحات کا کچھ حصہ سرسید کے اُن خدمات کی ایک مختصر روئداد سنانے میں صرف کر دوں جن سے ان کا نوع انسانی کے بزرگ محسنوں کے زمرے میں شمار ہونے کے قابل ہے تو شاید مجھ سے کسی قسم کے اعتذار پیش کرنے کا مطالبہ نہ کیا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ سرسید کی یاد کو نوخیز نسل کے ذہن و دماغ سے آشنا ہی کر دینا ہندوستان کے تعلیم کے اغراض و مقاصد کی بہترین علم برداری ہوگی کیوں کہ انیسویں صدی کے جملہ تعلیمی تحریکات اور اصلاحات میں حقیقت اور قوت کی جو روح پیدا تھی سرسید اس کے پیکر مجسم تھے۔

عام خدمات

حضرات! سرسید کی قومی زندگی گزشتہ صدی کے ایک معتد بہ حصہ پر محیط رہی ہے۔ اس کا آغاز ۱۸۳۷ء سے ہوتا ہے اور سلسلے کی آخری کڑی ان کے وفات ۱۸۹۸ء پر ختم ہوتی ہے۔ ان کی زندگی اور ان کی خدمات کی تفصیل پیش کرنا نہ میرا مقصد ہے اور نہ اس کا یہ موقع ہے وہ اپنی جسمانی اور ذہنی صلابت دونوں کے اعتبار سے تہمتن دقت تھے اور ان کی ہمہ گیر تگ و تاز ہندوستان کے جملہ مسائل مہمہ کے ہر شعبے اور پہلو کو

محیط تھی۔ ان کی وہ خدمات جو ہندوستان کی آئینی اور سیاسی اصلاحات کے لئے وقف تھیں۔ ان کی وہ سرفروشانہ جانبازیاں جو اسلام کے تحفظ اور علمبرداری میں اُن سے عمل میں آئیں۔ ان کی وہ زندۂ جاوید عطایا جو ملک و ملت کی تعلیمی ترقی کے لئے نذر تھیں۔ ان کی وہ خدمات جن سے معاشری اصلاحات اور ادبیات دونوں گراں بار ہیں ان کے وہ ناقابل فراموش کارنامے جن سے صحافت اور ادب اردو مالا مال ہے، یہ اور دیگر کارہائے نمایاں ان کی قومی زندگی کی اس مکمل داستان کے ترجمان ہیں جو ساٹھ سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے لیکن دو مقاصد عین ایسے تھے جو ان کی طویل زندگی کے تمام کارناموں کے روح رواں تھے (۱) اسلام کا سچا عشق و درد (۲) مادر ہند کی خدمت کے لیے عقیدتمندانہ سرگرمی و جدوجہد۔

تعلیمی خدمات

حضرات! عام طور پر سرسید ایک بڑے اسلامی رہبر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اُن کے ملک کے مسلمہ رہبر اور محسن ہونے کی حیثیت کو عام طور پر لوگوں نے کما حقہٗ محسوس نہیں کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۰ء تک ان کی تمام وہ مساعی جو تعلیم، تربیت اور سیاست کے میدان میں عمل میں آئیں۔ من حیث الکل بغیر کسی امتیاز ملت و مذہب کے جمیع باشندگان ہند کے مفاد و مقاصد کے لئے مخصوص تھیں اس کی وضاحت ان چند واقعات سے ہو جائے گی۔ جو اس حقیقت سے متعلق ہیں۔

ہندو اور مسلمان لڑکوں کی تعلیم کے لئے انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک اسکول مرادآباد میں اور ۱۸۶۳ء میں ایک اسکول غازی پور میں قایم کیا۔ ۱۸۶۲ء میں سائنس کی کتابوں کے ترجمے کے لئے ایک سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۶۶ء میں اُس تحریک کے بانی اور سرہوئے جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ پراونشیل گورنمنٹ نے ہر ضلع میں غیر سرکاری ہندوستانیوں کی انجمن شوریٰ قایم کردی جو تعلیمی معاملات میں حکام کو مشورہ دیتی تھی۔ فی نفسہ یہ تحریک اور انجمن دونوں قومی حیثیت رکھتی تھیں جس میں ہندو مسلمان اور یوریپین ہر فرقے کے لوگ شامل تھے اور جس کی غایت ان مفاد و مقاصد کی محافظت تھی جو ہر باشندہ ملک کے لئے مشترک تھے۔ ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنا ڈالی جس میں ہندو مسلمان اور یوریپین اراکین شامل تھے اور جس کا مقصد ہندوستانی شکایات کو براہ راست برٹش پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ نظر بر آں سرسید کا شمار اُن اولین ہندوستانی رہبروں میں ہوتا ہے جنھوں نے تعلیمی جماعتیں قایم کیں اور ایسی اجتماعی ادبی اور سیاسی انجمنوں کی بنا ڈالی جو خصوصیات ملی کی حامل اور مفاد عام کی ذمہ دار تھیں۔

سیاسی خدمات

حضرات! سرسید نے ملک کی سیاسی نجات کے لئے جن کارہائے نمایاں کے نقوش چھوڑے ہیں، ان کا تذکرہ تفصیل طلب ہے کیوں کہ برادرانِ وطن کے بعض طبقوں نے ان کو غلط طور پر سمجھا اور ریش کیا ہے۔ سرسید کے سیاسی اصول کو غلط طور پر سمجھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگ نہ صرف ان کی تعلیمی تحریک اور تعلیمی کارناموں کو اپنی غلط فہمیوں کا آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں بلکہ ان کارناموں کو موردِ اعتراض و بدگمانی بھی قرار دیتے ہیں ہماری جماعت کے تعلیمی مقاصد کو اس غلط فہمی اور غلط رائی سے جیسا شدید نقصان پہنچ چکا ہے اس کا اقتضا ہے کہ ان غلطیوں کا جلد سے جلد ازالہ کیا جائے۔ میرا خیال ہے اور غالباً میرے اس خیال سے عام اتفاق ہوگا کہ وہ ہیجان و اضطراب و سیاسی جدوجہد جو ایک نسل کی مدت حیات سے زیادہ عرصہ تک اس ملک میں برپا و جاری رہی ہم کو ذیل کے دو سبق سکھاتی ہے:-

(۱) سوراج کا حصول، سیاست کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اور

(۲) اس نصب العین کا سنگِ اساس ہندو مسلم اتحاد ہے۔

سرسید اور سوراج کا تخیل

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ وہ شخص جس نے ہندوستانیوں میں سب سے پہلے اس حقیقت کو محسوس کیا وہ ہمارے رہبر سرسید تھے۔ وہ ذات سرسید ہی کی تھی جس نے اس حق کا مطالبہ کیا اور سوراج کے اولین نقوش اس ملک کے صفحات پر بٹھائے۔ سرسید ہی نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور اس کی تبلیغ، ایسے وقت ایسے طریقے اور ایسی زبان میں کی جو آج تک قابلِ یادگار رہے۔ حصول سوراج کی آخری منزلوں کے طے کرنے کی سعادت خواہ کسی کو نصیب ہو۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف قرینِ انصاف ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر اُس شخص کے لئے جو اربابِ حکومت کے اشتباہ اور عتاب کا مورد ہوتا۔ مارشل لا اور دار و رسن پذیرائی کے لئے موجود تھے۔ صرف سرسید کی وہ ذات تھی جو قوم و ملک کے لئے سب سے پہلے سینہ سپر ہوئی اور جس نے حکومت نیابیہ کی اولین علَم برداری کا طرۂ امتیاز حاصل کیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سرسید نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" تصنیف کی جس میں انھوں نے نہایت دلیری کے ساتھ ان تمام اسباب و علل پر بحث کی جو اس واقعہ سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ "بغاوت کا سببِ اولین" (سرسید کا مدلل اور قطعی فیصلہ تھا) مجلسِ وضعِ قانون میں بحیثیت ایک رکن کے ہندوستانیوں کی عدم مداخلت تھی۔"

آپ اُن کلمات ذیل پر غور فرمائیں جو سر سید نے اپنی کتاب میں ۶۵ سال قبل تحریر فرمائے تھے۔

"میرا خیال ہے بہت سے لوگ اس امر میں میرے ہمنوا ہوں گے کہ گورنمنٹ کی عافیت اور کامرانی بلکہ حقیقتاً اس کی تاسیس و استحکام کے لئے یہ لازمی ہے کہ عامۃ الناس کو کونسل میں اپنے خیالات کی ترجمانی کا موقع دیا جائے۔ یہ صرف ان کی آواز ہوگی جو ابتدا ہی میں غلطیوں کا سدباب کر دے گی اور قبل اس کے کہ وہ غلطیاں طشت از بام ہو کر ہمیں ورطۂ ہلاکت میں ڈال دیں اُن سے ہم آگاہ اور متنبہ ہو جائیں گے۔ .... یہ آواز اس وقت تک گوش گزار نہیں ہو سکتی اور یہ تحفظ اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک حکومت کی افکار و آراء میں عامۃ الناس کو دخل نہ ہو۔ .... جو لوگ ہندوستان پر اس وقت حکومت کر رہے ہیں ان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یہاں ان کی حیثیت غیر ملکیوں کی تھی۔ ... ... حاکم و محکوم میں اختلاف مذہب و ملت، اختلاف رسم رواج، اختلاف بود و ماند، اختلاف آرا و افکار ظاہر ہے۔ حکومت کی استواری محکوم کے اخلاق و سیرت کے احساس و آگہی پر نہیں بلکہ ان کے حقوق اور بہزاداریوں کی کماحقہٗ بجا آوری پر ہے ... ... قانون کو انھیں اختلافات و افکار و رسوم کے مطابق بنانا چاہیئے۔ یہ خود قانون کے مطابق نہیں بنائے جا سکتے ... ... ابتدا رکار ہی سے ان کو نظر انداز کیا جانا خود فطرت انسانی کو نظر انداز کرنے کا مرادف رہا ہے اور ان کی طرف سے تغافل برتنا ہمیشہ عالم گیر اضطراب و ہیجان کا باعث ہوا ہے۔"

غدر سے پہلے ہندوستان میں بددلی اور بدگمانی کے جو اسباب رونما تھے ان کا حوالہ دیتے ہوئے سر سید فرماتے ہیں۔

"جب لوگوں نے حکومت برطانیہ کو ایک بطی الاثر سم، ایک ریگستان ریگ اور ایک شعلۂ سست و فا تصور کرنا شروع کیا ... ... جب حاکم اور محکوم کی باہمی حیثیت یہ ہو پھر وفاداری اور خیر سگالی کی امید کہاں!"

یہاں صرف اس قدر اضافہ کر دینا کافی ہوگا کہ ابھی زیادہ مدت نہیں گزرنے پائی تھی کہ یہ مہتم بالشان مساعی ثمر آفریں ثابت ہوئیں اور سر سید کی وکالت و نیابت کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۱ء میں

پہلے ہندوستانی ممبر نے مجلس واضعانِ قانون میں بار پایا۔ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۸۹۲ء میں جب مجھے انڈین نیشنل کانگریس کے بانی مسٹر اے آر، او ہیوم آنجہانی سے انگلستان میں ملنے کا اتفاق ہوا تو اُنھوں نے فرمایا کہ سرسید کی تصنیف و اسباب بغاوت ہند ہی کا تصرف تھا جس سے مجھے سب سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس ایسی ایک مجلس قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

حضرات! وہ لوگ جو سرسید کے سیاسی اصول اور طرز عمل پر معترض ہیں انھیں ایک لمحہ تامل فرماکر ان مہتم بالشان تاریخی کارناموں اور ان مساعی جمیلہ کا بنظر امعان مطالعہ کرنا چاہیئے جن کے تصرف سے سرسید نے اس آئینی قصر کا سنگ اساس رکھا تھا جس کی رفعت اور وسعت ۱۸۶۱ء سے برابر ترقی پذیر رہی ہے۔ اس قصر کی اوج اور وسعت میں اب کیسی ہی ترقی کیوں نہ ہو اولین نقش و نقاش کی یاد زندۂ جاوید رہے گی جیسے ان لوگوں کو فخر کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے جن کے رہبر نے پہلے ہندوستانی کی حیثیت سے مادرِ وطن کی سیاسی نجات کے لیئے اپنی پرستاریوں کا اولین تحدیہ پیش کیا اور ملک کے مفاد و معاد کے لیئے اپنے فرزندانہ عبودیت کا پورا سرمایہ وقف کر دیا تھا۔

حضرات! یہاں تک تو میں نے ان خدمات اور کارگزاریوں کا تذکرہ کیا ہے جن کی بنا پر سرسید مخلص ترین فرزندان ہند کی صف میں جگہ رکھتے ہیں اور وہ من حیث الکل ہندوستان کے رہبر و رہنما تسلیم کیئے جا سکتے ہیں۔ اب میں سرسید کی چند اُن خدمات کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو ملت اسلام کے لیئے اُن سے عمل میں آئیں ایک طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام عمر اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ اسی مقصد کے لیئے تھا لیکن اُنھوں نے اسلام کو ایک سچا اور الہامی مذہب تصور کرکے اس کے قیام و بقا کے لیئے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اب میں اس کا تذکرہ آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں ان کی تگ و دو کی جولان گاہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے لیکن میں چند نہایت وقیع اور معروف واقعات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مذہبی خدمات

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت سرسید منظر گاہ عام پر نمود ار ہوئے ہیں اسلام پر تین طرف سے نرغہ تھا۔ اول تو عیسائی نکتہ چینیوں کا مقابلہ تھا جو اسلام کو مذہب السیف اور اس کے رسول کو (نعوذ باللہ) خداع و مفتری خیال کرتے تھے اور چوں کہ اُن کی غلط آرائیوں کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور ان کی تردید نہیں کی گئی۔ یورپ اور دیگر ممالک عالم میں اسلام کے خلاف ایک عام سوء ظن تھا۔ دوسرا خطرہ عقلیات، لاادریت اور حکلیات کے ان نظریوں کا تھا جو اُس زمانے میں عالم گیر تھے۔ اور عام طور پر مذہب و ملت کے معتقدات خصوصی کی بیخ کنی کر رہے تھے۔ تیسرا

خطرہ خود مسلمانوں کا روحانی، اخلاقی، ذہنی اور مادی انحطاط تھا جس نے تمام عالم میں مسلمانوں کے اقتدار و حیثیت کو ضعیف کر دیا تھا۔ اعانت عامہ کے بغیر اور شدید مخالفتوں اور مایوسیوں کے باوجود سر سید نے ان قوتوں کے خلاف جو مجاہدہ کیا ہے وہ اس عقیدت اور محبت کا اصلی پیمانہ ہے جو سر سید کو اسلام سے تھی۔

حضرات! یہ واقعہ آپ کی خاص دلچسپی کا باعث ہوگا کہ پہلے خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سر سید نے ۱۸۵۹ء میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جو "تبیین الکلام" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ خود انجیل کی ایک تفسیر تھی جس میں سر سید نے اسلام کی حقانیت ثابت کی تھی۔ بقول مولانا حالی مرحوم "سر سید پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے دعاوی کی ثبوت میں عیسائی مخالفین کی ان مبادیات اور منقولات کو پیش کیا تھا جس کے از روئے عقل و انصاف خود موخرالذکر منکر نہیں ہو سکتے تھے۔ دیگر مفسرین اسلام اپنے قول وسند کی بنیاد کلام پاک اور حدیث شریف پر رکھتے تھے۔ سر سید کے اقوال اور اجتہاد کا ماخذ خود انجیل مقدس تھی۔"

اس کتاب کے علاوہ تمام عمر سر سید اس مضمون پر بہت کچھ تحریر فرماتے رہے۔ لیکن اس سلسلہ میں نمایاں ترین خدمت ۱۸۷۰ء میں انگلستان میں خطبات احمدیہ کی تصنیف اور اشاعت تھی جو سر ولیم میور کے اس تصنیف کے جواب میں لکھی گئی تھی جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات اور رسالت پر حملے کئے گئے۔ اس خدمت کی حقیقت اور غیر معمولی اہمیت کو صحیح طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں جستہ جستہ ان حالات اور واقعات کو بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں جن کے ماتحت یہ تصنیف تمام و کمال کو پہنچی تھی۔ اس مقصد کے لئے میں سر سید کے اُن خطوط کے کچھ انتخاب پیش کروں گا جو انھوں نے اپنے دوست نواب محسن الملک مرحوم کو انگلستان سے بھیجے تھے۔ ایک خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اُس نے دل کو جلا دیا اور اُس کی نا انصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کہ کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے"

ایک دوسرے خط میں لکھا ہے:۔

"مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں مصروف ہوں اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے آپ اس خط کے پہونچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے سود ادا روپیہ میں دوں گا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے ملئے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیجدو۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہوگیا ہے۔ خدا مدد کرے"

پھر لکھتے ہیں:

"میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے..... اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔ ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس بات پر تو لڑنے کو تیار ہو جاویں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کیوں کھایا مگر جب کہو کہ مذہب کی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچا جائیں گے"

پھر تحریر فرماتے ہیں:

"میں اپنا حال کیا لکھوں۔ سکتا سا ہوگیا ہے۔ دن رات کی تکلیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے۔ جلد اول خطبات احمدیہ کی تمام ہوگئی ہے اس مہینہ میں چھاپہ بھی تمام ہو جاویگا اب جو اندازہ اس کی ایک جلد کے چھاپنے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے ہیں اور جان میں جان نہیں۔ میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے۔ تین سو روپیہ اس کے چندے کی بابتہ بھیجے ہیں۔ میر ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو بھیجا ہے۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ کا بھیجدیا۔ آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھجوا دیجئے۔ اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیجدیجئے"

یہ حالات اور واقعات تھے جن کے ماتحت سر سید نے یہ مہتم بالشان کتاب لکھی اور شائع کی، جن کے متعلق مولانا حالی کا ارشاد ہے کہ سر سید پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے یورپ جا کر، اسلام اور رسول پاک صلعم کی حمایت میں انگریزی زبان میں ایک کتاب تصنیف فرمائی جس میں بحث و استدلال کا ایسا طریقہ اختیار کیا گیا تھا جو معتقدات پر نہیں بلکہ براہ راست عقل و ادراک پر اپنے اثرات کے

نقوش بٹھاتا تھا اور جو روحی فداہ کے دینی تعلیمات کی حقیقت تامہ کو خود اسی کی سزاواریوں کے بنا پر اور اُن کے اُن اثرات کو جو انسانی عروج اور عافیت کے ہر پہلو پر محیط تھے ثابت کرتا تھا۔ آج تک کسی دوسرے مسلمان نے بیرونی نکتہ چینوں کا مقابلہ ان اسلحہ سے نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب نے یورپ کی آرائے عامہ پر نہایت زبردست اثر ڈالا جس کے ثبوت میں اس زمانہ کے وہ مختلف اور متعدد مضامین پیش کئے جاسکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

حضرات! مجھے یقین ہے یہ امر آپ کی خاص دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ان مضامین کی پہلی جلد جب تکمیل پا چکی تو اس کا ایک نسخہ سرسید نے ہز مجسٹی سلطان المعظم کی خدمت میں ارسال کیا اور عریضہ بھی روانہ کیا جس میں تحریر فرماتے ہیں:

> "یہ صرف اس محبت اور عقیدت گزینی کا تصرف نہ تھا جو مجھے بانیٔ اسلام کی ذات مقدس سے تھی بلکہ یہ فرض عبودیت کا شدید ترین تقاضا تھا جس کی بنا پر جہاں تک میری ناچیز مجال و قدرت نے مساعدت کی۔ میں نے دَور حاضرہ پر اپنے مقدس مذہب کی حقیقت تامہ اور حکمت بالغہ کو آشکارا اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علوم حکمیہ و عقلیہ اور دیگر روشن خیالیوں کا سیلاب رواں اسلام کے دوش بدوش رہنموں رہ سکتا ہے ... خدا اور اس کے برگزیدہ رسول کی تائید سے میں نے پہلی جلد مکمل کر لی ہے۔"

یہاں پر میں نے خود سرسید کے الفاظ میں اس مقصد کا اظہار کر دیا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر سرسید نے اس کتاب کو لکھا تھا اور اب میں یہ دریافت کروں گا کیا ہم میں سے کوئی شخص ایسے ہندوستانی مسلمان کا نام پیش کر سکتا ہے جس نے سرسید کے عہد سے قبل اسلام کی حمایت میں۔ بیرونی نکتہ چینوں کا مقابلہ کرکے، ایسی گراں قدر خدمات انجام دی ہوں۔ سرسید نے جو طریقۂ مدافعت اختیار کیا تھا اس کے متعلق اختلاف آرا کا امکان ہے لیکن کیا کوئی صاحب انصاف و شعور سرسید کی اس سرگرمی خلوص، جرأت اور عبودیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتا ہے جس کی بنا پر آج سے نصف صدی قبل یہ بندۂ خدا اسلام کی حمایت میں عملاً اپنے ساری متاع و معیشت کا فاتحہ پڑھ کر، بحر و بر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے سات ہزار میل دور، دیار غیر میں یکہ و تنہا تمام ارضی قوتوں کے مقابلہ میں صیانت اسلام کا علم بردار ہو کر سامنے آیا!

میرا عقیدہ ہے کہ یہی ایک خدمت ان کی نجات اخروی اور ان کے ہم مذہبوں کے شکر گزار قلوب میں ان کی یاد کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے کافی ہے۔

حضرات! اب میں چند ایسے کلمات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ سرسید نے اسلام کے دوسرے خطرے، یعنی عقلیات اور لاادریت کے اس طغیان وعصیان کی رَو جو اس زمانہ میں برپا تھی کس طور پر مقابلہ کیا۔ وہ پوری بیداری کے ساتھ اس خطرے سے آشنا تھے لیکن جیسا کہ ان کو یقین تھا "علوم حکمیہ وعقلیہ اور دیگر روشن خیالیوں کا سیلاب رواں اسلام کے دوش بدوش رہنموں رہ سکتا ہے" وہ اس کے قائل تھے کہ اس رہنمونی اور ہمعنانی کو ایک مستقل حیثیت دے دینا ہی مدافعت کا بہترین ذریعہ تھا۔ اس سلسلے میں وہ ایک مدت تک متعدد مضامین رسائل اور چھوٹی بڑی کتابیں لکھتے رہے۔ اس مبحث پر تہذیب الاخلاق میں ان کے جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں انھیں ادب اردو اور صحافت میں کلاسکس (مسلمہ ادبی حیثیت) کا رتبہ حاصل ہے لیکن اس میدان میں ان کی سب سے زبردست جاں سوزی وہ تھی جو کلام پاک کی تفسیر لکھنے میں عمل میں آئی اور جس کا سلسلہ اُنھوں نے دم واپسیں تک جاری رکھا۔

سرسید کے مذہبی عقائد

حضرات! سرسید کے مذہبی خیالات بالعموم اور ان کی وہ آراء وافکار جن کی حامل ان کی تصانیف ہیں بالخصوص جن مناقشات کا باعث ہوئی ہیں اور جن شرارہائے غیظ وغضب ۱۸۶۰ء سے ۱۸۹۸ء تک مشتعل رہے ان کا مجھے کامل احساس ہے۔ اس مناقشہ پر کسی قسم کی رائے زنی کرنی میری بساط عقل وفہم سے یوں دور ہے کہ ان کا تعلق اُن مسائل شرعیہ سے ہے جن کی تعبیر وتاویل متنازعہ فیہ ہے ممکن ہے ایسا وقت ضرور آئے گا جب ہمارے مسلم یونیورسٹی کے طلبا جو ایک طرف اسلامی شریعت اور اسلامی فضائل کے علَم بردار اور دوسری طرف علوم جدیدہ کے عالم متبحر ہوں گے۔ اس موضوع پر اپنی صحیح اور قطعی رائے قائم کر سکیں گے لیکن ہم اُن اسباب کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اُس غرض وغایت کو قدر کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں جن کے ماتحت سرسید نے اس خارزار میں قدم رکھے تھے اور اس کے لئے مدت حیات کے آخری لمحات تک اپنے اوقات اور عافیت کی کسی ممکن قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ چوں کہ سرسید کو محض اس خطرے کا احساس ہی نہیں ہو چکا تھا بلکہ وہ خود ان علوم کو مقبول انام بنانے میں نہایت نمایاں حصّہ لے چکے تھے اس لئے اس معاملہ میں وہ ایک طرح کی شخصی ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلامی عقائد "علوم حکمیہ اور روشن خیالیوں کے سیلاب رواں کے ساتھ رہنموں رہ سکتے تھے"۔ اس لئے وہ اپنی نوخیز قوم کے لئے ضروری سامان حفاظت کا مہیا کرنا اپنے اوپر ایک فرض تصوّر کرتے تھے۔ رہا یہ کہ انھوں نے کون سا راستہ اختیار کیا تھا یا اسلام اور علوم حکمیہ کے سیلاب رواں کے

ہم دوش وہم عنان ثابت کرنے کی ضرورت کیا تھی یا اس کی سند جواز کیا تھی۔ ایسے امور ہیں جن کے متعلق اختلاف آرا کا امکان ہو۔ لیکن کیا کوئی متنفس اس سلسلے میں سرسید کے خلوص مقاصد یا مہتم بالشان مساعی اور قربانیوں کا بھی منکر ہو سکتا ہے؟ ان خدمات کی اصلی حقیقت کا فیصلہ خود وقت اور زمانہ کے ہاتھوں سے ہوگا۔

ایک تریاق کی تلاش

حضرات! اب میں سرسید کی ان خدمات کا تذکرہ کروں گا جو اسلام کے اُس تیسرے خطرے سے متعلق ہیں جو اپنے اندیشناکیوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ سنگین تھا اور ملتِ بیضا کو نرغے میں لے چکا تھا۔ یعنی مسلمانوں کا وہ روحانی، اخلاقی ذہنی اور مادّی انحطاط جو تمام عالم میں رونما تھا سرسید کے نزدیک سیاسی قوت اور مادّی مرفہ الحالی کا انحطاط قومی زوال کی کوئی سنگین علامت نہ تھی، یہ صرف روحانی جمود، ذہنی بے بضاعتی۔ اخلاقی انحطاط اور طبعی ناقابلیتوں کا نتیجہ صریح تھا جس میں عملاً وہ اپنے قوم کے ہر فرقے کو مبتلا پاتے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ آخر اس عالم گیر سقم وفساد، پراگندگی اور بے ربطی کا اصلی سبب کیا ہے۔ سرسید کا ایمان اور عقیدہ یہ تھا کہ حقیقی اسلامی معاشرت اور ناکامی حیات دو متضاد چیزیں ہیں کیوں کہ اسلام فی نفسہ ان تمام اصلی اور حیاتی قوتوں کا مجموعہ ہے جو انسانی کامیابیوں اور کامرانیوں کی معین ہوتی ہیں بنظر برآں مسلمانوں کے زوال و انحطاط کی صرف ایک ہی تفسیر ہو سکتی ہے۔ یعنی اُن کا اصول اسلام سے انحراف موجودہ تعلیمی اور معاشرتی جماعتوں کو بنظر امعان مطالعہ کرکے سرسید اس عقیدے پر پہنچ چکے تھے کہ گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کی قومی زندگی کی جس چیز نے رہبری کی ہے وہ صرف عقائد اور مبادیات تھے جو اسلام کی اصل وحقیقت سے نہیں بلکہ اسلام کی لفظی تعبیر اور ظاہری نوعیت سے وابستہ تھے اس لئے اُنھوں نے اپنی زبردست فکر وعمل کو ایک ایسے تریاق کی تلاش وتفحص میں تکان ذہنی شروع کردی جو ان شکایات مزمنہ کا ازالہ کرسکتی۔ سرسید نے اس قومی آزار وعلت کا مجرب نسخہ تعلیم وتربیت کی اس اسکیم کی صورت میں پیش کیا تھا جس کی مجوزہ مسلم یونیورسٹی حامل تھی۔ لیکن اس نسخے کے اجزا وعناصر کے تجویز وتیقن میں سرسید کو اس دیرینہ اور معتقد نظام تعلیم وتربیت سے یک لخت انحراف کرنا لازمی تھا جو صدیوں بیشتر سے معرضِ امتحان وآزمائش میں تھا۔ اور جو نتائج اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناقص اور ناموزوں ثابت ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کو اُن لوگوں کے خلاف صف آرا ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار نظر نہ آیا جو نظام پیشیں کے علم بردار وں میں سے تھے۔ کیوں کہ جن امور تنقیح طلب کو سرسید نے پیش کیا تھا وہ براہ راست اُن عمیق افکار وجذبات

سے متصادم ہوتے تھے جن کا مدار مروّجہ معتقدات شرعیہ، روایات اور انداز معاشرت پر تھا۔

سرسیّد کے نزدیک شعائر و مبادی اسلام کی اہمیت

حضرات! اب ہم موجودہ مبحث کے اہم اور بالغ ترین پہلو سے آشنا ہونے والے ہیں کیوں کہ سرسید کی وہ اسکیم جو اس مناقشہ کا باعث ہوئی اور جس نے گزشتہ صدی کے اواخر میں ہماری قوم کو کم و بیش ایک نسل کی مدت حیات تک اضطراب اور ہیجان کی کشاکش میں مبتلا رکھا تھا۔ ان تنقیحات اساسی کی محرک ہوتی ہے جن کے صحیح احساس و اختیار پر ہماری قوم کا مستقبل بتمام وکمال منحصر ہے۔ آپ کو ان طوفان زائیوں سے آشنا کرنے کے بعد جن کا میں نے ابھی ابھی تذکرہ کیا ہے میں اس موضوع کو دوبارہ معرض بحث میں لانا ضروری نہیں تصور کرتا تھا لیکن گزشتہ چند برسوں میں کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں اور چند ایسی رجعت انگیز قوتیں برسرکار آئی ہیں کہ اس مسئلہ مہمہ کا ایک بار اور جائزہ لینا ضروری ہوگیا ہے۔ میں اس امر کو تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں کہ جن لوگوں نے سرسید کے اس اسکیم کی مخالفت اور نظام پیشیں کی حمایت اس بنا پر کی تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا یہی بہترین طریقہ تھا۔ ان کی خلوص نیت پر حرف نہیں لایا جاسکتا۔ ایک حد تک یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سرسید اور یہ لوگ دونوں سچے مسلمان پیدا کرنے کے آرزومند تھے۔ لیکن ایک سچے مسلمان کے نمونہ اور امتیازی خصوصیات کے متعلق دونوں کا اندازہ اور معیار جدا گانہ تھا۔ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ تعلیمی، شریعت اسلامی سے بے نیاز نہیں رکھا جا سکتا اور ہم کو اپنے تعلیمی قصر کی بنیاد اسلام کی مبادیات اور شعائر اساسی پر رکھنا چاہیئے۔ لیکن سرسید کا دعوے یہی تھا کہ ان کی اسکیم ان شرائط کو تمام وکمال پورا کرتی ہے۔

سرسیّد کے نزدیک روح و جسم کا تعلّق

حضرات! آیئے اس مبحث کے مالہ و ماعلیہ سے قطع نظر کر کے ہم سرسید کے اس رویہ کا جائزہ لیں جو مسئلہ تعلیم کے متعلق انھوں نے اختیار کیا تھا اور جس کی مختصر روئداد یہ ہے۔

سرسید کا عقیدہ تھا کہ خواہ ہم مسلمان، ہندو، عیسائی یا کسی اور مشرب سے منسلک ہوں؛ زندگی کے ہر شعبے میں ہماری کامیابی و کامرانی کا مدار قطع نظر حوادث روزگار، ہماری روحانی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی سازگاریوں پر ہے۔ ایمان کی حقیقت اور وسعت کو بوجوہ احسن محسوس اور محقق کرنے کے لئے بہترین اور بلندترین استعداد ہائے ذہنی اور روحانی کی ضرورت ہے عملی زندگی کے ہر شعبہ میں معیار عمل پر صحیح اُترنے کے لئے جس اہلیت تامہ کی پرسش ناگزیر ہے

اس کے لئے سخت و محکم اخلاقی قوت اور جسمانی تاب و توانائی لازمی ہے۔ اس لئے ہر اس نظام تعلیم میں جس سے توقع کی جاتی ہو کہ وہ حیات مسلم کے نصب العین ایمان بالعمل کا موید اور محرک ہوگا۔ ایسی رعایتیں ملحوظ رکھنی پڑیں گی جو ان اساسی فضائل انسانی کی تخلیق اور توسیع کا باعث ہوں سر سید جس نتیجہ پر پہونچے تھے وہ یہ تھا کہ چوں کہ نظام پیشین عملاً اُن انسانی معارف اور معلومات کو جن کی موجودہ علوم و فنون اور ادبیات حامل ہیں بالکل نظر انداز کرتا تھا اور ان کی طرف سے بے اعتنا تھا، اس لئے یہ انسانی مقصود معین نہ حاصل ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ اُن جماعتوں کے تحت میں جو اپنے وجود کے لئے نظام پیشیں کی رہین منت تھیں تو خیر مسلمانوں کی روح، ان کا ذہن، ان کی قوت حیاتیہ اور ان کی فہم و فطرت ان تمام جاں فزا اور جاں بخش برومندیوں سے محروم رہ جاتی تھیں۔ جو گزشتہ تین چار صدیوں کے انسانی کاوش و کوشش کی حاصل محض تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روحانی، ذہنی اخلاقی، اور طبعی استعداد کا فطری سرچشمہ خس و خاشاک سے پُر ہو کر خشک ہوگیا اور جیسا کہ پیش آنا لازمی تھا مادی قوت اور فراغت بھی انحطاط پزیر ہو کر فنا ہوگئی۔

اس طور پر، حضرات، علت و معلول کا ایک طویل سلسلہ اُس اسلامی تنزل کی تعبیر و توضیح میں پیش کیا جا سکتا ہے جو تمام عالم میں رونما تھا۔ لیکن بایں ہمہ علم برداران کہن کو اس خسران مبین کا نہ احساس تھا اور نہ اس کی پہنائیوں اور ہمہ گیریوں کا کوئی اندازہ! وہ معتا لطات کی جنت میں تھے اُن کے اطمینان قلب اور عافیت خاطر کے لئے یہی بس کرتا تھا کہ وہ اپنے خیال میں اسلام اور اس کے مقاصد کے علم برداروں میں اپنے آپ کو تصور کرتے تھے۔ سر سید اُن لوگوں کو اس مہلک جمود سے بیدار کر کے حقائق سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ وہ ان کو اُن سنگین اور سنگلاخ حقیقتوں سے آشنا کرانا چاہتے تھے جن کا ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کا سامنا تھا۔ وہ نہایت اصرار کے ساتھ اس امر پر زور دیتے رہے تھے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ذمہ دار، ایک بڑی حد تک، ان کا وہ نظام تعلیمی تھا جس پر وہ پچھلی چند صدیوں سے کاربند رہے تھے اور وہ اُن علوم جدیدہ، فنون اور ادب کی ضرورت اور اہمیت پر اپنی پوری طاقت صرف کر رہے تھے جن کو نظام پیشین نے معزول و معطل کر دیا۔ پچھلے چند صدیوں سے چوں کہ ممالک مغرب ان علوم، فنون، اور ادبیات کی تحصیل میں پیش پیش تھے سر سید بھی مغربی تعلیم و تربیت کی تحصیل و ترویج پر زور دیتے تھے۔

رجعتِ قہقری

حضرات! جیسا کہ آپ محسوس کرتے ہوں گے۔ مغربی تعلیم و تربیت کا نام لے لینا ہی ایسے مسائل کو معرضِ بحث میں لانا ہے جو آج کل ملک میں ایک مخصوص حیثیت حاصل کر چکے ہیں، مغربی تعلیم اور علوم جدیدہ کے خلاف انتہائی بلند آہنگیوں سے کام لیا گیا ہے جس کا یہ نتیجہ ہے کہ ان رجعت انگیز قوتوں کو از سرِ نو تقویت حاصل ہو گئی ہے جو ہماری قوم کی تعلیمی تحریکوں کو اس سے قبل کافی مضرت پہنچا چکی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان کی حقیقی مفہوم اور مکمل نتائج کا اندازہ لگانے کے لئے ان کا بارِ دیگر جائزہ لیں اس لئے آپ کی اجازت سے اب میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اسلام میں تعلیم کی بالعموم اور ان حقائق و معارف کی بالخصوص کیا اہمیت اور وقعت ہے جو علوم طبیعی سے متعلق ہیں۔

حضرات! فی زمانِنا موضوعِ تعلیم پر اس شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ ایسی ایسی موشگافیاں کی گئی ہیں اور اس کی تشریح اور نوعیت پر اتنی کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں کہ میرے نزدیک ایک ایسے عامی کو جیسا کہ میں ہوں۔ ماہرینِ تعلیم کی ایسی مقتدر مجلس میں جس کے سامنے مجھے اظہارِ خیالات کی عزت نصیب ہے۔ یارائے زباں آوری نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر آپ کی اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ تعلیم کی نوعیت اور اس کے حدود کو اُس مقصدِ عین اور ان عقائدِ حیات سے متعین کرنا چاہیئے جن سے اس کرۂ ارض پر ہم اپنے آپ کو وابستہ کر چکے ہیں۔ اس مقصدِ عین کے متعلق مختلف لوگ، مختلف زمانوں میں۔ مختلف نظریات کے پابند رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا مقصدِ عین باری تعالےٰ کا انتہائی تقرب تھا۔ بعض اسے محض خدمتِ خلق سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کا نصب العین حیاتِ انفرادی کی تکمیل ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنی ہی کامرانیوں کو غایت الغایات خیال کرتے آئے ہیں۔ بعض لوگوں کی منزلِ مقصود معاشری ترقی ہے۔ دوسرے حب الوطنی اور مادرِ وطن کی خدمت اور پرستش کو عین مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں وقس علیٰ ہذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود اسلام نے نوعِ انسانی کا کیا مقصدِ عین قرار دیا ہے اسلام کی تعلیم و تربیت کے حدود اور اس کی نوعیت کا مدار اسی سوال کے جواب میں مضمر ہے۔

حضرات! میں نہایت صفائی کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ متذکرۂ صدر سوال میری بساطِ فہم و ادراک سے کہیں بلند ہے۔ لیکن اسلام باوجود ایک ایسا مذہب ہونے کے جو ایسے اہم عمیق اور دقیق مسائل پیش کرتا ہے۔ جہاں بہترین عقل و دماغ بھی عاجز رہ جاتے ہیں۔ جہاں تک اُس کے

مواجب خصوصی کا تعلق ہے ہر معمولی ذہانت کا انسان جو خلوص اور ایمان داری کے ساتھ حق اور حقیقت کا متلاشی ہو۔ ان کو سمجھ سکتا ہے۔ نظر برآں، آپ کی اجازت سے میں اُن مقاصد حیات اور مطمحات نظر کو آپ کے سامنے پیش کروں گا جو اسلام نے اپنے حلقہ بگوشوں اور نوع انسانی کے لئے وضع کئے ہیں۔

ایک مسلمان کا مقصدِ حیات

میرا خیال ہے کہ ایک مسلمان کا مقصد حیات دو اصول اساسی سے ماخوذ ہے عبدیت اور نیابت سب سے پہلے اسلام ہم سے اُس ذات حقیقی کے لئے جو لایزال، رحمٰن اور رحیم ہے ایک ایسے ایمان اور عقیدت کا مطالبہ کرتا ہے جس کی رو سے ہم اپنی خودی اور انانیت سے قطعاً دست بردار ہو کر اُسے ذات حقیقی کے حوالہ کر دیں جیسا کہ سورہ فاتحہ کے افتتاحی الفاظ سے ظاہر ہوگا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ — سب تعریف اللہ کے لئے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔

اُس خدا پر ایمان لا کر جو ہر اس چیز کا خالق ہے جو ہمارے حیطۂ عقل و فہم میں آ سکتی ہے۔ ہم کلیتہً ان تمام دعاوی سے دست بردار ہو جاتے ہیں جو ہماری 'خودی' یا انانیت، سے متعلق ہو سکتے ہیں اور اس طور پر ہم اس تعلق تامہ کا احساس کرتے ہیں جو ذات باری اور انسان میں ہو سکتا ہے۔ پس جہاں تک خالق اور مخلوق کا تعلق ہے ہم صرف اپنے ہی بے بس اور ہیچ ہونے کے معتقد نہیں ہو جاتے بلکہ موجودات عالم کے ہر شئے پر ہم یہی حکم لگاتے ہیں عقیدۂ عبدیت کا ظہور عملی وہ اخلاق اسلامی ہے جو ضبط و ایثار نفس، جذبات پر قدرت، مخلوق الٰہی کی خدمت، انکسار حقیقی اور سادہ زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ ایمان اور عقیدہ ہم کو تمام انسانی کمزوریوں سے عافیت میں رکھتا ہے جن کا تعلق اس خودی یا انانیت سے ہے جو انجام کار محض افراد ہی کو نہیں بلکہ زبردست اقوام اور جمعیتوں کو بھی قعر فنا و فراموشی تک پہنچا دیتی ہے۔

ایمان اور ارکان

لیکن محض ایمان اور عقیدہ، خواہ وہ کتنا ہی مخلصانہ اور نیاز کیشانہ کیوں نہ ہو، کافی نہیں۔ عمل صالح ہمارے ایمان کا لازمی ہے۔ اسلام میں عمل صالح کی حقیقت اور اہمیت کو کما حقہٗ سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے ہم کو انسان کے مقدرات اور رسالت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

جن کے ماتحت عالمِ وجود میں وہ اپنی ان قوتوں اور مواقع کو بروئے کار لانے کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ جن پر فطرت نے اسے قدرت دے رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں، میں قرآن کریم کی وہ آیتہ آپ کے سامنے پیش کروں جس میں خدا نے اس عالم میں انسان کے مقدرات کا تذکرہ فرشتوں سے کیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً — جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ... لِيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ ... — خدا کی وہ ذات ہے جس نے تمھیں روئے زمین کی نیابت و خلافت عطا کی ..... تاکہ تمھیں آزمائے ان چیزوں میں جو تمھیں عطا کی گئیں۔

یہ ہے اصول نیابت جس کی رو سے دنیا میں نائب اللہ بنا کر بھیجا گیا۔

اس طور پر، بربنائے عبدیت ان تمام خود پرستیوں اور خود نمائیوں کو پامال اور ان کا تنقیہ اور تزکیہ کر کے انسان کو اس ارض پر نائب اللہ کا منصب جلیلہ عطا کیا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ رہبری جس کے تصرّف سے وجود انسانی کی ان دو متضاد نوعیتوں کو ہم آمیز کیا جا سکتا ہے جن میں کشاکش رہتی ہے اور جن کا تناقض باہمی موجودہ دورِ حیات کی کشف و تعبیر میں ایک سنگ گراں ہے۔

اسوہ حسنہ

حضرات! میں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کہ یہ دونوں اصول محض افکار مجردہ نہیں بلکہ زندگی کے عمل پذیر مظاہرات منظر ہیں۔ چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ ہمارے رسول محترم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس ہی صرف ان اصول کی ایک زندہ مثال نہ تھی بلکہ ان کے جانشینوں کی زندگی بھی اس حقیقت کی ترجمان تھی۔ مثال کے طور پر میں خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذاتِ سامی کو پیش کرتا ہوں دنیا جانتی ہے کہ فاروق اعظم کے دورِ خلافت میں، اسلام عالم کے دور دراز حصص میں پھیل چکا تھا۔ اور وہ ایک زبردست سلطنت پر حکمراں تھے۔ اس طور پر خلیفۂ اعظم ان تمام ترغیب و تحریص کے مورد بن سکتے تھے جو نفس عبودیت کے منافی تھے۔ وہ ان تمام قوتوں اور مواقع پر قدرت رکھتے تھے جن سے وہ اپنے نفس کے طلب و تقاضے کو پورا کر سکتے تھے اور ہوا و حظ سے کامل طور پر لذت اندوز ہو سکتے تھے لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بحیثیت خلیفۂ اسلام انھیں جو قدرت اور منزلت حاصل ہو سکتی تھی کبھی اس سلسلہ میں بر سرِ کار لائی گئی؟ تاریخ

اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ وہ شخص جو اتنی زبردست سلطنت کا سالار اعظم تھا پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتا تھا۔ عام طور پر فرشِ خاک پر سوتا تھا۔ بیواؤں، بے نواؤں اور یتیموں کے لئے اپنی پیٹھ پر پانی لاد کر لے جاتا تھا۔ بحیثیت ایک خلیفہ کے اس کے طور طریق پر ایک پیرزال جواب طلب کر سکتی تھی اور جس وقت وہ تسخیر بیت المقدس کے لئے دروازہ شہر پر پہنچتا ہے تو اس کا غلام اونٹ پر سوار ہوتا ہے اور مہار خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے! یہ تصویر کا صرف ایک رخ تھا۔ یہ صرف مظہر عبدیت تھا۔ لیکن وہی شخص جو اپنے ذاتی معاملات میں اتنا بردبار اور بے نفس تھا جو بے نواؤں، بیواؤں اور یتیموں سے ایسے سلوک رکھتا تھا اور جو سوسائٹی کے ادنے ترین رکن کے اعتراضات عمومی پر اپنی گردن خم کر دیتا تھا۔ نائب اللہ کی حیثیت میں آکر بالکل بدل جاتا تھا۔ فرائض نیابت ادا کرتے وقت بردباری اور مسکینیت کے بجائے اس کی قوت اور قدرت نہایت شدت کے ساتھ کارفرما ہوتی تھی۔ بردبار اور بے نفس ہونے کی بجائے وہ اپنے اختیارات کو پورے توانائی کے ساتھ بر سرِ کار لاتا تھا اور اسلام اور اس کے شعائر کی حمایت میں ساری دنیا کو دعوتِ جنگ دینے پر مستعد ہو جاتا تھا۔ دنیاوی معاملات اور مادی مفاد کو حقیر اور ناقابل توجہ سمجھنے کے بجائے اس نے رعایا کے اغراض بیت المال اور مقبوضات کی نگہداشت میں شب و روز منہمک رہتا تھا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے مغرور سلاطین اور جنگ آزما قیصر روم اور خالد بھی اس شخص کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتے تھے اور ان کی گردنیں خم ہو جاتی تھیں۔ جس پر علی الاعلان اعتراض کرتے وقت ایک پیرزال بھی نہ جھجکتی تھی!

عبدیت و نیابت الٰہی

حضرات! یہ زندہ مثال تھی اُن ہر دو اصول کی حقیقی کارفرمائیوں کی جس نے ہمارے رسولِ پاک اور ان کے قریبی جانشینوں کے حیات اور عمل کو ایک شان امتیاز دے رکھی تھی اور جو ان کے زندگی کی روح رواں تھی۔ ان اصول کو بطریق احسن ذہن نشین کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ فی الحقیقت ایک ہی منزل مقصود کی رہبری کرتے ہیں یعنی مالک حقیقی کی تسبیح اور تحمید! یہ منزلت تمام و کمال اس طور پر حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی روحانی، ذہنی اخلاقی اور طبعی قوتوں کو کائنات حیات کے اشرف و اکمل حقائق کی تلاش و تفحص میں بر سرِ کار لا کر، صداقت، نکوئی اور زیبائی کے راز ہائے سربستہ دریافت اور متحقق کرلیں اور اس

طور پر خدائے توانا و برتر کے صنائع کی پاکی اور اس کے نام کی ستودگی کے معترف ہو جائیں۔ کلام پاک اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان کو یہ مخصوص اختیارات اور رعایات محض اس لئے عطا کی گئی ہیں کہ وہ صفحۂ ارض پر اپنے منصب نیابت الٰہی کا نقش بٹھا سکے۔ آپ ان آیات کریمہ پر غور فرمائیں:-

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ط

اور اسی نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو (ایک اعتبار سے) تمھارا تابع کر رکھا ہے اور (اسی طرح) ستارے (بھی) اس کے حکم سے (تمھارے) تابع فرمان ہیں جو لوگ عقل رکھتے ہیں اُن کے لئے ان چیزوں میں (قدرت خدا کی بہتیری ہی) نشانیاں ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ط

لوگو! اللہ وہ (قادر مطلق) ہے جس نے سمندر کو تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ خدا کے حکم سے ان میں جہاز چلیں اور تاکہ تم لوگ اس کے فضل (یعنی معاش) کو تلاش کرو اور تاکہ تم (اس کا) شکر کرو اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس نے اپنے کرم سے ان سب کو تمھارے کام میں لگا رکھا ہے۔ بے شک ان (باتوں) میں (قدرت خدا کی) بہتیری ہی نشانیاں ہیں مگر، ان (ہی) لوگوں کے لئے جو (غور، فکر کو کام میں لاتے ہیں۔

حضرات! اللہ جل شانہ نے انسان کو آسمان اور زمین کے موجودات پر قدرت دے کر جن مدارج اور مناصب پر فائز کیا ہے، ذرا آپ ان کا بنظر امعان مطالعہ فرمائیں۔ لیکن اختیارات کے ساتھ فرائض اور ذمہ داریاں بھی وابستہ ہیں۔ انسان تمام اختیارات کو کس طور پر کام میں لاتا ہے۔ اس کا اُسے جواب دہ بھی ہونا پڑے گا۔ جس عالم میں وہ نائب اللہ کی حیثیت سے مامور کیا گیا ہے اس کی ترقی اور بارآوری اس کے فرائض میں داخل ہے۔

انا جعلنا ما على الارض زينة لها لنبلوهم ايهم احسن عملا

جو (کچھ روئے) زمین پر ہے ہم نے اس کو (روئے) زمین کی رونق کا (موجب) بنایا ہے تاکہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں کون زیادہ نیکو کار ہے۔

وهو الذی جعلکم خلئف الارض .... ليبلوكم فيما اتكم

خدا کی وہ ذات ہے جس نے تمھیں روئے زمین کی نیابت (خلافت) عطا کی .... تاکہ تمھیں آزمائے ان چیزوں میں جو تمھیں عطا کی گئیں۔

اس طور پر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ انسان ان تمام حقوق اور اختیارات کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ جن کو خدا نے اسے اس لئے عطا کئے ہیں کہ وہ موجودات عالم کی ترقی اور تزئین میں انھیں کام میں لائے۔ موجودہ دور حیات ایک امتحان گاہ ہے جہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان عطیات الٰہی کو کس طور پر بر سر کار لاتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں ایک دوسری تنبیہ ہوتی ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ط

(لوگو) کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو (یونہی) بے کار پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم کو ہماری طرف پھر لوٹ کر آنا نہیں۔

اس طور پر نیابت الٰہی کے فرائض کو ادا کرنا اور موجودات عالم کی تزئین اور کامرانیوں کا ذمہ دار ہونا، از روئے اسلام، اس دنیا میں ہر انسان کا مقصد عین قرار دیا گیا ہے۔ عبدیت اور نیابت ہر دو اصول کی بنا پر، خواہ بحیثیت بندہ ہونے کے یا نائب اللہ، ایک مسلمان کی زندگی کا یہی مقصد ہونا چاہئے اس کرۂ ارض پر کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ مہتم بالشان یا برگزیدہ حیثیت متمت کی جا سکتی تھی؟ جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں، ہمارے مقصد حیات کے متعلق ان اسلامی عقاید سے بلند تر کوئی دوسرا نصب العین، عہد جدید یا عتیق میں نوع انسان کے سامنے نہیں پیش کیا جا سکا ہے۔ ہمارے مقصد حیات کی اس برگزیدگی کے ساتھ ساتھ اسلام میں علم و معرفت کو بھی ایک یگانہ حیثیت دی گئی ہے اسلام اس علم و معرفت کو انسان کا وہ امتیاز خصوصی سمجھتا ہے جس کے تصرف سے وہ دیگر مخلوقات ارضی سے اشرف و اکمل قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کلمات الٰہیہ کا پیش کرنا، میرے نزدیک ایک دوسری بصیرت ہے۔ جہاں خدائے قادر و توانا اور ملائکہ مقربین میں انسان کے نائب اللہ ہونے کے متعلق مکالمہ ہوا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ

(تو فرشتے) بولے کیا تو زمین میں ایسے شخص کو (نائب) بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرے اور بناتا ہے تو ہم کو بنا دے)، ہم تیری حمد و ثنا کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

انتخاب نائب اللہ کا اصل اصول

اس طور پر فرشتوں نے نیابت الٰہی کو انسان کے سپرد کئے جانے اور اس کے اپنے اوپر فوقیت

دیئے جانے پر اعتراض کیا ہے، وہ اپنے عبادت، تسبیح و تہلیل کی بنا پر ترجیح اور گزینش کے طلبگار تھے۔ لیکن کس قدر سبق آموز ہے۔ وہ بنا جس پر انتخاب خداوندی کا مدار تھا!

اس نے فرشتوں سے یہ نہیں کہا کہ اس نے اپنی نیابت کے لئے انسان کو اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہ سلطنت، دولت یا طاقت کا مالک ہے یا عبادت حق میں سبقت لے گیا ہے۔ جو کچھ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ اس بے عدیل اہمیت او حقیقت کو پیش کرتا ہے جو اسلام نے علم و معرفت میں مضمر رکھی ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ

اور آدم کو سب (چیزوں کے) نام بتا دیئے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے روبرو پیش کرکے فرمایا اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو تو ہم کو ان (چیزوں) کے نام بتاؤ۔ بولے تو پاک (ذات) ہے جو تو نے ہم کو بتا دیا ہے اس کے سوا ہم کو کچھ نہیں معلوم، تو ہی جاننے والا ہے مصلحت کا پہچاننے والا ہے۔ تب خدا نے (آدم کو) حکم دیا کہ اے آدم! تم فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دو جب آدم نے ان کو وہ نام بتائے

اس طور پر گویا انسان کو تمام موجودات کے علم و معرفت کی جو اہلیت تفویض کی گئی وہی اس کے اشرف المخلوقات ہونے اور استحقاق نیابت الٰہی کی اساس حقیقی ہے۔ وسیع ممالک کو زیر نگیں کر لینا بے پایاں خزائن پر قابض ہو جانا زبردست قوت اور اقتدار پر قادر ہونا کسی عبادت گاہ میں زاویہ نشین ہو جانا ایسی چیزیں نہیں ہیں جو انسان کو نیابت الٰہی کے منصب جلیلہ پر فائز کر سکیں۔

فرشتوں کا یہ استدلال کہ وہ تسبیح اور تحمید میں انسان سے برگزیدہ تھے۔ انسان کی اس فضیلت کے مقابلہ میں ہیچ تھا جس کے تصرف سے اُسے علم و معرفت پر قدرت تھی۔ اس لئے اگر انسان اس منصب کو حاصل کرنا اور قایم رکھنا چاہتا ہے جو اسے تفویض کیا جا چکا ہے تو پھر اسے علم و معرفت کی ناگزیر فضیلت حاصل کرنا لازمی ہے۔ آپ براہ کرم اس حقیقت پر غور فرمائیں کہ انسان کے لئے علم و معرفت کی کوئی مخصوص نوعیت متعین نہیں کی گئی ہے۔ آیت کریمہ میں جو لفظ کلہا آیا ہے وہ ہر علم و معرفت پر محیط ہے۔ اس عالم میں جو فرائض انسان پر عاید کئے گئے ہیں وہ جتنے دشوار اور مہتم بالشان ہیں اسی نسبت سے اس کے لئے ذرائع اور وسائل قدرت بھی پیدا کئے گئے ہیں۔ خدا نے اس خیال سے کہ انسان اپنے فریضۂ رسالت سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اول

اُن تمام اشیاء کو جو ارض و سما میں موجود ہیں اُس کا تابع فرمان بنایا اور اس کے بعد ہر شئے کی کنہ و ماہیت دریافت کرنے کے لئے اس میں علم و معرفت کی استعداد و دیعت کردی۔ اس طور پر تمام عالم ہر مسلمان متلاشی حقیقت کے اندازہ پیمائی، تفتیش اور تجسس کا جولانگاہ بنا دیا گیا ہے اور صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے رسالت اسلام انصرام کو پہنچ سکتی ہے!

حضرات! آئیے ہم چند قدم آگے بڑھ کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رسالت کا اندازہ لگائیں جو ہمارے عقیدے کی رو سے نوع انسانی کے بزرگ ترین معلم تھے۔ ارشادات نبوی تمام معلمان انسانی کے لئے محض بربنائے عقیدہ واجب التسلیم نہ تھے بلکہ جدید ترین افکار و معیار کی رو سے بھی ان کا شمار دنیا کے بہترین نظام تعلیم میں ہوتا ہے۔ رسالت مآبؐ کے طریقۂ تعلیم پر کلام پاک یوں شہادت دیتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ بَعَثَ	اللہ نے مسلمانوں پر بڑا ہی فضل کیا کہ ان میں انھیں میں کا
فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ اور
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ	(ان کو کفر و شرک کی گندگی سے) پاک کرتا اور کتاب الٰہی (یعنی قرآن)
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	اور دانائی کی باتوں کی ان کو تعلیم دیتا ہے اور نہ ان پیغمبر کے آنے
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝	سے) پہلے تو یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

مسئلہ تعلیم کے جدید اور وسیع ترین مفہوم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے تمام عناصر اساسی ہمارے رسول اقدس صلعم کے نظام تعلیم میں مضمر ہیں۔ ذہن و دماغ کو محض چند ہدایات یا کتابی مضامین سے پر کر لینا تعلیم کا مقصد عین نہیں ہے۔ اس کی اہمیت اس سے کہیں بلند ہے۔ ایک انگریزی مصنف کا قول ہے "تعلیم ایک وسیلہ ہے جس سے جسم، ذہن اور جودت کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہ محض ایک طرح کی سرمایہ ہی نہیں ہے اور کسی چیز کو محض اندر رکھ لینے سے تو اس کا مفہوم کہیں ارفع ہے۔ ... یہ دونوں کا مجموعہ ہے جس کے تصرف سے تعلیم یافتہ شخص یوماً فیوماً تزکیۂ ظاہر و باطن حاصل کرتا ہے اور وہ ان فرائض سے آشنا ہو جاتا ہے جس کے آشنا ہونے کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جو اپنے فریضۂ منصبی پر، خواہ وہ خندق کا کھودنا یا کسی نظم کا ترتیب دینا ہو۔ کما ینبغی ایمان بھی رکھتا ہے اور اسے انصرام کو بھی پہنچاتا ہے"۔

حضرات! کیا اُن اصول، اقدام اور مدارج کو ذہن نشین کر لینا جن کی طرف ہمارے رسول پاکؐ کا نظام تعلیم ہماری رہ نمائی کرتا ہے۔ ہمارے لئے ایک زبردست درس بصیرت نہیں ہے سب سے

پہلے ارشاد ہوتا ہے:-

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ — خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے

یعنی مظاہر خداوندی کی طرف مائل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے۔ رسول پاکؐ نے نوع انسانی کی توجہ صحیفۂ فطرت کی طرف منعطف کر کے اسے اس عالم کے حقائق سے آشنا کر دیا۔ نوع بشر کی توجہ کو نوامیس فطرت اور اس کے مظاہر کی طرف مبذول کرا کے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی دماغ کی کاوشوں اور مطالعے کے لئے ایک وسیع اور بے پایاں جولانگاہ پیش کر دیا ہے۔ چونکہ دماغ انسانی ہر قسم کی ترقی اور توسیع کا ناگزیر ذریعہ ہے اس لئے اسے قیود اور پابندیوں سے نجات دلانا تعلیم انسانی کا اولین قدم ہونا چاہیئے۔ اور مطالعہ فطرت جو عالم میں، انسانی دماغ کی توسیع اور تربیت کا بہترین وسیلہ سمجھا جاتا ہے اس مقصد کے حصول کا سب سے عمدہ طریقہ ہے۔

دماغی آزادی اور توسیع کے بعد تزکیہ نفس کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ فی زمانہ یہ امر مسلمہ ہے کہ تعمیر و تشکیل سیرت صحیح تعلیم کا جزو عین ہے۔ لیکن اسلام کے وسیع مفہوم میں تزکیہ نفس کے منازل طے کرنا۔ تعمیر و تشکیل سیرت سے کہیں ارفع و افضل ہے کیونکہ ''پاکی'' کا اسلامی معیار ''تعمیر و تشکیل سیرت'' سے کہیں بلند ہے۔

کتاب و حکمت

جب دماغ آزاد ہو چکا اور کرکٹر نے مستقل پختگی اختیار کر لی تو ہم تیسری منزل میں قدم رکھتے ہیں یعنی یعلمھم الکتاب لیکن محض علم کی فراہمی کسی مصرف کی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے زندگی کے امور مہمات پر منطبق نہ کیا جائے اور اپنے ہم نوع اور بقیہ کائنات کے ساتھ انسان کے تعلقات پر روشنی ڈالنے میں اس سے مدد نہ لی جائے یہ مقصد ہے والحکمۃ کا۔ چنانچہ خواہ آپ اس مہتم بالشان مقصد اور مطمح نظر پر غور کریں جو اسلام، نائب اللہ کی حیثیت میں انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یا تعلیم کے نظری اور عملی پہلوؤں کو لیں، یہاں تک ارشادات نبوی ان کا آئینہ ہے۔ تعلیم کا اسلامی نصب العین دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے، ان تمام نظریات اور عملیات سے مکمل اور ہمہ گیر تر ہے جن کا میں اب تک کسی کتاب میں جو اس موضوع پر تصنیف ہو چکی ہے مطالعہ کر سکا ہوں۔

حضرات! نفس مضمون سے اتنا طویل انحراف کرنے کے بعد، اب میں اپنی تقریر کے

اس حصے کی طرف رجوع کرتا ہوں جہاں میں نے سرسید اور قوم کے علم بردار ان نظام پیشیں کے نظریات تعلیم کے اختلاف کا تذکرہ کیا تھا جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں جانبین احکام اسلام کو اپنے اپنے نقطۂ خیال کا مؤید تصور کرتے رہے لیکن اُس شرح و تفصیل کے ماتحت جو میں نے پیش کی ہے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ ان میں کون حق بجانب تھا۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اسلامی علم و حکمت کو محض چند ایسے روایتی مباحث تک محدود کر دیا ہے جن کا تعلق سراسر عقیدۂ دینیات اور متروک الایام دفاتر نصاب سے ہے اور جنھوں نے علوم فطری اور فنون اور ادبیات جدیدہ کے باب یکسر مسدود کر دیئے ہیں۔ اُنھوں نے اسلام کی حقیقی رسالت اور نائب اللہ ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اور ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ اس امر کا ثبوت کہ اُنھوں نے فی الواقع ایسا کیا ہے اُس ناگفتہ بہ حالت اور اُس الم ناک تغیر سے ملے گا جو عالم اسلام اور یورپ کے باہمی حالتوں میں پچھلی چند صدیوں سے رونما رہا ہے۔

مسلمانوں کی علمی ترقیات

حضرات! عالم اسلامی کی حالت جب سرسید اس سے دو بدو ہوئے، ان حالات سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی جو یورپ میں قرونِ وسطےٰ میں پائے جاتے تھے یہ تاریخ کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ چوتھی صدی عیسوی سے بارھویں صدی تک تمام یورپ ان کاتھولیکی ارباب کلیسا کے زیر اقتدار رہا۔ جن کی مذہبی عصبیت جنون کے حدود تک پہنچ چکی تھی اور جن کا صحیفہ شریعت یکسر رسمیات اور عصبیات کا حامل تھا اور جس نے کم و بیش "ہر اُس راستے کو مسدود کر دیا تھا جس سے علم انسانیت یا تہذیب کی روشنی داخل ہو سکتی تھی" یہ وقت تھا جب یورپ نہایت راسخ الاعتقادی کے ساتھ زمین کے چپٹی (مسطح) ہونے پر یقین رکھتا تھا اس وقت جب کہ یورپ میں اس قدر اخلاقی اور دماغی انحطاط تھا اسلام ترقی کا علم بردار تھا۔

حضرات! اُنھوں نے علم مثلثات کروی کی اختراع کی اور جغرافیہ کی تعلیم کروں سے دیتے تھے۔ وہ علوم طبعی کا مطالعہ کرتے تھے جس کی بنیاد قیاسات پر نہیں بلکہ مشاہدہ اور تجربات پر ہوتی تھی چنانچہ اس طور پر اُنھوں نے علم الکیمیا دریافت کیا۔ اور نباتات، علم طبقات الارض، طب اور دیگر علوم میں گراں قدر اضافے کئے۔ بقول ڈریپر:

یورپ میں پہلے میڈیکل کالج کی بنیاد سلیرس کے سارا سینوں (عربوں) نے

اٹلی میں رکھی تھی۔ اولین رصدگاہ انھوں نے ہی سیدیلی (اسپین) میں قایم کی تھی
عربی ماہران ہیئت نے "آلات ہیئت کی وضع اور تکمیل میں انتہائے شغف کا
ثبوت دیا ہے۔ ساعت پیمائی کے مختلف آلات وضع کیے اور اس مقصد کے
لئے سب سے پہلے انھیں لوگوں نے معلقہ (پنڈولم) کا استعمال دریافت کیا
انھوں نے علم الکیمیا کی صرف ابتدا ہی نہ کی بلکہ گندھک اور شورہ کے تیزاب
اور الکوہل ایسے معیار الاجزا دریافت کئے۔ علم جر الاثقال میں انھوں نے گرنے
والے اجسام کے اصول اور قوانین کا پتا لگایا۔ علم توازن السوائل فی الحوائد میں
انھوں نے سب سے پہلے اجسام کے ثقل ذاتی کی ایک فہرست مرتب کی عینیات
(علم النور والبصریات) میں سب سے پہلے انھوں نے یونانیوں کے اس نظریہ کی
تصحیح کی کہ شعاعِ نور آنکھ سے نکل کر اس چیز پر پڑتی ہے جو دیکھی جاتی ہے۔ بجائے
اس کے انھوں نے اس اصول کو ثابت کیا کہ جو چیز دیکھی جاتی ہے اس سے شعاع
نکل کر آنکھوں میں پہنچتی ہے۔ وہ انعکاسِ نور کے نظریہ کو خوب ذہن نشین کر چکے
تھے اس معرکۃ الآرا انکشاف کا کہ شعاعِ نور مقوّس ہو کر فضائے بسیط سے گزرتی
ہے۔ ذمہ دار الحسن تھا جس نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ ہم چاند اور سورج
کو قبل طلوع اور بعد غروب دیکھتے ہیں"

سائنس کی اس ہمہ گیر تگ و تاز کے نتائج جو زراعت اور آب پاشی کے بہترین ذرائع کھاد
کا ہنرمندانہ طریقۂ استعمال، مویشیوں کی اچھی نسل حاصل کرنے کے وسائل، زراعت اور رفاہت
کے لئے دانشمندانہ قوانین کا وضع اور نفاذ، چاول، نیلشکر اور قہوہ کی کاشت میں ظاہر ہو رہے
تھے۔ ہر طرف نمایاں تھے، ریشم پارچہ جات اُون قرطبہ اور مراکش کے بنے ہوئے چمڑے اور
کاغذ، کان کندنی اور دیگر وہ طریقے اور ترکیبیں جن سے مختلف فلزات نکالی اور ڈھالی جاتی تھیں۔
ان سب کی گرم بازاری سائنس کی ترویج اور ترقی کی ترجمان تھی۔

حضرات! میں نے صرف علوم طبیعی اور میکانکی فنون میں مسلمانوں کے کارناموں کا تذکرہ
کیا ہے کیوں کہ علوم انسانی کی یہ وہ شاخیں ہیں جس میں وہ آج کل خاص طور پر درماندہ اور ناقص
ہیں۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ تقریباً آٹھ یا نو صدیوں تک اسلامی ممالک اپنے ہم عصر اقوام پر
جہاں تک علوم طبعی کے اُن نظری اور عملی پہلوؤں سے واقفیت کا سوال ہے جو آج یورپ

اور امریکہ میں تمام صنعتی اور اقتصادی نشو ونمو کی سنگ بنیاد ہیں سبقت رکھتے تھے۔

نئی بساط

لیکن اب یہ سب کچھ کلیتاً تبدیل ہو چکا ہے اور گزشتہ تین چار صدیوں کے دوران میں حالات بالکل منقلب ہو گئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب کہ اسلامی مدنیت کے حیات پرور فیضان نے یورپ کو کورانہ اعتقادیات اور عصبیت زا دینیات سے نجات دلائی تھی اور "آزادانہ تحقیق اور صاف بیانی" کی روح پھونکی تھی۔ قوانین فطرت کے مطالعہ اور مشاہدہ کی دعوت دی تھی اور اسی کا تصرف کہ تیرھویں صدی میں روجر بیکن بے اختیار بول اٹھا تھا۔

"فرسودہ معتقدات اور استنادیات سے گلو خلاصی حاصل کرو اور صحیفۂ کائنات کی طرف رُخ کرو۔"

یورپ نے اس پر صدائے لبیک بلند کی اور بساط کائنات کی طرف رُخ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند صدیوں میں اسے موجودہ ثروت اور کامرانی حاصل ہو گئی بخلاف ازیں، اسلامی ممالک اور جماعتوں نے فطرت کی طرف سے منہ موڑا۔ اس کے قوانین سے ناآشنا ہو گئے۔ زندگی کے حقائق کو فراموش کیا اور ایک خود آفریدہ خیالی دنیا میں رہنے لگے۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہونے والا تھا وہ آج انتہائی المناکیوں کے ساتھ ہمارے پیش نظر ہے۔

حضرات! جب مسلمانوں کی تعداد اس زمانہ کی نسبت بہت کم تھی تو انھوں نے اقصائے عالم میں زندگی، روشنی اور تعلیم پھیلائی لیکن کیا آپ اب بتا سکتے ہیں کہ ہمارے بیس کروڑ ہم مذہب نفوس جو اس وقت کرۂ ارض کے مختلف حصص میں آباد ہیں اس بارہ میں کیا کیا ہے؟ خواہ وہ عالم خیال میں ہو، خواہ دنیائے عمل میں، اس زمانہ میں انسانیت کی ترقی میں انھوں نے کیا حصہ لیا ہے؟ کیا ہم پچھلے تین چار صدیوں کے دوران میں کسی ایک مسلمان فلسفی، ریاضی داں، منجم، سائنٹسٹ، عالم طبیعات، مورخ، سیاح، مخترع، یا موجد کا نام پیش کر سکتے ہیں جو علم وحکمت میں یورپ کے بہترین عقل ودماغ کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہو؟ کیا اس طویل مدت میں کسی اسلامی ملک یا جماعت نے فطرت اور اس کے قوانین پر اقتدار حاصل کرنے میں انسان کے ذرائع اور وسائل میں اضافہ کیا ہے؟ المختصر کیا ہم نے انسان کے نائب اللہ ہونے کا ثبوت دیا؟

برخلاف اس کے آپ ملاحظہ فرمائیں۔ اس ضمن میں یورپ نے کیا کیا ہے۔ تعلیمات قرآنی کی

بموجب اور سب چیزوں کی طرح آب، باد، برق، قوت مادہ وغیرہ بھی انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ دخانی انجن، تار برقی، طیارے اور دیگر میکانکی آلات کے اختراع سے یورپ نے اس اسلامی تعلیم کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ جہاں تک پچھلی چند صدیوں کے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان تعالیم اور تعلیمات اسلامی کو نظر انداز کر کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو نہ صرف نائب اللہ کے حق اور منصب کا نااہل ثابت کر دیا بلکہ ایسے نتائج کے ذمہ دار ہوئے ہیں جنھوں نے آج ان کو دنیا کی پست اور درماندہ ترین اقوام کے زمرے میں شامل کر دیا ہے۔ خلاف ازیں اقوام یورپ نے اسلامی تعلیمات کی روح کا اتباع کر کے نائب اللہ کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے جس پر ان کی موجودہ قدرت اور سطوت گواہ ہے۔

تعلیمی پستی کا اثر اسلامی ممالک پر

حضرات! اب میں چند اُن مرئی نتائج کا ذکر کروں گا جو علوم اور صنائع جدیدہ سے غفلت برتنے کی وجہ سے اسلامی ممالک میں راہ پا گئے ہیں۔ سب سے پہلے اسی کو لے لیجئے کہ دنیائے اسلام کا کس قدر حصہ علوم اور فنون جدیدہ سے بے نیاز ہو کر اغیار کے زیر تصرف آ گیا ہے اور کیا کوئی اسلامی ملک ایسا ہے جس کا آزادانہ وجود اسی وجہ سے معرض خطر میں نہیں ہے؟ مسئلہ کے اس اہم پہلو سے قطع نظر، کیا کوئی ایسا اسلامی ملک بھی نظر آتا ہے جو اپنی معمولی ضروریات کے لئے یورپ کا دست نگر نہیں ہے۔ ٹرکی کو لیجئے وہ اپنی بحری اور جنگی ضرورتوں کے مطابق اسلحات نہیں تیار کر سکتا۔ اس کی ریلیں، تار برقی، ٹیلیفون اور بینک وغیرہ کا انتظام و اہتمام یوروپین ہاتھوں میں ہے۔ تعلیم گاہوں کے لئے ڈیری یا بھلی جیسی بھی ہیں، آلات اور ادویات یورپ سے منگائی جاتی ہیں۔ ایران کی حالت اس سے بھی ابتر ہے اور یہی کیفیت افغانستان کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ افغانستان کے موجودہ روشن خیال فرماں روا نے دو سو سے زیادہ نوجوان افغانوں کو تعلیم اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجا ہے۔ ان کا یہ فعل بدرجۂ اتم عاقلانہ اور مدبرانہ ہے۔ لیکن اگر پچاس سال قبل اس طرف توجہ کی جاتی تو عالم اسلام کی حالت اس سے بدرجہا قوی اور مستحکم ہوتی جتنی ہم آج کل دیکھ رہے ہیں سر سید نے تلقین تعلیم، جاپان کی تعمیری اور تجدیدی فرد عمل مرتب کرنے سے دس سال پیشتر (سنہ ۱۸۶۰ء میں) شروع کی۔ جاپان نے اس پچاس سال میں جو کچھ کر دکھایا یقیناً دوسری ایشیائی اقوام بھی اُس کے لئے کوشش کر سکتے ہیں۔ قائد اعظم

غازی مصطفے کمال پاشا، جو ایک مہتم بالشان اہل سیف ہونے کے علاوہ ٹرکی کے معظم ترین مدبر کی حیثیت رکھتے ہیں اپنے ملک کی اقتصادی اور مالی حالت سنوارنے کے لئے خاص طور پر مستعد ہیں۔ لیکن انھیں بھی یہ کام ایک امریکن پر چھوڑنا پڑا۔ ہز مجسٹی امیر کابل کو بھی جو افغانستان کے اعلٰے بیدار مغز حکمرانوں میں سے ہیں اپنی اقتصادی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فرنچ اور اطالوی اختصاصیوں کی ضرورت پیش آئی۔ ایران ایک مدت سے بیرونی ممالک کے پرحرص و آز سرمایہ داروں اور شاہنشاہیت پسندوں کی رقیبانہ تگ و تاز کی جولان گاہ بنا ہوا ہے۔ ایران اور ٹرکی دونوں کے قبضہ میں خدائے تعالٰے کے بیش بہا انعام مثلاً تیل کی کانیں اور دیگر جماداتی خزانے صدیوں تک رہے لیکن جہاں تک اُن سے فائدہ اُٹھانے کا تعلق ہے ان ممالک کی بصارت اور سماعت قطعاً معذور رہی۔ یہ عزت اور خوش نصیبی انگریزوں اور امریکن اختصاصیوں کے لئے وقف تھی کہ وہ ہزارہا میل کا سفر طے کر کے آئے اور خدا کی ان برکتوں کو بے نقاب کر کے اُن سے مستفید ہوئے۔ ہم اپنے نامور قومی شاعر، اقبالؔ کا ترانہ انتہائی جوش اور ولولہ سے پڑھتے ہیں اور گاتے ہیں:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور اپنی معصومانہ بے خبریوں اور خوش فہمیوں سے اس حقیقت کو یک قلم فراموش کر جاتے ہیں کہ ہم ایسے زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں ہم ان مختصر مملکتوں کو بھی جو ہمارے قبضے میں رہ گئی ہیں، مکمل معنوں میں اپنا گھر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کی دولت غیر ممالک کے حریص سرمایہ دار کھینچے لئے جا رہے ہیں اور ترقی کے ایسے ناگزیر وسائل مثلاً ریلیں اور تار وغیرہ اغیار کے ہاتھوں میں ہیں۔ مجھے اس کا کامل احساس ہے کہ ہماری قوم کے قلوب گرمانے کے لئے اس قسم کے پرہیجان اور ولولہ انگیز ترانوں کی اشد ضرورت ہے لیکن جب تک ان کے پہلو بہ پہلو ہم یہ کوشش نہ کریں کہ وہ واقعات اور حقائق جن سے ہم کو سابقہ ہے۔ ہماری آرزوؤں اور نصب العین سے متوازی اور ہم آہنگ ہوں، اس قسم کے عارضی ہیجانات کا نتیجہ بجز اس کے کہ ہمارے مغالطات استوار اور محکم تر ہو جائیں، کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

ہمارے دماغی سرمایہ کا اتلاف

حضرات! ہم اغیار کو نہ صرف اپنی مادی دولت سے متمتع ہونے کا موقع دیتے ہیں بلکہ ہم وہ

دماغی سرمایہ بھی کم و بیش تلف کر چکے ہیں جو ہمارے اسلاف نے وراثتہً ہمارے لئے چھوڑا تھا کتابیں اور صنعت کے وہ نادر کارنامے جو گزشتہ مسلمانوں کی دماغی اور بدنی کاوشوں کے مظہر تھے وہ آپ کو دہلی، کابل، طہران، قسطنطنیہ یا قاہرہ میں نہیں ملیں گے بلکہ لندن، پیرس، برلن، نیویارک اور واشنگٹن وغیرہ میں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علمائے مستشرقین لندن، پیرس، برلن اور دیگر مغربی ممالک میں رہ کر عالم اسلامی کے رہنے والوں سے زیادہ ہمارے گزشتہ ذہنی اور مدنی کارناموں سے باخبر ہیں۔ یہی لاعلمی اور بے توجہی ہے جس نے ہم کو خدا کی نعمتوں اور اپنی مایۂ ناز وراثت سے محروم کر دیا ہے۔ اسی لاعلمی اور بے اعتنائی کے بارے میں ذیل کی آیتیں نازل ہوئی تھیں۔

(۱) وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ

(۲) وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ

(۳) أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا

کیا اس سے زیادہ واضح تہدید ممکن ہو سکتی ہے؟ اور کیا یہ فی الوقت تمام دنیا کے مسلمانوں پر صادق نہیں آتی؟ علوم طبیعی اور میکانکی صنائع سے لاعلمی اور انسانی وقوف اور مدنیت کی طرف سے بے توجہی کے باعث نہ خدائے تعالےٰ کے اشاروں اور کنایوں تک ان کی نظر پہنچتی ہے اور نہ وہ ان نعمتوں اور برکتوں کو بے نقاب کر سکتے ہیں جو قدرتاً صرف ان لوگوں کے لئے وقف ہیں جو واقعتاً اور معناً قرآن پاک کی تعلیمات پر عامل ہیں۔ میرے نزدیک اسلام کے اساسی اصول قوانین قدرت کی مانند، خواہ وہ وساطت جس سے وہ عمل میں لائے جائیں کچھ ہی کیوں نہ ہو ناقابل مزاحمت اور اپنے نتائج میں اٹل ہیں۔ جیسا کہ کلام پاک میں وارد ہے۔

فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا

مسلمانوں کے لئے "صراط باری" قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سیرت نبوی کے ذریعہ سے واضح طور پر روشن کر دی گئی ہے جس کے بموجب ہمارا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ نائب اللہ کے فرائض بوجوہ احسن ادا کئے جائیں اور یہ ہم صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ علوم ارضی و سماوی حاصل کریں اور چوں کہ فطری طبعی، انسان کی تحقیق و انکشاف اور اس کے تگ و تاز کے لئے سب سے وسیع میدان پیش کرتی ہے۔ اس لئے علوم طبعی کا حاصل کرنا ہی دنیا میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر زمانہ میں صرف وہی اقوام تہذیب

اور ترقی کی علمبردار ہی ہیں جن کو فطرت اور اس کے نوامیس پر سب سے زیادہ قدرت تھی مغربی علوم ادبیات، اور صنائع کے روشن ترین پہلوؤں کا راز بھی اسی میں مضمر ہے اسی وجہ سے سرسیّد کی وضع کردہ فرد تعلیم میں یوروپین علوم ادبیات اور صنائع کے مطالعہ کو اس قدر اہمیت دی گئی تھی سرسید ہندوستان کے دماغ کو آزادی اور وسعت دینے اور اپنے ملّت کو خارجی حکم و امتناع کی غلامی سے رہا کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ مغربی تمدّن سے گہرا اور قریبی رابطہ پیدا کیا جائے ان کے نزدیک جس طرح حجازی تمدّن نے ایک زمانہ میں یورپ کے دماغ کو جہالت اور توہمات سے نجات دلائی تھی، اسی طرح وقت آگیا تھا کہ یوروپین تمدّن اس احسانِ عظیم سے سبک دوش ہو اور ہندوستان اور ایشیا کے دماغی آزادی کا معین ہو۔

مغربیت کی ترویج

حضرات! مغربی تہذیب و تمدّن کے تذکرہ کے ساتھ ہی میں یہ بے تامل بتادینا چاہتا ہوں کہ میں خارجی خیالات، طورطریقوں، رسوم اور انسٹی ٹیوشنوں کی یک قلم یا بلا امتیاز ترویج کا حامی و موئید نہیں ہوں کیوں کہ اس طرح کسی قوم کا احیا نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت اس ملک کے اندر اور خصوصاً مسلمانوں میں بعض قسم کے انگریزی اصول و معاشرت کے اختیار کئے جانے سے بہت کچھ نقصان پہنچ چکا ہے اس کے متعلق میں آئندہ چند الفاظ عرض کروں گا لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جو ان اصحاب کی خاص توجّہ کا محتاج ہے جو مغربی تہذیب و تمدن کو بالکل ہی چھوڑ دینا چاہتے یا مضر خیال کرتے ہیں۔ انسانی علم و ارتقا کی افزائش میں جہاں تک ان کا تعلق تازہ ترین ترقی و مراحل سے ہے جائز طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تہذیب و شائستگی تنہا مغرب کی پیداوار یا ملک ہے۔ مختلف زمانوں میں مختلف قوموں نے مشعل نور و علم روشن کی ہے۔ اور یہی حال اب بھی ہے کہ مغربی قومیں گویا انسانی ترقی کا پیش خیمہ ہیں لیکن ان مغربی اقوام نے اُن بنیادوں کو بلند کیا ہے اور اس عمارت میں اضافہ کیا ہے جو گزشتہ زمانہ میں قائم و مرتفع کی گئی تھیں اور جو کل اقوام ماضیہ عرب، رومی، یونانی، ہندوستانی وغیرہ کے ترکہ میں اور ان سب کے علم و تجربہ کے ذخیرہ میں حصہ ہے۔ جو یوروپین تہذیب و شائستگی کی بنیاد ہے۔ بلاشبہ جغرافی مواقع، آب و ہوا کے اختلاف اور تاریخی اسباب کے نتائج کو ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا۔ لیکن کوئی شخص ان حالات و خصوصیات کو کیوں کر نظر انداز کرسکتا ہے جو مشترکہ کل نوع انسان کی فراست، قوت اور ضرورت کا قدرتی

ظہور اور نتیجہ ہیں۔

اپنے بیان کو میں کسی قدر اور واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کیا علم و تمدن کی قوم و ملک کے لحاظ سے حد بندی کر کے اُسے اضافتاً مغربی یا مشرقی قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا ہم اپنے نظام شمسی اور دیگر اجرام سماویہ کے علم کو مغربی یا مشرقی کہنے میں حق بجانب ہوں گے؟ کیا مغربی قانون کشش ثقل مشرقی سے کچھ مختلف ہے؟ کیا وقت، مقام اور اعداد کے قواعد و قوانین کسی خاص قوم یا ملک سے مخصوص ہیں؟ کیا حرارت، روشنی، قوت، برق وغیرہ اس قوانین کے تحت میں نہیں ہیں جو مغرب و مشرق میں یکساں ہیں؟ کیا عام سیاسی اصول و نتائج جو سیاسی تاریخ و تجربہ سے انگلستان میں استخراج کئے گئے ہیں۔ وہ مغرب کی طرح ایشیا میں منطبق و مفید نہیں ہو سکتے؟ کیا برک جیسا بڑا صاحب فکر انسانی آزادی اور حقوق و فرائض کے معاملہ میں ہمیں سبق نہیں دے سکتا؟ کیا شیکسپیر، جانسن اور ڈکنس اسی طرح ہماری دماغی تربیت نہیں کر سکتے جیسے کہ ایشیائی سعدی، عمر خیام جیسے مصنف اور الف لیلہ جیسی کتابیں اہل مغرب کی کرتی ہیں؟ اگر ہم امداد باہمی حرفتی و تجارتی کاروبار مالی استحکام، اور قومی اتحاد کے عملی طریقے سیکھنے چاہتے ہیں تو اس کے نمونہ اور مثال کے لئے کہاں جائیں۔ حتیٰ کہ اگر ہم خود اپنے ماضی کا مطالعہ کر کے اپنے بھولے ہوئے تمدن کو زندہ کرنا چاہیں تو بھی لندن پیرس اور برلن کے علمی مرکز اور وہاں کے علما اس سے بدرجہا زیادہ ہماری مدد اور رہبری کر سکتے ہیں جو ہمیں مشرق میں کہیں بھی نصیب نہیں ہو سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر ہم اسی مضمون کی جس سے اس وقت ہمیں براہ راست علاقہ ہے (یعنی تعلیم اس کی نوعیت حد اور تازہ ترین ترقی کا حال معلوم کرنا چاہیں تو کیا نمونہ اور اطلاع کے لئے ہمیں مغرب کی طرف متوجہ ہونا نہیں پڑے گا؟

غرض اسی طرح مغربی تہذیب و تمدن کو یک قلم اور بلا وجہ مطعون کرنے سے مغرب کا تو کوئی نقصان ہو نہیں سکتا۔ البتہ خود اس ملک کی تعلیم میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ عقل اور مفید خود غرضی کی فتح کی علامت ہے کہ افغانستان جیسا قدامت پرست ملک اپنی قومی ضروریات کے مطابق یورپ سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی تعلیم و تربیت کے لئے یورپ اور امریکہ کو جانے والے طالب علموں کی تعداد روز افزوں ہے۔

باہر جانے والے ہندوستانی طلبہ

حضرات! میری مندرجہ بالا تقریر سے ان ہندوستانی طلبہ کا سوال پیدا ہوتا ہے جو تعلیم

کے لئے باہر جاتے ہیں اور یہ سوال اس ملک کی پبلک کے لئے بہت خاص توجہ کا محتاج ہے۔

غالباً آپ لوگ واقف ہوں گے کہ گزشتہ سال لٹن کمیٹی نے جس کا میں بھی ممبر تھا اس مسئلہ کی تحقیقات کی اور رپورٹ دی تھی۔ مختصر طور پر میں آپ کو وہ خاص مقاصد بتا دینے چاہتا ہوں جن کی رو سے ہم نے اس نہایت اہم مسئلہ کو لیا اور اس پر غور کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس امر میں کامیابی دو شرطوں پر منحصر ہے۔

۱۔ یہ کہ صرف ایسے طالب علم باہر جائیں جو وہاں کے مواقع اور آسانیوں سے بیش از بیش مستفید ہونے کے اہل اور لائق ہیں۔

۲۔ یہ کہ مناسب و معقول انتظام ہو۔

(الف) رہنے کی موزوں جگہ کا

(ب) ان کے خاص ضروریات کے لحاظ سے بہترین تعلیم گاہ کا

(ج) ایسے کارخانوں میں ان کا داخلہ جو ان کو واقعی عملی تعلیم دے سکیں۔

(د) ان کو تعلیمی، اجتماعی، علمی، ادبی، اقتصادی، تجارتی، حرفتی اور خادم نوع انسان تحریکوں اور انجمنوں سے آشنا کرنا۔

(ہ) علم و تمدن کے مختلف اہم مرکزوں میں جو نامور و ممتاز اصحاب ہیں ان سے ان کو متعارف کرنا۔

ہماری کمیٹی نے برطانیہ عظمیٰ میں کام شروع کیا اور جتنے معاملات کی وہاں تحقیق کی ضرورت تھی اسے مکمل کر لیا۔ لیکن چوں کہ شرط اول کی تکمیل اس ملک میں تحقیقات ہونے پر منحصر تھی۔ ہم نے اس قدر حصے کو ہندوستان میں پورا کرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ مگر ایسا ہونا مقدر نہ تھا۔ کیوں کہ اس غرض کے لئے دو لاکھ روپیہ کا خرچ لیجسلیٹو اسمبلی نے منظور کرنے سے انکار کیا۔ میں یہ کہہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کے ہندوستانی حصے کی تحقیق کی بغایت ضرورت تھی کیوں کہ میرے نزدیک نہ گورنمنٹ ہند، نہ مختلف پراونشل گورنمنٹیں اور نہ ہندوستانی پبلک اور خود والدین اس سے کما حقہ واقف ہیں کہ اس معاملہ میں ان کی ذمہ داری و فرائض کیا ہیں۔

جہاں تک گورنمنٹ کا تعلق ہے ہماری تحقیقات اس قسم کے مدارج کی نسبت ہوتی ہے کہ:

(۱) سرکاری ذمہ داری کی نوعیت اور حد اس باب میں کہ

(الف) ہندوستان کے اندر ہی اور زیادہ ایسی مناسب آسانیاں بہم پہنچائی جائیں کہ باہر جانے کی ضرورت کم ہو جائے۔

(ب) جو تعلیمی تربیت فی الحال ہندوستان میں نہیں ہوسکتی اس کے لئے سلطنت متحدہ کے اندر معقول آسانیاں بہم پہنچانے کا ضروری انتظام کیا جائے

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستانی طلبہ کو باہر بھیجنے کا طریقہ صرف اسی سبب سے ضروری اور مفید ہے کہ فی الحال خود ہندوستان کے اندر اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے مواقع اور ذرائع موجود نہیں ہیں لیکن جہاں تک اور جس قدر جلد ہو سکے اس ضرورت کو رفع یا کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ یہی رائے سر سی مالٹ اور انگلستان کے دیگر ماہران فن تعلیم کی ہے اور یہ ضروری تھا کہ اسے براہ راست ہندوستان کے حکام کے روبرو پیش کیا جاتا تاکہ معلوم ہوتا کہ اس سلسلے میں یہاں کیا ہو رہا ہے۔

(۲) تعلیمی اصلاح و ترقی کی نسبت ۱۹۱۲ء کی ماریسن کمیٹی، ۱۳-۱۹۱۲ء کی پبلک سروس کمیشن، انڈسٹریل کمیشن وغیرہ نے جو سفارشیں کی تھیں ان پر ہندوستان کی مختلف گورنمنٹوں نے کوئی عمل کیا یا نہیں اور کیا تو کیا؟

ہم نے اس قسم کی اطلاع انڈیا آفس سے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، مگر ہمیں بتایا گیا کہ یہ صرف ہندوستان کے حکام ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

(۳) اس قسم کی تعلیم گاہوں میں جیسے میڈیکل (طبی)، انجینیرنگ اور اگریکلچرل (زرعی)، کالج وغیرہ تقرر و ترقی کا کیا دستور ہے۔ اس کی نسبت برطانیۂ عظمےٰ کے ماہرانِ تعلیم نے ہمیں بتایا تھا کہ خود حصے کی خصوصیات کو تعلیمی اوصاف پر ترجیح دی جاتی ہے۔

(۴) ہندوستان کے اندر آزاد بار (اعلیٰ ترین تعلیم گاہ قانون) قایم کرنے کا مسئلہ انھیں حقوق و فوائد کے ساتھ جو انگلش بار کو حاصل ہیں تاکہ ہندوستانی طلبہ کو اس غرض کے لئے انگلستان جانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ہم نے اس پایہ کے جوڈیشیل حکام کی بھی جیسے لارڈ ہالڈین ہیں رائے حاصل کی۔ چنانچہ انھوں نے بھی انڈین بار کی تجویز کی زور سے تائید کی۔ اگر ہماری کمیٹی کو ہندوستان آنے دیا جاتا تو بار کمیٹی جو اب صرف اسی مسئلہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کی گئی ہے اس کی مطلق ضرورت باقی نہ رہتی۔

(۵) ایڈوائزری کمیٹی کے موجودہ طریقہ اور انگلستان میں اس کے طالب علموں کے محکمہ کے ساتھ تعلقات کی نسبت سالہا سال سے بہت سی شکایات چلی آتی ہیں۔

(۶) ہندوستانی طلبہ جو برطانیۂ عظمیٰ کو تعلیم اور علی الخصوص عملی تربیت کے لئے جاتے ہیں ان کے لئے معقول اور مناسب آسانیاں بہم پہونچانے میں گورنمنٹ آف انڈیا، ہائی کمشنر متعینہ لندن کے عہدہ اور اختیارات کو کہاں تک اور کس طرح استعمال کر سکتی ہے۔

جہاں تک ہندوستانی پبلک اور والدین کا تعلق ہے ہم ان کی آرا مندرجہ ذیل امور کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔

(الف) ہندوستانی طلبہ کو باہر بھیجنے کا نتیجہ کہاں تک کامیاب رہا ہے۔

(ب) اگر ناکامی ہوئی ہے تو والدین اس کے کہاں تک ذمہ دار ہیں کہ انھوں نے اپنے لڑکوں کو ممالک غیر کے حالات اور سہولتوں کی نسبت کافی اطلاع کے بغیر بھیج دیا۔ اور نہ اس بات کا اطمینان کیا کہ عمر، اخلاق، تعلیمی قابلیت اور مصارف کے لحاظ سے لڑکے باہر رہنے کے قابل ہیں یا نہیں۔

(ج) آیا ہندوستانی پبلک اور والدین کو اس امر کا کامل اندازہ ہے کہ کس مقصد وحید کے لئے طلبہ کو باہر جانا چاہئے۔

حضرات! میں نے مختصر طور پر وہ خاص خاص اصول بتا دیئے ہیں جن پر ہماری کمیٹی اس ملک میں محافظ کرتی اور اس امر کا فیصلہ میں ہندوستانی پبلک پر چھوڑتا ہوں کہ ہماری کمیٹی کے لئے سنگ راہ ہو کر اور دو لاکھ روپیہ بچا کر فاضل واضعانِ قوانین نے ملک کا کتنا فائدہ کیا؟

عام مسئلۂ تعلیم

اب میں ہندوستان کے عام مسئلۂ تعلیم کو لیتا ہوں جس کا تعلیم مسلمانان صرف ایک جزو ہے جہاں تک عام تعلیمی حالت کا تعلق ہے اس کے نقائص اور رکوتا ہیوں نیز اس کی خوبیوں کو بڑے بڑے ماہرانِ فن بیان کر چکے ہیں۔ لہذا اس موقع پر میرے لئے اس مسئلہ میں پڑنا مناسب نہیں ہے البتہ مقابلے کے طور پر میں انگلستان جیسے ملکوں کی تعلیم کی کچھ نوعیات و خصوصیات بیان کروں گا جن سے میں واقف ہوں۔

تعلیم انگلستان

حضرات! انگلستان میں نظام تعلیمی کی دو خصوصیات ہیں جو خاص توجہ کی محتاج ہیں (اول) تعلیم کسی خاص مدت عمر پر منحصر نہیں ہے۔ طفولت (پیدائش سے چھ سال کی عمر تک)، صبوت (چھ سال سے بارہ سال تک)، بلوغت (۱۲ سے ۱۸ تک)

فتوت (۱۸ سے ۲۴ تک) رجولت (۲۴ سے آخر تک) ان میں سے ہر دو قوم کے لئے قوم کی طرف سے اپنے ہر فرد کے واسطے ایک موزوں نظام تعلیم مہیا ہے (دوسرے) قوم کی تعلیمی ضروریات کی جانب توجہ خاص ضروریات اور افراد کی جسمانی و دماغی حالت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

تعلیم کے ان دو اہم پہلوؤں کو واضح تر کرنے کے لئے میں چند واقعات بیان کروں گا اور چند مثالیں دوں گا جو شاید ہندوستان کے لئے ہماری قومی تعلیم کی تجاویز کے واسطے مفید ہوں گی۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے روبرو زندگی کے مختلف ادوار کے متعلق کچھ تعلیمی خیالات پیش کروں۔ میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ تعلیم کی ہمیں ضرورت ہے۔ (۱) بحیثیت افراد کے (۲) بحیثیت کارکنوں کے اور (۳) بحیثیت شہریوں کے

اطفال کی تعلیم

بحیثیت افراد ہماری تعلیم عہد مہد یعنی شیر خوارگی ہی سے شروع ہو جاتی ہے جس کے لئے نرسری اسکولز (دایہ گری کے مدارس) موجود ہیں۔ اس زمانہ میں اصل غرض تندرستی اور تندرست بچوں سے ہوتی ہے۔ بچوں کے نفسیات کی ضرورت کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ میں کنڈرگارٹن (حدیقۃ الاطفال) اور منٹسوری وغیرہ طریقے استخراج ہوئے ہیں تاکہ بچوں کو شخصی نشو و نما کا بے روک ٹوک ہر ممکن موقع حاصل ہو۔ نرسری اسکول نہ صرف امرا کے لئے مہیا ہیں بلکہ غربا تک کے لئے موجود ہیں۔ مس مارگریٹ مکملن نے جو اس مضمون پر صاحب استناد ہیں ایسا مدرسہ لندن کے ایک تنگ کوچے میں بمقام ڈٹفرڈ کھول رکھا ہے جس میں ایک سے پانچ چھ سال تک کی عمر کے تقریباً ۲۵۰ بچے ہیں جو سائبانوں میں تازہ ہوا اور گلزاروں میں رکھے جاتے ہیں۔ گرم حمام اور صاف کپڑے ان کے لئے مہیا کئے جاتے ہیں اور تربیت یافتہ نرسیں (دایہ) ان کی اس طرح نگہداشت کرتی ہیں گویا وہی ان کی مائیں ہیں مس مکملن نے اس مبحث پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں وہ تحریر کرتی ہیں کہ:

> "نرسری (دایہ خانوں) اور نرسری اسکولز کی صرف اس لئے ضرورت ہے کہ بچوں کو نرسوں کی ضرورت ہے..... ان کو اس نہایت اہم قسم کی ابتدائی تعلیم درکار ہے جسے "نرچر" (دایہ گری) کہتے ہیں..... بچوں کو کھلی جگہ کی ہر عہد میں ضرورت ہوتی ہے مگر ایک سال سے سات سال تک کی عمر تک جگہ (یعنی وافر جگہ) تقریباً اتنی ہی ضروری ہے جتنی غذا اور ہوا۔"

اس طرح امرا اور غربا کے بچے یکساں طور پر توجہ حاصل کر رہے ہیں جو تازہ ترین نفسی

و تعلیمی تحقیق و تجربہ کے ماتحت جاری ہے۔ اور اس طرح یورپ اور امریکہ میں حقیقی قومی تعلیم کی بنیاد رکھی جارہی ہے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہندوستان کی ایسی حالت آئندہ عرصۂ دراز تک نہ ہو سکے گی کہ اس کے اطفال کو یہ سہولتیں نصیب ہو سکیں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر بڑے گرل اسکول (زنانہ مدرسہ) کے ساتھ ایک نرسری اسکول (مدرسہ دایہ گری) بھی کھول دیا جائے تاکہ طالبات کی عملی تعلیم ہو سکے جن کو کسی نہ کسی روز ماؤں کے فرائض انجام دینے ہوں گے؟

عہد صبوۃ کی تعلیم

دوسرا دور (یعنی چھ سے بارہ سال تک کی عمر) یہ وہ زمانہ ہے جب کہ بچے "آہستہ آہستہ بتدریج نشو و نما پاتے ہیں۔ اُن کے اندر قوت نامیہ بافراط ہوتی ہے وہ مسلسل نقل و حرکت کے خواہاں ہوتے ہیں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا انھیں شوق ہوتا ہے۔ بہت کچھ آنکھ کے واسطہ سے سیکھتے ہیں۔ بڑوں کی رائے کا اُن پر نسبتہً کم اثر ہوتا ہے۔ ان کی چھوٹی سی دنیا الگ ہی ہوتی ہے، ٹولی بنا کر کام کرنا چاہتے ہیں اُن کے جملہ حواس ظاہری و باطنی کی تربیت ہوشیاری کے ساتھ ہونی چاہئیے قصص و حکایات اُن کے نہایت قوی حافظوں کے اندر ان واقعات کا (جو بعد میں کام آئیں گے ذخیرہ کرنے کے لئے عمدہ طریقہ ہیں لیکن بچوں کے اندر قوت استدلال بہت کم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے بہت کم کام لینا چاہیئے۔ یہ عمر عادات کی پختگی کے لئے موزوں ترین ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں وہ تندرستی، عمدہ کام، خوش نظمی، تحمل، احتساب نفس، جائز اطاعت کی عادات میں بآسانی پختہ ہو سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اس سن و سال کے مطابق ہونی چاہئیے۔ ہماری تعلیم من حیث الافراد (یعنی ہماری عام تعلیم) اس تمام زمانہ میں جاری رہنی چاہئیے۔ یورپ اور امریکہ میں اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ عام تعلیم کی مدت کم از کم ۱۴ سال کی عمر تک جاری رہنی چاہئیے۔ ۱۲ سال کی عمر پر انسان کی زندگی کا نازک ترین زمانہ شروع ہوتا ہے جو تقریباً ۱۸ سال تک رہتا ہے۔ ہم اتنے زیر اثر و تعلیم پذیر اور لوچدار کبھی نہیں ہوتے جتنے اس ثانوی درجہ میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس درجہ میں شاگرد نہایت تیزی اور نہایت بے قاعدگی کے ساتھ متغیر ہوتے ہیں تخیل و استدلال کو معتد بہ ترقی ہوتی ہے۔ دلچسپی (علے الخصوص انسانی دلچسپی) وسیع ہو جاتی ہے جس سے ادب و تاریخ کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ شغف بڑھ جاتا ہے۔ اس زمانہ میں شاگردوں کی زندگی آسان نہیں ہوتی یہ زمانہ اس کے لئے طوفان و کشاکش کا ہوتا ہے۔ نئی دلچسپیاں، نئی قوتیں، نئے جذبات آزادی اور ازدیاد شخصیت کی قوی خواہش، رجولیت کی رائے کا نہایت تیز احساس دامن گیر اور اُن سب کے ساتھ قوت فیصلہ

کا توازن نہایت خفیف ہوتا ہے۔ طفلی کی تربیت پزیری غایب ہو جاتی ہے، اور پختہ عمری کی معقولیت بھی نہیں پیدا ہونے پاتی .... ہر شاگرد گویا ایک جداگانہ حل طلب مسئلہ ہوتا ہے۔۔ حقیقی ذوق علم اس درجہ میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بظاہر قدرت نے اس پُر از واقعات دورحیات کو اس کے لئے ارادہ کیا ہے کہ اس میں تعلیم کی نہایت غور کے ساتھ نگرانی کی جائے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ہماری تعلیم بحیثیت "ورکر" (کارکن)، شروع ہو کر خاص کر ۱۴ سال کے سن تک جاری رہنی چاہیئے"

لندن کونٹی کونسل کا نظام

حضرات! میں ابتدائی اور ثانوی مدارج کی نوعیت و اہمیت کی نسبت بعض انگریزی ماہرانِ تعلیم کی آرا نقل کرچکا۔ لیکن میں اس سلسلہ میں چاہتا ہوں کہ لندن کونٹی کونسل کے وضع کردہ نظام کا تذکرہ کروں جس سے آپ کو تعلیم کی ان شاخوں کی وسعت و اہمیت کا کچھ کچھ اندازہ ہوگا اور قومی تعلیم کے لئے انگلستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ایک عمدہ خاکہ پیش ہو سکے گا۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ابھی تک لندن کونٹی کونسل کے حدود و اختیارات میں کل لندن شامل نہیں ہوا۔ مگر اکثر حصہ جو شامل ہے اس میں دس لاکھ طلبہ ہر قسم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں سے ۷ لاکھ تین سے ۱۴ سال تک کے ابتدائی پبلک مدارس میں ہیں۔ ہر سال تقریباً ساٹھ ہزار طلبہ ابتدائی مدارس سے نکلتے ہیں۔ تازہ ترین نفسی طریقوں سے خاص کوشش کی جاتی ہے کہ ان بچوں کی دماغی کیفیت اور رجحان طبیعت کی جانچ کی جائے تاکہ "مدور سوراخوں میں چوگوشہ میخ ٹھونکنے سے احتیاط ہو سکے۔" (یعنی بچوں کے قدرتی رجحان کے خلاف اُن کو تعلیم نہ ملے)، ان احتیاطوں کا نتیجہ یہ ہے لندن کا بچہ بعام ذہانت میں پیرس (فرانس)، اور نیویارک (امریکہ) کے زیر تعلیم بچہ سے ایک سال آگے ہوتا ہے۔ لندن کے بچوں میں سے دس فی صدی کے اندر غیر معمولی قابلیت پائی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ دس فی صدی غبی اور پھسڈی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے لئے خاص انتظام ہوتا ہے ساٹھ ہزار میں سے جو ہر سال ابتدائی مدارس سے نکلتے ہیں تقریباً ڈیڑھ ہزار جونیر کونٹی اسکالرشپ کے لئے کھلے مقابلہ سے انتخاب کر کے سکنڈری (ثانوی)، مدارس میں داخل کئے جاتے ہیں۔ یہاں وہ ۱۸ و ۱۷ سال کی عمر تک تعلیم پاسکتے ہیں۔ پانچ ہزار کی ایک اور ٹولی سنٹرل اسکولز (مرکزی مدارس) کے لئے اُسی قسم کے مقابلہ سے منتخب ہوتی ہے جس کے لئے ۱۲ سال کی عمر کی قید ہے۔ پھر ان میں سے بھی بہترین یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے جاتے ہیں جسے وہ ۲۱ و ۲۲ سال کی عمر تک حاصل کرتے ہیں۔ چھ سو طالب علم تجارتی وظائف کے ذریعہ سے مدارس میں داخل کئے جاتے ہیں جہاں لندن کی تجارت گاہوں کے لئے عملی ترتیب کا نصاب ہوتا ہے۔ غرض اس طرح جن لڑکے لڑکیوں کا انتخاب ہوتا ہے وہ ابتدائی مدارس کا لبِ لباب

ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً سات ہزار یا "تارکین" کی کل تعداد کا تقریباً دس فی صدی ہوتی ہے۔ باقی نوے فی صدی میں کچھ تو بطور خود آئندہ تعلیم جاری رکھتے ہیں اور کچھ روزینہ تجارتی کلاسوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی مدارس کے "تارکین" میں سے تقریباً ۲۰ فی صدی کسی نہ کسی شبینہ مدرسے میں جاتے ہیں جو کونسل کی طرف سے ۲۰۰ کی تعداد میں مہیا ہیں جن میں کچھ تو ابتدائی مدارس سے آگے کی تعلیم ہوتی ہے اور کچھ ان لوگوں کو جو "کام سیکھنا" چاہیں پیشوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

ثانوی مدارس میں تقریباً تین ہزار طالب علم ہیں جن میں سے ایک ثلث ابتدائی مدارس سے آتے ہیں اور ۱۶، ۱۷ سال کی عمر تک عام تعلیم حاصل کر کے جنرل اسکول کے امتحان دیتے ہیں جو لندن کی میٹریکیولیشن کے مساوی ہے۔ بعض دو سال اور رہ کر السنہ، غیر سائنس کلاسکس یا ماڈرن اسٹڈیز لیتے اور بعد ازاں آرٹس، سائنس، تجارت یا اقتصادیات میں یونیورسٹی کی ڈگری لیتے ہیں۔

معمولی ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بیچ میں وہ **مرکزی مدارس** ہوتے ہیں جن میں بیس ہزار طالب علم ہیں۔ ان کی مدت تعلیم چار سال۔ گیارہ سے پندرہ سال تک کے لڑکے لڑکیوں کے لئے ہے تین سال تک نصاب عام تعلیم کے طریق پر چلتا ہے۔ مگر چوتھے برس میں زیادہ تر پیشوں کے متعلق ہو جاتا ہے جس میں والدین کی خواہش کے مطابق، تجارت و حرفت کا بیشتر ملحاظ کیا جاتا ہے۔ یہ مرکزی مدارس لندن میں اول اول ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئے تھے اور دنیا بھر میں اپنی قسم کے پہلے مدارس تھے۔

حرفتی اور شبینہ مدارس: لندن کے تجارتی مدارس ان لڑکے لڑکیوں کو جو ابتدائی مدارس چھوڑ دیتے ہیں تقریباً دو سال تک پیشوں کی خاص تعلیم دیتے ہیں۔ ۱۸ سال سے زیادہ عمر کے طالب علموں کے لئے کسی قدر انتظام یونیورسٹی کالجوں میں (جیسے یونیورسٹی کالج، کنگس کالج، لندن اسکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس، بیڈفرڈ کالج (عورتوں کے لئے) اور قدرے پالی ٹکنکس، ٹکنیکل اور ٹریننگ انسٹی ٹیوشن، اسکولز آف آرٹ) میں ہوتا ہے۔ جہاں تعلیم کی نوعیت حرفتی ہوتی ہے اور ضلع کی حرفت اور طالب علم جن کی خدمت مقصود ہوتی ہے ان کے درجہ کے مطابق تعلیم کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم کا اکثر حصہ رات میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ طالب علم ملازمت پیشہ ہوتے ہیں۔ لندن میں حرفتی تعلیم کا بازمتحدہ طور پر لندن کونٹی کونسل اور انجمن ملازمین و مالکان پر ہے۔ ماہران فن کی کمیٹی مشورہ دینے کے لئے کونسل میں متعین ہوتی ہے تا کہ حرفتی اور تجارتی تعلیم کی ترقی کی نگرانی رہے۔ حرفتی تعلیم کی ترقی کے لئے وظائف مرکزی اور حرفتی مدارس سے ملتے ہیں۔ چند وظائف اس غرض کے لئے بھی دیئے جاتے ہیں کہ

ایوننگ انسٹی ٹیوشن (مدارس شبینہ) کے نہایت ہونہار طالب علموں کو پالی ٹکنک اور حرفتی مدارس میں جانے کے لئے دیئے جائیں۔

خاص مدارس لندن میں ۱۶۸ ان بچوں کے لئے ہیں جو سل میں مبتلا ہوں یا ان میں کوئی اور دماغی وجسمانی نقص ہو جیسے اندھے، بہرے، لولے، لنگڑے وغیرہ یا عادی مجرم۔ ایسے شاگرد حسب قاعدہ ۱۶ سال کی عمر تک مدرسہ میں رہتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا بڑا حصہ عملی ہوتا ہے۔ تاکہ انھیں روزگار بآسانی مل سکے۔

طبی معائنہ وغیرہ کونسل کی طرف سے ۵۰۰ ڈاکٹر ۵۳ دنداں ساز اور ۳۰۰ نرسیں ہیں۔ جو طبی معائنہ اور عند الضرورت بچوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں۔ غریبوں کے بچے جو مدارس میں تعلیم پاتے ہیں ان کے لئے خاص شفاخانے قایم ہیں جن میں ضرورت کے وقت یہ بچے رکھے جاتے ہیں۔ ایسے بچے جن کو کھانے کی ضرورت ہو ان کے لئے ناشتہ اور کھانا بھی مہیا کیا جاتا ہے۔

مصارف سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں تعلیم کی کل شاخوں پر ۱۴۱۴۲۱۱ پونڈ خرچ ہوئے تھے جو پندرہ روپیہ فی پونڈ کے حساب سے اکیس کروڑ روپیہ سے زیادہ (اکیس کروڑ اکیس لاکھ اکتیس ہزار چھ سو پینسٹھ روپیہ) ہوتے ہیں۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس رقم میں سے یونیورسٹی کے درجہ کی تعلیم پر صرف ایک لاکھ پونڈ (یا پندرہ لاکھ روپیہ) خرچ ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اکیس کروڑ سے زیادہ روپیہ ثانوی، حرفتی اور ابتدائی تعلیم پر اور طبی معائنہ وغیرہ پر تنہا لندن میں صرف ہوتا ہے۔

ثانوی تعلیم فرانس میں

حضرات! فرانس میں ثانوی تعلیم کی ایک اور خصوصیت ہے جس کا تذکرہ اس سلسلہ میں ضروری ہے۔ ثانوی مدارس میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے استادوں کو گریجویٹ ہونے کے بعد ایک اور امتحان "اعلیٰ تعلیم کی سند" کا پاس کرنا ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک اور امتحانِ مقابلہ پاس کرنا پڑتا ہے۔ جسے "اگریگیشن" کہتے ہیں۔ فرانس میں ثانوی مدارس کے استادوں میں سے نصف سے زیادہ یہ اعلیٰ سند رکھتے ہیں اور عملاً یونیورسٹیوں کے تمام پروفیسر ثانوی مدارس ہی سے معلمی کا پیشہ شروع کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فرانس میں ثانوی تعلیم کو کیا درجہ حاصل ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم اور اُس کی اہمیت

چوتھا درجہ یعنی ۱۸، ۲۰ سال تک اعلیٰ تعلیم یا یونیورسٹی کی تعلیم کا زمانہ ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے سیڈلر کمیشن کی رپورٹ میں اس مسئلہ کی خوب چھان بین ہو چکی ہے۔ لیکن اس موقع پر میں صرف چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ جیسا کہ اے حضرات آپ واقف ہیں حقیقی معنوں میں یونیورسٹی صرف کسی قانون کی رو سے قائم نہیں ہوتی نہ کوئی تعلیم گاہ یونیورسٹی نام رکھ دینے سے ہو سکتی ہے بلکہ اصلی یونیورسٹی کا امتیاز خصوصی اس کی آب و ہوا اس کا طور طریق اُس کی ہمہ گیر روح اور وہ عام نظر ہے جو اس کی دنیا اور نوع انسان پر ہوتی ہے۔ "سچائی اور خوبی و خوشنمائی" کے اعلےٰ اصول کو وہاں پورا اور آزاد ترین موقع ملنا چاہیئے اور استاد اور شاگرد دونوں کی ان کی طرف کامل توجہ اور پرداخت ہونی چاہیئے۔ یونیورسٹی گویا ایک کھیت ہے جہاں فراخ دلانہ رواداری اور آزادانہ تحقیقات کی تخم ریزی ہوتی ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ "نشو و نما کے ابتدائی درجہ میں چھ سال کی عمر تک بچّہ کو اپنے گھر کے ساتھ وفادار ہونا سیکھنا چاہیئے۔ دوسرے (ابتدائی) درجہ میں اس پر مدرسہ کے ساتھ وفاداری کا اضافہ ہونا چاہیئے اور اس زمانہ کے آخر میں اُسے اپنے شہر یا ضلع کے ساتھ بھی وفاداری کا احساس ہونا چاہیئے۔ تیسرے (ثانوی) درجے میں ملک کے ساتھ وفاداری کو نمایاں طور پر ظاہر ہونا چاہیئے۔ چوتھے (یونیورسٹی کے) درجہ میں وہ اپنی نظر کو وسیع کر سکتا ہے اور کل نوع انسان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر سکتا ہے۔"

اگر اس اصول کو ہندوستان پر منطبق کیا جائے تو میں اتنا اضافہ اور کروں گا کہ ثانوی تعلیم کے درجے میں ہمیں اپنی قوم کے ساتھ وفاداری کا سبق سیکھنا شروع کرنا چاہیئے جو آگے چل کر یونیورسٹی کی تعلیم پر ختم ہو۔ ہندوستان کا مسئلہ انجام کار صرف اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندر دوربین ذہانت، حوصلہ مندی اور فراخ دلانہ رواداری اور جذبہ حب قومی پیدا ہو اور یہ اوصاف صرف اصلی یونیورسٹی ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس ملک کے اندر ہماری یونیورسٹیاں صحیح آب و ہوا اور ماحول پیدا کریں۔

ایک اور بات بھی ہے جس کی جانب میں اپنی قوم مسلمانوں کے ملوک التجار اور بڑے خاندانی رؤسا اور شرفا کی توجہ منعطف کرتا ہوں جنہوں نے اب تک اعلےٰ تعلیم کی اہمیت کو ذہن نشین نہیں کیا ہے۔ آپ کی اجازت سے میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے سرکاری کمیشن کی رپورٹ سے کچھ حصّہ

نقل کروں گا جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی تعلیم گاہیں کسی قوم کی قسمت پر کہاں تک اثر ڈال سکتی ہیں۔ گزشتہ جنگ کے موقع پر جو خدمات یونیورسٹی نے انجام دیں ان کی نسبت صاحبانِ کمیشن نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔

ان یونیورسٹیوں کے ارکان نے انفراداً جو خدمات انجام دیں ان کا شمار کرنا طول سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں سلطنت کی مختلف یونیورسٹیوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اور اس مقصد مشترک کے لئے جو وفاداری ان سے ظہور پذیر ہوئی ہے اس کی حصہ کشی کرنا ازبس دشوار ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ آئندہ قوم اس احسان عظیم کو ہرگز فراموش نہ کرے جو یونیورسٹی والوں کا اس پر ہے۔ چوں کہ جو نئے اور قطعاً غیر متوقع مسائل وقتاً فوقتاً پیش آتے تھے اور جن کے حل کی جلد از جلد ضرورت ہوتی تھی اُن سے صرف وہی لوگ بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے تھے جنھوں نے مختلف زبانوں اور حکمت عملی واصولی اور اقتصادیات کی تعلیم حاصل کی ہو ان خدمات میں ان دو قدیم تر یونیورسٹیوں نے جیسا اور جتنا حصہ لیا ہے اُس پر فخر کرنا اُن کے لئے سزاوار ہے۔

ریاضی اور سائنس کے مدارس سے غیر معمولی طور پر قوم کی خدمت انجام دی اور کائنات کے بہت سے دشوار مسائل حل کئے جن کا تعلق آب وہوا، ہوائی پرواز، مصوری، گولہ اندازی، لاسلکی، آبدوز، گیس کی لڑائی، گیس کے مریضوں، ہجومی دفاعی جنگ، زہر آلود گیسوں کی ساخت، آتش گیر اشیاء، ادویات، سامان غذا، فصلی پیداوار، گورنمنٹ کی بہم رسانی اور انجنیری وغیرہ سے تھا۔ جنرل اسٹاف، بری اور بحری خبر رسانی اور جدید وقدیم انتظامی محکموں میں ایسے مرد اور عورتیں تھیں جو آکسفورڈ اور کیمبرج کی تعلیم یافتہ تھیں اور جن سے دوران جنگ میں قیمتی امداد حاصل ہوئی بعض اوقات اُن کی زبانوں، اقتصادیات، قانون یا دوسرے مضامین کی واقفیت بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ ان یونیورسٹیوں کے بعض افراد کی وسیع عام معلومات اور زبانوں کی شناختوں کی واقفیت سے بڑی مدد ملی۔ اور میدان جنگ میں پروپگنڈے، احتساب یا خبر رسانی کے متعلق انھوں نے بیش قدر خدمات انجام دیں۔ علمی پیشوں میں "ڈان (ملا) کی کامیابی نے بڑی حد تک یہ ثابت کر دیا کہ یہ خیال کس قدر کہنہ و فرسودہ ہے کہ دملا، وسیع تر دنیا کے مسائل سے براہ راست دوچار ہونے کی مطلق اہلیت

نہیں رکھتا۔

یونیورسٹی کے تعلیم یافتوں کی جنگ کے زمانہ میں قدر و قیمت نہ صرف اُن کے مخصوص علم و فن کے لحاظ سے ظاہر ہوئی بلکہ اس لحاظ سے بھی اُن کے دماغ کس قدر تربیت یافتہ اور جدّت آفریں ہیں اور وہ اپنے آپ کو کس قدر جلد مختلف حالات کے مطابق بنا لیتے ہیں میدانِ جنگ میں، وطن میں اور وطن سے باہر یہ اوصاف قدیم اور جدید یونیورسٹیوں کے خاص عطایا ثابت ہوئے جن سے بزمانۂ جنگ قوم کو اتنی ہی تقویت حاصل ہوئی جتنی کہ اُسے یوماً فیوماً دورانِ امن میں حاصل ہوتی ہے۔"

حضرات! آپ ذرا غور کیجئے کہ ایسی تعلیم گاہیں فوجی مدافعت اور تجارتی اور حرفتی قابلیت کے لئے بھی کس قدر ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں (علی الخصوص ہماری قوم میں) جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم سے بزدلی پیدا ہوتی ہے یا یہ کہ تجارت یا سوداگری کے لئے اس قسم کی کسی قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو جو یہ خیالات رکھتے ہیں، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے علما اور اساتذہ کی خدمات اور کارگزاریوں پر غور کرنا چاہیے جو انھوں نے دورانِ جنگ میں مادرِ وطن کے لئے انجام دیں۔

عہدِ جولۃ کی تعلیم

حضرات! اب میں چند الفاظ آخری درجے (یعنی چوبیس سال سے آخر عمر تک) کی نسبت چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ اس مبحث کو عموماً پختہ عمروں کی تعلیم (Adult Education) سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی طرف اب اس ملک کی توجہ ہو چلی ہے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ اس کی نوعیت، حدود یا اہمیت پر اب بھی کافی لحاظ ہے اور چوں کہ اس تحریک کو میں ہندوستان کے لئے نہایت اہم سمجھتا ہوں اس لئے مجھے امید ہے کہ اس موقعہ پر قدرے بسط کے ساتھ اس کی تشریح کرنے کی مجھے معافی دی جائے گی۔

سب سے اول مجھے یہ واضح کر دینا ضرور ہے کہ پختہ عمروں کی تعلیم کی تحریک کا مقصد انگلستان جیسے ملکوں میں صرف یہ ہی نہیں ہے کہ عوام الناس میں نوشت و خواند کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ اس کی وہاں چنداں ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ آزاد جبری تعلیم ۱۸۷۰ء سے مروج ہے اور ملک بھر میں اب کوئی جاہل مطلق موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس تحریکِ عظیم کی غرض و غایت کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔ (جیسا کہ انگلستان کی ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کی آخری رپورٹ میں واضح کیا گیا ہے):

"چوں کہ جمہوریت کی روح کا اقتضا یہ ہے کہ اس کے تمام افرادِ شہریت میں مجہول نہیں بلکہ عملی حصہ لیں۔

اس لئے ایک جمہوری ملک کے اندر تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ ہر فرد نہ صرف اپنے ذاتی اور خانگی اور پیشہ کے فرائض کو بخوبی انجام دینے کے لائق ہو۔ بلکہ سب سے بڑھ کر یہ کہ شہریت کے اُن فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکے جن کے لئے یہ ابتدائی مدارج گویا میدان تربیت ہیں یعنی اُسے جاننا چاہئے (الف) اس کی قوم کیا ہے اور اس کی گزشتہ تاریخ و ادب سے اس کا کیا درجہ ثابت ہوتا ہے اور موجودہ دنیا کی دیگر اقوام میں اس کی کیا منزلت ہے۔ (ب) قوم کے متعلق اس کے فرائض کیا ہیں (وہ فرائض جن کا تعلق ملک کی حفاظت اور اس کے قوانین کی پابندی سے لے کر اُن فرائض تک سے ہے جن کی رو سے قوم کے معیار اصول کو قایم رکھنا بلکہ بلند کرنا واجب ہے۔) (س) اقتصادی، سیاسی اور دینی قومی حالات جن پر اُس قوم کی قابلیت و بہبود کا انحصار ہے .... یہ کہ آیا ہماری قوم کے عوام الناس میں ایسی قابلیت موجود ہے جس کا عام طور پر احساس نہیں ہے کہ وہ مسائل مہمہ کو حل کر سکیں اور جب کبھی کوئی دشواری پیش آئے تو اس پر عبور حاصل کر سکیں .... یہ کہ پختہ عمروں کی تعلیم کو محض چند مخصوص لوگوں کے لئے ایک عیاشی نہ سمجھنا چاہئے نہ ایک ایسی چیز سمجھنا چاہئے جس کا تعلق اوائل عمر کے صرف ایک مختصر زمانہ سے ہے بلکہ یہ محسوس کرنا چاہئے کہ اڈلسٹ ایجوکیشن (عہد رجولیت کی تعلیم) ایک مستقل قومی ضرورت ہے اور شہریت کا ایک غیر منفک پہلو ہے۔ لہٰذا اس کو عام اور علی الدوام ہونا لازم ہے .... یہ کہ قوم کی اقتصادی فلاح، عوام الناس کے اندر فرض شناسی کی نئی روح کا صحیح عمل لاکھوں نئے ووٹروں کا اپنے فرائض کا مناسب استعمال، یہ سب اس پر منحصر ہے کہ وہ ایک روشن خیال عام رائے رکھنے والی وسیع تر جماعت ہوں ...."

مسٹر مینس برج نے اس تحریک کی تعریف اپنی قابل مطالعہ کتاب

(An Adventure in working class Education)

میں بیان کی ہے۔ جس کے اندر اس مبحث پر بہت سا مواد فراہم ہے جو ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ کا محتاج ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس عظیم الشان قومی جد و جہد کے متعلق جو اس سلسلہ میں انگلستان میں جاری ہے آپ کو کچھ تصور دلا سکوں۔ حالانکہ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جو ترقی یافتہ اقوام کی پہلی صف میں ہے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں نے اس میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا لیکن اب اس کام کو تقریباً بیس اور یونیورسٹیاں بھی کر رہی ہیں اور متعدد کالج ہیں جو ٹیوٹوریل اور ایک سال کی مدت کی کلاسیں رکھتے ہیں۔ اور ان میں موسمی مدارس بھی ہوتے ہیں۔ جن میں ہر سن و سال کے پختہ عمر لوگوں کو تقریباً تمام مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن میں بعض طالب علم ۷۳ سال کی عمر کے ہیں۔ علاوہ ان مختلف تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں کے متعدد انجمنیں ہیں جو اس کام میں مصروف ہیں جیسے ورکرز ایجوکیشنل سٹلمنٹ ایسوسی ایشن، رزیڈنشل سلمنٹ ایسوسی ایشن نیشنل ایڈلسٹ اسکول یونین، ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن، ینگ دی مینز کرسچین ایسوسی ایشن۔ نیشنل فیڈریشن آف دی مینز انسٹی ٹیوٹ، دی کواپریٹیو یونین لمٹیڈ، دی مینز کواپریٹیو گلڈ، نیشنل ہوم ریڈنگ یونین۔ مختلف یونیورسٹیاں اور انجمنیں جتنا کام کر چکی ہیں وہ اتنا اہم اور وسیع ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے کام کے اظہار کے لئے ایک مستقل لکچر کی احتیاج ہے۔ یہ فرض اس کانفرنس کا ہونا چاہیے کہ اس قسم کی تمام اطلاع ہندوستانی پبلک کے روبرو پیش کرے۔ بہت سا مصالحہ جو فراہم ہو سکتا ہے وہ کانفرنس کی لائبریری میں موجود ہے۔ اور اس کا منتظر ہے کہ جو لوگ اس مبحث سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اسے مطالعہ کریں اور کام میں لائیں۔

ہندوستان میں اس طریقۂ تعلیم کی ترویج

حضرات اس تحریک کی تہ میں جو اصول مضمر ہیں اُن کی اہمیت اور ہندوستان کے حالات وضروریات کے ساتھ ان کا منطبق کرنا یقیناً آپ سب پر روشن ہوگا۔ ایسی حالت میں کہ ہم میں صرف چھ یا سات فی صدی تعلیم یافتہ لوگ مجموعتاً قوم کو اُبھارنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم صرف اپنے موجودہ اسکولوں اور کالجوں پر تکیہ کئے بیٹھے رہے تو اس رفتار سے نہ صرف نسلیں بلکہ صدیاں درکار ہوں گی کہ قوم میں عموماً تعلیم اور روشن خیالی کی اس پیمانہ پر ترویج ہو جو یورپ میں عام ہوتا جاتا ہے۔ پختہ عمروں کی تعلیم کی جتنی ضرورت ہندوستان میں ہے اتنی کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ مہربانی کرکے یاد رکھئے کہ محض جبری ابتدائی تعلیم (اگر تمام ملک میں عام بھی ہو جائے) اس غرض کو بالکلیہ پورا نہیں کرے گی کیوں کہ پختہ عمروں کی تعلیم کا مقصد صرف ابتدائی تعلیم دینا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہر فرد کے اندر شہریت کے ضروری اوصاف پیدا ہو جائیں۔ اصلی سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہو؟

بلاشبہ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ بعض پراونشل گورنمنٹیں اس ضروری کام کو اٹھا رہی ہیں۔ حال ہی میں پنجاب گورنمنٹ نے اس مبحث پر ایک اہم گشتی جاری کیا ہے۔ لیکن صرف گورنمنٹ اتنا بڑا کام تنہا انجام نہیں دے سکتی۔ انگلستان میں یونیورسٹیوں نے پیش قدمی کی اور اب اس کام کو مختلف انجمنیں اپنی خوشی سے انجام دے رہی ہیں۔ یہ ان مسئلوں میں سے ایک ہے جن میں ہندوستان کے تمام مذاہب اور قوموں کا اتحاد خالی از منفعت نہیں ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، پارسی اور دیگر قومی جماعتیں اپنا اپنا تعلیمی کام انجام دینے میں مصروف ہیں۔ لیکن کیا ابھی وقت نہیں آیا

کہ یہ سب متحد و مشترک ہو کر اس مسئلہ کے اُن پہلوؤں پر غور کریں جن کا تعلق ان سب سے یکساں ہے۔ گورنمنٹ کے مختلف محکمے کئی نسلوں سے ہماری تعلیم کی تمام شاخوں کو اپنے تحت میں لئے ہوئے ہیں اور مشنری انجمنیں بھی جملہ اقطاع ہند میں ایک صدی سے زیادہ سے مفید تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ہندو، سکھ اور دیگر کانفرنسیں اور انجمنیں ہیں جو عرصہ دراز سے اپنی اپنی قوم کی تعلیمی خدمت کر رہی ہیں۔ اس کانفرنس کو بھی مسلمانوں کے اندر تعلیم پھیلاتے ہوئے اب تقریباً چالیس سال ہو لئے۔ ان سب کو کافی تجربہ ہو لیا ہے اور ان سب کو ہندوستان کی مختلف اقوام کی اصل حالات اور حقیقی ضروریات کا مفید علم حاصل ہو چکا ہے۔ کیا ملک کے مشترک فوائد کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ جہاں تک ممکن اور قابل عمل ہو اس قسم کی تمام کوششیں اور سرگرمیاں یک جا کر دی جائیں تاکہ ان سب کے گزشتہ تجربات کے ثمرات و محاصل کل ہندوستانی قوم کے فائدے کے لئے کام میں لائے جاسکیں۔ اس قسم کا اتحادِ عمل اس سوال پر غور کرنے اور اسے حل کرنے میں نہایت سود مند ثابت ہو گا کہ قومی اتحاد کے لئے تعلیم سے کس نہج پر مدد لی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ تعلیم ایک ایسی قوت ہے جسے خرق و التیام دونوں کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ تعلیم اب ایک شعبۂ منتقلہ ہے اور اس لئے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ذرائع یہ قومی اغراض حاصل کرنے کے لئے بخوبی کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ یہ تعلیم وہی توجہ حاصل کرے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

یہ طریقۂ تعلیم اور مسلمان

حضرات! پختہ عمروں کی تعلیم جس طرح عموماً ہندوستان کے لئے اہم ہے بعینہٖ اسی طرح خصوصاً اس ملک کے مسلمانوں کے لئے ضروری ہے جن کی تعلیمی پستی اندوہ ناک اور جن کا مستقبل اس درجہ تاریک اور مشتبہ ہے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ جلد سے جلد (جب انتظام ہو سکے) ایسی تعلیم گاہوں کے منتظمین جیسے کہ دارالعلوم دیوبند۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ انجمن حمایت اسلام و اسلامیہ کالج لاہور۔ اسلامیہ کالج پشاور۔ مسلم یونیورسٹی و کانفرنس ہذا۔ انجمن احمدیہ قادیان اور دیگر اسلامی انجمنیں ان مقامات سے کسی مقام پر جمع ہو کر ایسے طریقوں اور ذرائع پر غور کریں جن سے جوان عمروں کی تعلیم مسلمانانِ ہند کے اندر وسیع پیمانہ پر جاری و عام ہو سکے۔ سب سے پہلے شہروں اور قصبات میں اس کی ابتدا ہونی چاہیئے۔ اور ہر محلہ کی مسجد کو مرکزِ عمل بنانا چاہیئے۔ گریجویٹ اور دوسرے قابل اور تعلیم یافتہ مسلمان جو اس شہر یا مقام کے اندر مختلف محکموں یا صیغوں میں ملازم ہوں ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس غرض کے لئے ہفتہ میں کم از کم ایک اتوار دیں

اور وہ لوگ جو اس کے لئے آمادہ ہوں وہ دو دو تین تین آدمیوں کی جماعتوں میں تقسیم ہو کر شہر یا قصبہ کے مختلف حصوں کو اپنے اپنے ذمہ لے کر اس طرح کام کرنا شروع کر دیں کہ

(۱) ہر نماز کے وقت اپنے مقررہ محلہ کی مسجد میں جائیں اور نماز کے بعد سب نمازیوں سے مل کر نہایت مودبانہ اور ہمدردانہ طریقہ سے اپنی غرض بیان کریں۔ بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ حقیقی اسلامی مساوات و اخوت ازسرِ نو زندہ ہو اور اپنے غریب اور جاہل برادرانِ دین کا اعتماد حاصل ہو۔

(۲)۔ مختصر دوستانہ تقریروں اور رسالوں کے ذریعہ سے ایسے معاملات کے ساتھ اُن کو دلچسپی پیدا کرنی چاہیئے جیسے مشترکہ سرمایہ کی انجمنیں ڈاک خانہ کے سیونگ بنک۔ حدود میونسپلٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے اندر رہنے والوں کے حقوق و فرائض، ایسے سرکاری ملازموں کے فرائض و اختیارات جیسے پولیس کانسٹبل تحصیل کے چپراسی، پٹواری وغیرہ وغیرہ ووٹروں کے حقوق و فرائض، لیجسلیٹو کونسلوں کی کارروائی، ڈاک خانہ، تار اور ریلوے کے قواعد وغیرہ وغیرہ۔

(۳) مسجدوں کے اندر چھوٹے چھوٹے کتاب خانے اور مطالعہ گاہیں قایم کرنا جن میں اخلاق، تعلیم اور اقتصادی مضامین کا سلیس و سادہ بیان ہو۔

قومی تعلیم اور ہندوستان

حضرات آپ کے سامنے وہ چند تعلیمی واقعات۔ خیالات اور تجاویز رکھ دینے کے بعد جو ہر قوم یا ملک کی تعلیمی ضروریات پر یکساں منطبق ہیں۔ اب میں آپ کی اجازت سے ہندوستان کی قومی تعلیم کے بعض پہلوؤں کی نسبت کچھ عرض کروں گا۔ یہ قطعاً ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اندر قومی تعلیم کے نظام کا اہم ترین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ

(۱) مجموعی طور پر اہل ملک کی روحانی، ذہنی، اخلاقی اور جسمانی سطح بلند ہو۔

(۲) علم اور حکمت و فنون کی کنجی اُن کے حوالہ کی جائے جو قدرت پر انسان کی حکومت کو وسیع کرنے کے لئے ضروری ہے تاکہ قومی قوت و تحفظ کو استحکام ہو اور اس کرہ پر اپنے بہرہ و قسمت سے حظ وافی حاصل کر سکیں۔

(۳) مختلف فرقوں (علی الخصوص ہندو مسلمانوں) کے اندر رشتہ اتحاد قائم و مستحکم ہو

اور اُن میں ایک مشترک حب قوم وحب وطن کی روح پھونکی جائے۔

حضرات! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ تمام کوششوں اور سرگرمیوں کو جو اس ملک کے اندر عرصۂ دراز سے جاری ہیں مجتمع کیا جائے اور اس عظیم الشان مسئلہ کے حل کرنے میں متحدہ سعی کی جائے۔

جیسا کہ اے حضرات آپ جانتے ہیں علاوہ سرکاری محکمۂ تعلیم کے متعدد قومی جماعتیں اس ملک کی تعلیمی خدمت میں عرصۂ دراز سے مصروف ہیں۔ ایک صدی سے زیادہ سے مختلف عیسائی مشن جملہ اقطاع ہند میں نہایت مفید تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ کئی نسلوں سے سکھ، ہندو اور دیگر کانفرنسیں اور جماعتیں اپنے اپنے تعلیمی دستور العمل پر کار بند ہیں۔ اب سے چالیس سال سے یہ کانفرنس بھی مسلمانوں میں ترقی تعلیم کی کوشش کر رہی ہے۔ ان تمام جماعتوں کو مختلف طبقوں کی جن سے ہندوستانی قوم بنتی ہے، اصلی حالت وضرورت کا علم وتجربہ حاصل ہو گیا ہے کیا ملک کے مشترکہ فوائد کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ جہاں تک ممکن اور قابل عمل ہو ان سب کے اب تک گزشتہ تجربہ سے جو سبق وثمر حاصل کئے ہیں ان کو کل قوم کے کام میں لایا جائے؟

ہندوستان میں تعلیم اناث

حضرات! ہندوستان میں تعلیم اناث کی ضرورت اہمیت ایسی ظاہر ہے کہ مسئلہ کے اس پہلو پر میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن پھر بھی اس کے عملی پہلو کی نسبت اور اس کے متعلق ہماری قوم میں جو خیالات، رواجات اور حالات ہیں اُن کے لحاظ سے ابھی اس قدر کہنا کافی ہے کہ اس اہم مسئلہ کو پورے طور پر واضح کرنے کے لئے ایک پورے لیکچر کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ کسی اور موقع پر اس مسئلہ کی نسبت میں اپنی رائے کا اظہار کر سکوں گا۔ اس موقع پر صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک روحانی دماغی اور اخلاقی نشو ونما کا تعلق ہے عورتوں اور مردوں کی تعلیمی ضروریات میں یہاں یکساں اور مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جسمانی تربیت کے معاملہ میں بھی اُن کی ضروریات اکثر پہلوؤں میں مشترک ہیں۔ تعلیم اناث کا مقصد محض نیک بیبیاں اور اچھی مائیں پیدا کرنا نہ ہونا چاہیئے بلکہ اصلی غرض یہ ہونا چاہیئے کہ آبادی کے "بہتر نصف" (زنانہ حصہ) کی دماغی اور جسمانی تربیت ونشو ونما کامل طور پر ہو۔ اگر "بہتر حصہ" کے دماغ اور جسم غیر نشو ونما اور غیر تربیت یافتہ ہوں تو ہماری روحانی، دماغی، اخلاقی اور جسمانی دولت کا قومی سرمایہ اُن قوموں اور ملکوں کے

معیار تک کیسے پہنچ سکتا ہے جہاں مرد یا عورت کے ہر فرد کے لئے بہترین امکانی تعلیمی آسانیاں مہیا ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اس عظیم الشان مبحث کی کمیت اور کیفیت کا ہمیں صحیح تصور ہو۔

البتہ ایک اور بات ہے جس کی جانب میں اُن اصحاب کی جو ہمارے نظام تعلیم کے اس حصہ کے نگراں ہیں خاص توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کی کوئی ناواجب حد بندی نہ ہونی چاہیئے کہ ہماری عورتوں کو کس قسم کی تعلیم و تربیت ملے۔ البتہ میں اُن لوگوں سے کلیۃً متفق ہوں جن کو یہ ناگوار ہے کہ ہماری لڑکیاں وہ مصنوعی اور مصرفانہ مذاق، عادات اور طریقے اختیار کریں جو یورپین طرز معاشرت کی نامعقول نقل کا نتیجہ ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو ہماری تعلیم و تربیت نسواں کی غرض و غایت ہماری بچیوں کے قلوب اور اخلاق میں ذیل کی آیۂ کریمہ کا مفہوم جاگزیں کرنا چاہیئے :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝	اے نبی اپنی بیبیوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور آرایش چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ فائدہ پہنچاؤں اور تمھیں اچھی طرح سے رخصت کردوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور پچھلے گھر کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے نیکوں کے لئے اجر عظیم تیار کیا ہے۔

ناقص القویٰ بچوں کی تعلیم

حضرات! اب میں چند الفاظ ایک ایسے مبحث کی نسبت کہنا چاہتا ہوں جس کو اس ملک کی گورنمنٹ اور رعایا دونوں نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ میرا مقصد اُن بچوں کی تعلیم و تربیت سے ہے جو دماغی یا جسمانی حیثیت سے ناقص القویٰ ہیں۔ ہندوستانیوں کو یہ بتانا از بس ضروری ہے کہ بہرے گونگے اندھے، اپاہج، مسلول اور دوسرے دماغی یا جسمانی ناقص القویٰ بچوں کی یورپ میں تعلیم و نگہداشت کس طرح ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک پورے لکچر کی ضرورت ہے اور اسے میں کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔ اس سلسلہ میں انگلستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے میں چند لفظوں میں بیان کردوں گا۔ اس قسم کے بچوں کی غور و پرداخت کے لئے ایک سنٹرل ایسوسی ایشن (مرکزی انجمن) ہر

جس میں تقریباً پچھتر دیگر جماعتیں اور انجمنیں شامل ہیں جو سب کی سب ناقص القویٰ بچوں کی فوائد و بہبودی کی نگراں ہیں اس کے علاوہ تقریباً پچاس اور رضاکار انجمنیں ہیں جو اس قسم کے بچوں کی نگہداشت میں سنٹرل ایسوسی ایشن کی معاونت کرتی ہیں۔ پھر ایک اور انجمن ہے جس کی ۷۳ شاخیں مختلف حصص ملک میں اور ۲۰۳ تنہا لندن میں ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں تنہا لندن کی شاخوں نے ۲۳۴۵۶ سے زیادہ بچوں کی مدد کی۔

لندن کونٹی کونسل نے سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنے مدارس کے اندر ناقص القویٰ بچوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ۴۲۲۹ بچے سل یا لقوے وغیرہ کی وجہ سے بدشکل یا ناقص ہو گئے ہیں۔ ایسے بچوں کے لئے بہترین امکانی علاج اور تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

متعدد کالج اور اسکول اندھوں، بہروں، گونگوں اور دیگر ناقصوں کے لئے موجود ہیں لندن میں اندھوں کے لئے ایک لائبریری ہے جس میں ستر ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں جو ملک بھر میں اس قسم کی جتنی انسٹی ٹیوشنیں ہیں ان کو مستعار دی جاتی ہیں۔ نابینا لوگ ادب سائنس اور ریاضی کے متعلق کتابوں کا بے تکلف مطالعہ کرتے ہیں۔ اندھوں کے لئے اخبارات رسالے اور ناول ہیں جنہیں وہ پڑھتے ہیں اور ان سے محظوظ ہوتے ہیں اندھوں کے لئے ورزشی اور تفریحی کھیلوں کا بھی بندوبست ہے۔ مختلف قسم کے دیگر ناقص القویٰ بچوں کے لئے بھی اس قسم کے انتظامات ہیں۔ مصیبت زدہ انسانوں کے اس حصہ کے لئے نسلوں سے اس قسم کی آسانیاں فراہم ہیں۔ اس برّاعظم یورپ میں جسے مادہ پرست کہا جاتا ہے لیکن اس ضمن میں نام نہاد روحانی ہندوستان میں کیا حالت ہے۔ میں یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں گورنمنٹ نے اپنا فرض انجام نہیں دیا۔ گورنمنٹ کو چاہیئے تھا کہ ہر صوبہ میں ہر جنس کے ناقصوں کے لئے کم از کم ایک ماڈل انسٹی ٹیوشن (نمونہ کی تعلیم گاہ) قایم کر دیتی۔ یہ شکایت دیسی ریاستوں کے متعلق بھی ہو سکتی ہے جہاں خیرات و صدقات پر اس قدر خرچ ہوتا ہے لیکن ہمارے ہم جنسوں کے اس مصیبت زدہ حصّہ کی بہبودی اور دماغی و جسمانی کامرانی کے لئے کچھ نہیں ہوتا!!

ہندوستان میں قومی تعلیم

حضرات! آپ کے روبرو یہ چند تعلیمی واقعات، خیالات اور تجاویز رکھ دینے کے بعد جو ہر قوم اور ہر ملک کی تعلیمی ضروریات پر یکساں منطبق ہیں۔ اب مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے روبرو

ہندوستان کی قومی تعلیم کے متعلق چند امور پیش کروں ظاہر ہے کہ ہندوستان میں قومی نظام تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ سوراج کے حاصل کرنے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے فرزندانِ وطن کو تیار اور پختہ کار کیا جائے۔ لہذا اس قسم کے ہر نظام تعلیم کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ

(۱) من حیث الکل باشندوں کی دماغی روحانی اور جسمانی سطح کو بلند کرنا۔

(۲) علم اور حکمت وفنون کی کنجی ان کے حوالہ کرنا جو قدرت پر انسان کی حکومت کو وسیع کرنے کے لئے ضروری ہے تاکہ قومی قوت وتحفظ کو استحکام ہو اور اس کرہ پر اپنے بہرہ وقسمت سے حظ وافی حاصل کر سکیں۔

(۳) مختلف فرقوں (علی الخصوص ہندو مسلمانوں) کے اندر رشتہ اتحاد کو قائم و مستحکم کرنا اور ان میں ایک مشترک حب قوم وحب وطن کی روح پھونکنا۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس ملک میں عرصۂ دراز سے جو کوششیں اور سرگرمیاں جاری ہیں ان سب کو مجتمع کیا جائے تاکہ اس مسئلہ عظیم کے حل میں اتحاد عمل پیدا ہو سکے۔ جیسا کہ اے حضرات آپ جانتے ہیں علاوہ سرکاری محکمہ تعلیم کی متعدد قومی جماعتیں اس ملک کی تعلیمی خدمت میں عرصۂ دراز سے مصروف ہیں۔ ایک صدی سے زیادہ سے مختلف عیسائی مشن جملہ اقطاع ہند میں نہایت مفید تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ کئی نسلوں سے سکھ، ہندو اور دیگر کانفرنسیں اور جماعتیں اپنے اپنے تعلیمی دستور العمل پر کار بند ہیں۔ اب سے چالیس سال ہوئے کہ یہ کانفرنس بھی مسلمانوں میں ترقی تعلیم کی کوشش کر رہی ہے۔ ان تمام جماعتوں کو مختلف طبقوں کی (جن سے ہندوستانی قوم بنتی ہے) اصلی حالت و ضرورت کا علم و تجربہ حاصل ہو گیا ہے۔ کیا ملک کے مشترکہ فوائد کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ جہاں تک ممکن اور قابل عمل ہو ان سب نے اب تک گزشتہ تجربہ سے جو سبق و ثمر حاصل کئے ہیں ان کو کل قوم کے کام میں لایا جائے؟

علاوہ ازیں اس قسم کا اتحاد عمل اس مسئلہ کے غور اور حل میں بھی نہایت مفید ثابت ہوگا کہ قومی اتحاد کے لئے تعلیم کس طرح معین و ممد ہو سکتی ہے کیوں کہ تعلیم ایک ایسی قوت ہے جو وفاق ونفاق دونوں کے لئے کام میں لائی جا سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں قومی اتحاد کے مقدس مقصد کے لئے سے کام میں لایا جائے۔ ایسی حالت میں کہ یورپ کے اہل فکر و ماہران تعلیم، تعلیم کو بین قومی اتفاق و اتحاد پر صرف کر رہے ہیں، تاکہ نوع انسان کے امن و بہبودی متیقن ہو سکے، تو یقیناً اس ملک کے باشندوں کے لئے لازم ہے کہ اس قسم کے نتائج کم از کم اس ملک میں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

گورنمنٹ اور رعایا کے مابین تعلیمی اتحاد عمل

گورنمنٹ اور قومی تعلیم کے حامیوں کے مابین اتحاد عمل کا یہ قدرتی ذریعہ پیدا ہوگیا ہے کہ جدید اصلاحات کے ماتحت تعلیم بھی شعبہ ہائے منتقلہ میں سے ہے۔ رضاکار اور غیر سرکاری کارکن تو ماہرین فن کی ہدایت و رہنمونی کے محتاج ہیں اور ہندوستانی وزرا اور ان کے محکموں کو پبلک کی تائید اور اعتماد درکار ہے۔ سرکاری امداد و اعانت کی مثال کے لئے میں یہ واقعہ پیش کرتا ہوں کہ صوبجات متحدہ اور پنجاب کے وزرائے تعلیم اور ڈائرکٹران سررشتہ تعلیم نے اس تعلیمی کانفرنس کی بے حد امداد کی ہے جس کا افتتاح کل ہز ایکسیلنسی سر ولیم میرس گورنر صوبجات متحدہ کے ہاتھ سے ہونے والا ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری کارکنوں کے مابین اتحاد عمل سے میرا جو مقصد ہے اس کی یہ بین مثال ہے۔ جیسا کہ پختہ عمر کی تعلیم کے سلسلہ میں بتا چکا ہوں یہ نہایت ضروری ہے کہ مختلف سوسائٹیاں جو تعلیمی کام میں مصروف ہیں ان کو موقع ملنا چاہیئے۔ کہ گورنمنٹ کے قائم مقاموں کے ساتھ مل کر قومی تعلیم کے مسئلہ پر بحث و غور کر سکیں تا ان سب کا مجتمع تجربہ اور اثر اس مقصد عظیم کے لئے کام میں آسکے۔

اتحاد کا یقینی ذریعہ

آخری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کی جانب ہندو بھائیوں کے صحیح اور دوستانہ رویہ کا مسئلہ میرے نزدیک ایسا ہے جو اپنے نتائج میں نہایت اہم اور دور رس ثابت ہوگا۔ میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ہمیشہ صدق دل سے حامی رہا ہوں اور اس اتحاد کو اس ملک کے بہترین فوائد کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ مگر یہ ایسی چیز نہیں ہے جو بھیک مانگنے سے مل سکے بلکہ اس کے لئے ان دونوں قوموں کی طرف سے بالاستقلال مخلصانہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس جانبین کے خلوص نیت کی جانچ کا کیا معیار ہے۔ میری رائے میں ایک مسلمان کی صداقت کا حقیقی معیار یہ ہے کہ ہندوستان اس کے جملہ فوائد اور خواہشات کا مرکز ہو اور مادر وطن کے ساتھ اس کی عقیدت مندی اور وفاداری بلا شرکت غیرے ہو۔ اور درحقیقت اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے اعلےٰ ترین نصب العین کے لئے جو کچھ ضروری ہے اس سب میں وہ (مسلمان) ہندو بھائی کا حامی و معین ہے۔ علی ہذا ایک ہندو کی سچائی کی اصلی کسوٹی یہ ہے کہ مسلمانوں کی جہالت اور افلاس کے اسباب کو دور یا کم کرنے کے لئے جن جن باتوں کی ضرورت ہے سب کے ساتھ اسے واقعی ہمدردی ہو اور ان میں عملی امداد کے لئے وہ (ہندو)

ہمہ وقت تیار پایا جائے۔ ہماری مادر وطن کا سب سے بڑا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور اُن کی اقتصادی بحالی ہندوستان کی قومی ترقی کے پروگرام کی ایک اہم مد بن جائے۔ کیوں کہ کوئی چیز قومی اتحاد و استحکام کو اس درجہ ترقی نہیں دے سکتی جتنی کہ ہماری قوم کے پس ماندہ حصہ کی تنویر اور مرفہ الحالی دے سکتی ہے۔ میں اس رائے کی جو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں ظاہر کی گئی ہے۔ پورے طور پر تائید کرتا ہوں کہ "اعلیٰ تعلیم کے لئے مسلمانوں کی جدید تحریک میں وہ ذہنی اتحاد مضمر ہے جو اُن شگافوں کو اگر بالکل بند نہ کر سکے تو کم یقین کر سکتا ہے جو اختلافات اور تہذیبی روایات کے سبب سے پیدا ہو چکے ہیں۔ تہذیب و شائستگی کے باب میں مساوات سے اُن قوتوں کو تقویت ہو سکتی ہے جو بنگال کی آبادی کے ان دو بڑے طبقوں کے دلی اتحاد اور عملی اشتراک کا موجب ہیں۔ . . . . . ."

ایک توضیح

حضرات! مجھ سے سوال ہو سکتا ہے کہ عملی تائید اور حقیقی ہمدردی سے میری کیا مراد ہے اور کس طرح ہمارے ہندو دوست ہماری تعلیمی تحریک میں ہماری مدد فرما سکتے ہیں؟ اس جلسے کی تقریر میں پورے طور پر اس کا جواب دینا ممکن نہیں ہے لیکن صرف مثال کے طور پر میں چند واقعات پیش کر سکتا ہوں۔ سنہ ۱۸۸۲ء کے کمیشن سے لے کر کلکتہ یونیورسٹی کمیشن تک ہر کمیشن اور ہر کمیٹی کا یہ فیصلہ رہا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے "خاص بندوبست" کی ضرورت ہے۔ خاص بندوبست کے معنی ہیں مختلف پراونشیل گورنمنٹوں کے بجٹ کے اندر "خاص منظوری" اور خاص منظوری منحصر ہے مجالس (اکثریت) کی خواہش پر۔ پھر مختلف یونیورسٹیوں کی سینیٹوں اور سنڈیکیٹوں میں مسلمانوں کی نیابت ہی جس کا انحصار ہے ہندو ممبران سینیٹ و سنڈیکیٹ کے ووٹوں پر جن کی ہر صوبہ کی ہر سرکاری یونیورسٹی میں اکثریت ہے مختلف تعلیمی محکموں میں مسلمان استادوں اور افسروں کی نسبت ان دونوں قوموں کے مابین ایک مختلف فیہ مسئلہ رہی ہے۔ تاہم اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں ہونا چاہئے۔ مسلمان طالب علم کہاں تک سرکاری وظائف حاصل کر سکتے ہیں اور اُن میں سے کتنے سرکاری کالجوں اسکولوں اور دوسری تعلیم گاہوں میں (فیس دے کر یا بلا فیس) داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک ایسا سوال ہے جس نے سالہائے حال میں خاص اہمیت حاصل کر لی ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر ان جملہ معاملات میں ہندو دوستوں کی تائید و ہمدردی حقیقی و عملی ہو تو مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں وہ مادی امداد دے سکتے ہیں۔

حضرات! اس مسئلہ کی نزاکت و دشواری پر مجھے کامل عبور ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس

ملک کی آج واقعی جو حالت ہے اُس کے لحاظ سے آپ اس قسم کی پاک خواہشات اور جذبات کو خوابہائے پریشاں سے تعبیر کریں گے۔ شاید آپ ہی راستی پر ہوں لیکن ہمارے سامنے آج کیا کوئی بھی ایسا اعلےٰ مطمحِ نظر یا حقیقی شریفانہ جذبہ ہے جس میں خواب یا حتیٰ کہ سراب کا شائبہ نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ مادرِ ہند کا مسئلہ ہی فی نفسہ اُن اہمات المسائل میں سے ہے جن سے کبھی نبی البشر کو دوچار ہونا پڑا تھا اور اس میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے عقلیں سراسر چرخ ہیں۔ برٹش اور ہندوستانیوں کے مابین جو تنقیحات حائل ہیں۔ اُن کے فیصلہ سے ہمارے مسئلہ کا ایک جزو حل ہو سکتا ہے۔ مع ہذا ہندو اکثریت اور مسلم قلت کے مابین جو تنقیح ہے اس کا حل ہونا بھی بجائے خود ناگزیر ہے اور چوں کہ مقدم الذکر کا حل کلیتاً منحصر ہے مؤخرالذکر کے حل پر، لہذا جانبین کے اہم ترین فوائد کا اقتضا یہ ہے کہ ان دونوں کے حل میں فریقین کی جانب سے بعجلت ممکنہ بہترین وسائل عمل میں آئیں۔

علی گڑھ تحریک

لیکن اے حضرات مجھے یقین ہے کہ اس عام مسئلہ کے حل میں جو ہم بہتر سے بہتر حصہ لے سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ مادرِ ہند کے مسلم فرزند ہونے کی حیثیت سے اُس کی خدمت میں ہم کو جس درجہ حصہ لینا چاہیئے اس کے لئے اپنے آپ کو نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کریں۔ باور کیجئے کہ گورنمنٹ یا ہندو اکثریت نہ یہ کر سکتی ہے نہ کبھی کرے گی کہ ہماری حقیقی ضروریات کو پورا کرے جب تک کہ ہم خود اس کے قابل نہ ہوں کہ اب یا آئندہ اپنے حقوق کو طلب، حاصل اور محفوظ کر سکیں۔ یہی وہ یقین تھا جس نے ۱۸۷۰ء میں سرسید کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی کو مسلمانوں کے احیا میں صرف کریں اور اسی مقصد وحید کو پیش نظر رکھ کر اس زمانہ میں اُنھوں نے علی گڑھ میں تعلیمی تحریک شروع کی۔ اجازت دیجئے کہ مختصر الفاظ میں میں اُس تحریک کے چند ابتدائی اصول اور کچھ نمایاں خصوصیات عرض کروں جو علی گڑھ موومنٹ (علی گڑھ کی تحریک) کے نام سے شہرۂ آفاق ہے اس سے پھر مجھے اس نصب العین کی طرف عود کرنا پڑتا ہے جو اسلام نے اپنے پیرووں اور نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارا مقصد حیات یہ ہے کہ خدا کی زمین پر اُس کا نائب و خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہم اپنا فرض انجام دیں، اور خدا کی دنیا کو مزین و مالا مال کرنے کے لئے اپنی بہترین قوتوں کو برسر کار لائیں۔ اس تعلق و اصول کو ہندوستان کے حالات و واقعات پر منطبق کر کے بحیثیت سچے مسلمان کے ہمارے فرائض کا یہ اہم جزو ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ہمارے امکان میں ہو اپنی مادرِ وطن کے درجے اور اثر کو بلند سے بلند تر کرنے کی

کوشش کریں۔ موجودہ حالات میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حصول سوراج ہمارے ملک کے سامنے بلند ترین
نصب العین ہے۔ لہذا اس مقصد عظیم کے حصول میں اپنی مساعی کا پورا حصہ شامل
کرنا مسلمانان ہند کا ایک نہایت اہم مقصد ہونا چاہیے۔ پس ہماری تعلیم بھی ایسے اسلوب پر چلنی چاہیئے
کہ ہم ایسے لوگ پیدا کرسکیں جن کے اندر وہ اوصاف موجود ہوں جو ایسی مہمات عظیمہ کو کامیابی کے ساتھ
سر کرنے کے لئے درکار ہیں۔

لیکن اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں کامل طور سے واضح کردینا چاہتا ہوں اس
موقع پر مجھے کسی ایسی سیاسی جدوجہد یا پروپگنڈے سے سروکار نہیں ہے جو اُن مراعات اور حقوق و
فوائد کے طلب یا حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو جنھیں حصول سوراج کے لئے لابُد سمجھا جائے۔
اپنی تعلیمی پروگرام پر بحث و گفتگو کے وقت سوراج سے میری مراد ہے کہ خود قوم کے اندر وہ روحانی
ذہنی، اخلاقی، اور جسمانی قابلیت اور اہلیت پیدا ہو اور ترقی کرے جو حقیقی کامیابی کے لئے لازم ہے
اور یہی وہ اوصاف ہیں جن سے سوراج حاصل ہو کر اُس کے دوام و استحکام کی ضمانت ہو سکتی ہے۔
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوراج کے حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کے طریقے ہیں (۱) ضبط نفس
(۲) تربیت ذہنی (۳) قوی اخلاق (۴) قوت جسمانی اور انھیں سب کی ترقی و آمیزش سے کوئی
عمدہ تعلیمی انسٹی ٹیوشن قایم ہو سکتی اور جاری رہ سکتی ہے۔

اسی قسم کے وہ خیالات اور عقاید تھے جن کی بنا پر سرسید نے اپنی قوم کی تعلیم کا ڈول ڈالا۔

حضرات! جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں سرسید کی ساری زندگی ملک و ملت کی خدمت
میں صرف ہوئی۔ چوں کہ قحط الرجال قومی اضمحلال کی سب سے خطرناک علامت تھی، لہذا سرسید
کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ ایسے لوگ کافی تعداد میں موجود ہو جائیں جو اصول و عمل کے میدان میں
رہبری کا کام دے سکیں۔ ملت و ملک کو سچے پیرووں اور قابل وطن دوست شہریوں کی ضرورت تھی
جو اعلیٰ ترین تربیت اور قوی ترین اخلاق سے بخوبی آراستہ ہوں اسی غرض کے حصول کے لئے
انھوں نے ۱۸۷۵ء میں اُس تعلیم گاہ کی بنیاد رکھی ہے جس کا نام اب مسلم یونیورسٹی ہے اور جو اُن کی
ملک و ملت کے چوٹی کی خدمات میں شمار ہو سکتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی غایت بناء

حضرات! اس تعلیم گاہ کی تعریف اور اس کا کام اس درجہ مشہور عام ہے کہ اس کے اعادہ

کی ضرورت نہیں۔ مختصراً اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ "سچائی، خوبی و خوش نمائی" کا مادہ ایسے طریقے سے پیدا کیا جائے جس میں (بانی کی رائے کے مطابق) مشرقی و مغربی شائستگی کے تمام اصل شامل ہوں یہ ہندوستان میں پہلی تعلیم گاہ تھی جہاں فاضل مولوی اور آکسفورڈ اور کیمبرج کے ممتاز عالم ایک احاطہ میں بانی کے ذاتی اثر اور نگرانی کے ماتحت یک جا رہ کر ہندوستانی مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے۔ سرسید کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے رفقاء میں سے حالی محسن الملک اور شبلی کی مشرقی علمیت ایک طرف، اور بک مارین اور آرنلڈ جیسے ہمدرد و فراخ دل انگریزوں کی تربیت و اخلاقیت دوسری طرف، ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے وہ اثر و ماحول پیدا کر دیا تھا جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ کل مسلم ایشیا میں بے نظیر تھا اور جس سے مسلمان نوجوانوں کے اندر اعلیٰ اور شریفانہ نصب العین کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور ایسی عادات حیات قائم ہو گئی تھیں جن کے اندر مستعدی کے ساتھ اثر اندازی بھی تھی۔ سب سے پہلا سبق جو سرسید کی زندگی اور اُن کے اثر نے ہمیں سکھایا یہ تھا کہ خدا اور انسان کے ساتھ اپنے ہر قسم کے تعلقات میں ہم سچائی پر پورے طور سے کاربند رہیں۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ ہم خدا کے خیر خواہ ہوں اس لئے کہ وہ خلاق مطلق اور ہر شئے کا علت العلل ہے، اپنے مذہب کے خیر خواہ ہوں اس لئے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اپنے بادشاہ کے خیر خواہ ہوں جس کے سایہ میں ہم نہ صرف مامون و مصئون ہیں بلکہ مذہب کے لحاظ سے ہمیں خیال و عمل کی کامل آزادی حاصل ہے، ہم مادر وطن کے وفادار ہوں جس کی فرزندی و شہریت وہ حق ہے جس پر اس ملک کے اندر ہمارے سیاسی درجے اور حقوق کے دعوے کی بنیاد قایم ہو سکتی ہے، اپنی قوم کے خیر خواہ ہوں جس کی تربیت ہماری اسلامی اخوت کی بنیاد ہے اور جس کی ترقی پر خود ہماری منزلت و رفاہیت منحصر ہے۔ کل نوع انسان کے خیر خواہ ہوں جس کی خدمت ہی وہ اعلیٰ ترین نصب العین ہے جو اسلام نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ درحقیقت سرسید کی عین خواہش یہ تھی کہ ہمارے اخلاق کے اندر منافقت کا شائبہ تک باقی نہ رہے جو اسلام کے نزدیک گناہ عظیم ہے اور جس کی سرسید کے دستور حیات میں کوئی جگہ نہ تھی۔ سرسید نے سب سے پہلا اصول جو ہمارے ذہن نشین کیا وہ ہر صورت و حالت میں سچائی کی پیروی کرنا تھا۔

دوسرا اہم سبق جو سرسید کا طریقہ کار ہمیں سکھاتا تھا وہ نیکی کا اصول تھا جو ہم جنسوں کی خدمت میں مضمر ہے۔ جو تعلیم ہمیں دی جاتی تھی اور رزیڈنشل سسٹم (نظام اقامت)، جو اُس وقت ہندوستان کے اندر اس تعلیم گاہ کی ایک خصوصیت خاصہ تھا ان سب کی غرض و غایت یہی تھی کہ ایسے اخلاق و عادات

مستحکم ہوں جو ملک و قوم کی خدمت کے لئے ہمیں بطریق احسن تیار کر سکیں۔
میں اس موقعہ پر اس تعلیم گاہ کے اصول و مقاصد کی نسبت کچھ اور زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ اس کا وجود ماشاء اللہ تقریباً نصف صدی سے قایم ہے۔ اب وقت ہے کہ تعلیم گاہ کے کام اور کارگزاریوں کا پورا اور صحیح جائزہ لیا جائے جو میں انشاء اللہ کسی اور وقت کروں گا۔ تاہم اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہماری قوم میں جدید روح حیات پیدا اور بیدار کرنے میں اور اپنے وطن کی قابل یادگار خدمات میں حصہ لینے میں جو کام اس تعلیم گاہ نے انجام دیا ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس موقع پر تصویر کا روشن پہلو پیش کرنا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ صرف میں تاریک پہلو کو پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

علی گڑھ کی تحریک کا تاریک پہلو

حضرات! باوجود یکہ میں علی گڑھ کی تحریک کا دل دادہ اور قوم و ملک کے لئے جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا مداح ہوں، تاہم اس کی ضروری خوبیوں کا احساس اور اس کی آئندہ کامیابی کی خواہش یہ جذبات مجھے مجبور کرتے ہیں کہ اس کے اثر کے اس پہلو کو بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں جس سے بجائے فائدے کے نقصان زیادہ پہنچا ہے اور جس کے جائزہ اور اصلاح کی فوری اور اشد احتیاج ہے۔ اپنے بیان کو پورے طور پر واضح کرنے کے لئے مجھے آپ کو عبدیت و نیابت الٰہی کے اصول کو پھر یاد دلانا چاہئے۔ جو میری رائے میں کسی اسلامی تعلیم گاہ کی کامیابی اور ناکامی کی جانچ کا بہترین ذریعہ ہیں۔ میرے نزدیک اگر واقعی نتائج کی روشنی میں دیکھا جائے تو عبدیت کا عنصر اس تعلیم گاہ کے پیداوار کی زندگی اور اخلاق میں (جن میں سب سے پہلے میں اپنے آپ کو شامل کرتا ہوں)، کماحقہٗ نہیں ہے۔ مسرفانہ انگریزی طرز معاشرت اختیار کر کے ہم نے یورپین تہذیب و تمدن کا وہ حصہ انتخاب کیا ہے جو مطلق ضروری نہیں ہے بلکہ اس سے حظ نفس کی کمزوری کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں تقویت حاصل ہوتی ہے۔

حضرات! فضول خرچی کی عادت ہماری قومی بد اخلاقی کی پہلے بھی حد سے زیادہ ناگوار خصوصیت تھی، لیکن اس کی موجودہ شکل سراسر تباہ کن ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے وقت، توجہ اور آمدنی کا اتنا بڑا حصہ ایسے مذاق اور عادات کے نذر ہو جاتا ہے جن کو ضرورت ہے۔ بڑے بڑے مکانوں کی، بیش قیمت سامانوں کی، وضعدار لباسوں کی، پر تکلف کھانوں کی، پارٹیوں اور تفریحوں اور زمانہ حال کی دیگر فضول خرچیوں کی۔ ان سب کو ضروریات زندگی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کمالات کے لئے

کیا رہ سکتا ہے جن کے بغیر اس زمین پر ہم نائب اللہ کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے۔ میں اکثر خیال کیا کرتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کی زندگی میں ایک خصوصیت جو مسلمانان ہندوستان کی نہایت خاص توجہ کی محتاج ہے ان کی کسرِ نفسی، سادگی، کم خرچی زندگی اور اپنی ذات کے متعلق تمام باتوں میں بے لوث طبیعت ہے۔ ان کی زندگی اس لحاظ سے عبدیت کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ میں گاندھی کیپ اور کھدر کوٹ پہننے کے فیشن کو بہت تھوڑی اہمیت دیتا ہوں، کیوں کہ اس لباس میں بھی انسان نہایت اسراف اور عیش پرستی کی زندگی بسر کر سکتا ہے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر روحانی، خودداری و رواداری کا جذبہ پیدا ہو جائے جو بیرونی نمود و نمائش سے حظ نہیں حاصل کرتا بلکہ ایثار اور خدمت خلق سے مسرت یاب ہوتا ہے۔ مہربانی کر کے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیئے۔ میں رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ ہم کو تمام اُن لطائف و لذائذ سے بہرہ یاب ہونا چاہیے جو جسمانی صحت اور قوت کو بخوبی قائم رکھیں۔ کیوں کہ بغیر اس کے ہم نیابت کا فرض ادا نہیں کر سکتے لیکن ہمیں کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنی خوراک اور جملہ ضروریات حیات سے تمام غیر ضروری چیزیں نکال ڈالیں۔

شدھی اور سنگھٹن

حضرات! میں نے اس ذرا نازک مسئلہ کے چھیڑنے کی جرأت کی ہے کیوں کہ اس کا اثر ہماری قوم کی عام قابلیت پر بہت کچھ پڑتا ہے جس کو اس ملک کے اندر بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا ہے۔ فلہذا ضرورت ہے کہ ہمارے پاس ایسے لوگ ہوں جو جسمانی برداشت اور ایثار نفس کے موثر اسلحہ سے مسلح ہوں جن کے بغیر کوئی مقصدِ عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہماری حالت بحیثیت مسلمان اور بحیثیت باشندگان ملک یہ ہے کہ ہم ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور اگر ہمیں سلامت رہنا اور کامیاب ہونا ہے تو اس کے لئے اعلیٰ ترین طاقتوں اور بہترین کوششوں کی ضرورت ہے۔ وہ قوتیں اور خطرات جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ ایسی ہیں جیسے شدھی اور سنگھٹن اور اس پر طرہ یہ کہ ہم ایک غریب پس ماندہ اور غیر منتظم میناریٹی (قلیل التعداد جماعت) ہیں جب تک ہندو مسلمانوں میں حقیقی اتحاد نہ ہو۔ یہ تمام واقعات کمزور فریق کے لئے نہایت سنگین خطرہ رہیں گے۔

حضرات! ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے مسئلہ کا ایک سے زیادہ مرتبہ تذکرہ کر چکا ہوں اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ سر سید پہلے ہندوستانی لیڈر تھے جنھوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا لیکن اُنھیں یہ بھی یقین تھا کہ جب تک مسلمان غریب اور جاہل ہونے کی وجہ سے مساوات کو طلب و حاصل

نہ کر سکیں گے اس قسم کا اتحاد ہرگز قایم نہیں ہو سکے گا حقیقی اتحاد دو بھائیوں تک میں قایم نہیں رہ سکتا اگر اُن میں سے ایک قوی، مالدار اور کامران اور دوسرا کم زور، غریب اور مفلوک ہو۔ کیوں کہ ایک طرف نفرت ہو گی اور دوسری طرف حسد اور جب کہ اخلاقی، مادّی اور سیاسی حالات میں اس قسم کے مذہبی نزاعات سے (جیسے کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں ہیں) اور زیادہ نفاق پیدا ہو جائے تو اس حالت کی سنگینی ظاہر ہے۔ لیکن میں اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جو اس قسم کی رکاوٹوں سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ کیوں کہ فطرت انسانی کی آخری راستی اور صداقت کے ساتھ امید سے میں کبھی دست بردار نہیں ہوتا۔ ایک وقت آئے گا جب کہ یہ دونوں قومیں ضروری اور غیر ضروری کے درمیان تمیز کرنے میں کامیاب ہوں گی۔ اور اُن کے اقوال و اعمال کا مدار عقل و انسانیت پر ہوگا۔ اور یہ سب اس پر منحصر ہے کہ اُس کشمکش میں ہم اپنا کام کیسا انجام دیتے ہیں جو اس وقت تک برابر جاری رہے گی جب تک ہندوستان کا مسئلہ آخری طور پر حل نہ ہو جائے۔

حضرات! آپ کو مجھ سے یہ دریافت کرنے کا حق ہے کہ ہمارا کام کیا ہے اور ہم اسے کس طرح انجام دیں گے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کی نسبت مجھے شک ہے کہ آیا کوئی بھی زندہ شخص ایسا ہے جو اس کا صفائی کے ساتھ جواب دے سکے، اور درحقیقت مجھ میں بھی یہ قابلیت نہیں ہے کہ میں بھی اس کا جواب امید کے مطابق دے سکوں لیکن میں آپ کو پیشتر بتا چکا ہوں اسلام اور مادر وطن کی خدمت ہمارے پروگرام کا مقدم ترین جزو ہونا چاہیئے۔ بیرونی حملوں سے مذہب کی حفاظت مسلمانانِ ہند کی اخلاقی اور مادی اصلاح کی مجمعہ کوششیں پہلے عنوان کی ذیل میں آتی ہیں۔ سوراج کے لئے ایمان داری کے ساتھ مسلسل کوشش کرنا اور اس کے ساتھ ہی اپنے خاص حقوق کی حفاظت کرنا یہ دوسرے عنوان کا متن ہے۔

ہمیں جو کام کرنا ہے اس کے یہ اہم پہلو ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کس طرح انجام پائے جس قدر اختصار کے ساتھ ممکن ہوگا۔ میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

کامیابی کی شرطِ اوّل

حضرات! ہمارا پروگرام خواہ کچھ ہی ہو اور خواہ کسی قسم کے قومی فوائد کی نگہداشت مدنظر ہو۔ کامیابی کی پہلی شرط تمام ضروریات کے لئے قابل اور موزوں اشخاص کا کافی طور پر پیدا ہونا ہے۔ فرض کیجئے

کہ ہمیں شدھی جیسے بیرونی حملوں سے اپنے مذہب کی مدافعت کرنی پڑے تو کیا ہمارا آلۂ مدافعت کم از کم اتنا تیز اور نوک دار نہیں ہوگا جتنا کہ ہمارے مدمقابل کا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندو مشنری عموماً تعلیم یافتہ ہوتے ہیں متعدد گریجویٹ اور ایم اے پاس کردہ لوگوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ وہ نہ صرف تعلیم یافتہ اور وسیع المعلومات ہوتے ہیں بلکہ خوبیوں کے اسلحہ اور اس قسم کے عادات سے آراستہ ہوتے ہیں جیسے کہ انکسار، سادگی اور ایثار رہیں اور یہ وہ اوصاف ہیں جو کسی مذہب کی مدافعت و تبلیغ کے لئے نہایت موثر اور ناگزیر اسلحہ ہیں سینکڑوں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں نے اپنی دماغی اور جسمانی قوتیں غربا و مفلسین کی خدمت کے لئے وقف کردی ہیں۔ وہ قریہ بقریہ پھرتے ہیں، میلوں پیدل چلتے ہیں۔ زمین پر سو رہتے ہیں۔ سادہ سے سادہ جو کھانا مل جائے کھا لیتے ہیں۔ جن لوگوں کی وہ خدمت کرتے ہیں اُن سے کسی قسم کا چندہ طلب نہیں کرتے نہ اُن سے ضیافت کے خواہاں ہوتے ہیں اس طرح عوام الناس کے قلوب اپنی مٹھی میں لے کر وہ اپنا اثر قائم کر لیتے ہیں۔ فرمائیے کہ کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں جو اس میدان میں اپنے حریف کے مقابل آسکیں؟ ہمارا ایسی قوتوں سے مقابلہ ہے جو ہم سے بدرجہا بہتر روحانی، ذہنی، اخلاقی و جسمانی آلات و اسلحہ سے مسلح ہیں۔ یہ کوئی ایسی کش مکش نہیں ہے جو ایک دو دن یا سال دو سال یا نسل د و نسل رہے، نہیں بلکہ وہ ہمیشہ جاری رہے گی (اور اس کا خدا کو علم ہے کہ کب تک جاری رہے گی)، اب وقت آگیا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام اس طرح قائم ہو کہ ایسے شائستہ اور قابل لوگ پیدا ہو سکیں جن کے اندر اصلی مبلغین کا جوش و جذبہ ہو اور اُن کو اس کی پروا نہ ہو کہ زندگی میں ان کا کیا درجہ و حصہ ہے اسلام میں مذہبی پیشواؤں یا پیشہ ور مبلغین کا کوئی طبقہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں ضرورت ہو وہ مذہبی پیشوا یا مبلغ کا فرض ادا کر سکے۔ اور ضرورت ہے کہ ہماری نوخیز نسلیں، ہماری تعلیم گاہوں کے اندر خدمت خلق، ایثار اور جسمانی برداشت کی زندگی کے لئے تیار کی جائیں۔

ہمارا سیاسی مستقبل

اب تک اے حضرات میں نے مذہب کی مدافعت کے لئے اپنی تعلیمی ضروریات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن قدرتی طور پر آپ مجھ سے سوال کریں گے کہ اس ملک میں ہماری سیاسی حالت اور

مستقبل کی نسبت میری کیا رائے ؟ اس مسئلہ کی نسبت (جہاں تک اس کا تعلق ہمارے تعلیمی پروگرام سے ہے) مختصراً کچھ عرض کروں گا۔

حضرات! اس نہایت اہم مسئلہ کی نسبت ہمارا فیصلہ نہایت واضح ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے تین بڑے عنصر ہیں (۱) برٹش گورنمنٹ (۲) ہندو میجارٹی (۳) مسلم مینارٹی۔ اگر مسلم مینارٹی صحیح طریقۂ عمل اختیار کرنا چاہے تو اسے قطعی طور پر دوسرے دو عناصر اور ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کرلینا چاہیئے۔ سرسید اور ان کے ہم خیال لوگوں نے ہندوستان کے اندر ہمیشہ برٹش حکومت کو امن و ترقی کی ضمانت سمجھا ہے اور اس کو ہندوستانی مسئلہ کے حل کا نہایت موثر ذریعہ قرار دیا ہے اور برٹش حکومت کے ساتھ وفاداری ان کے پروگرام کا جزو لاینفک رہا ہے۔ گزشتہ چند سال کے واقعات اور تجربات اس رائے کی اصابت کا ہمیں کافی و وافی یقین دلاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک کہ واقعی قوت اور غالب عنصر پر قابو کا تعلق ہے۔ برٹش گورنمنٹ کوئی اٹل یا دائمی ہستی نہیں ہے۔ برٹش سے ہندوستانی عنصر کو حوالگی اختیارات کا عمل کم وبیش ۱۸۶۱ء سے برابر جاری ہے۔ جدید اصلاحات نے اب وہ درجہ پیدا کردیا ہے کہ سوراج جو "دلی دور" معلوم ہوتا تھا۔ اس کے نقرئی خطوط نظر آنے لگے ہیں۔ ہمیں اس واقعہ کی کامل اہمیت کو ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ سوراج (یا ہندوستان میں ذمہ دار سیلف گورنمنٹ) کا نصب العین اب نہ صرف پارلیمنٹ کے قانون میں بلکہ خود حضور ملک معظم کے اعلان میں بین طور سے داخل ہوگیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ سوراج کے مطمح نظر کو ترقی دینا اب ہر وفادار شہری کا فرض ہوا اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ میں پیشتر ہی کہہ چکا ہوں کہ مادر وطن کا فرزند اور شہری ہونے کی حیثیت سے اُن کا فرض ہے کہ اپنی زاد بوم کی امکان بھر خدمت کریں۔ پس جہاں تک حصول سوراج کا تعلق ہے یہ ہمارا فرضِ عین ہونا چاہیئے کہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ پورے طور پر شریک رہیں۔

سوراج کا نتیجہ

لیکن اب اے حضرات اس موقعہ پر پہنچ کر ہم اپنی مشکلات کی حد پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیوں کہ حصول سوراج کا مطلب یہ ہے کہ عملاً ہندو میجارٹی غالب ہوجائے حالیکہ اُن کے ساتھ ہمارے تعلقات ہنوز مضبوط سطح پر نہیں ہیں۔ اس حالت کے ساتھ ساتھ ہماری خاص ضروریات اور خاص

فوائد کا سوال پیدا ہوتا ہے جن کا حاصل کرنا اور جن کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس طرح مادرِ ہند کے فرزند ہونے کی حیثیت سے ہمارے جو اغراض ہیں اُن کے اندر ایک کشاکش پیدا ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا مسئلہ نہایت اہم اور محیر العقول بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح اس دشواری سے عہدہ برآ ہوں؟

حضرات! چوں کہ اس اہم تنقیح کا نہایت گہرا تعلق ہمارے تعلیمی مسئلہ سے ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس موقعہ پر اس پر غور کیا جائے میرے نزدیک اس مسئلہ کے حل اور اس قسم کی دشواریوں پر عبور ہی ایسی چیزیں ہیں جن سے امہات المسائل کا حقیقی وزن دریافت ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان عظیم الشان اسلامی مسائل کو جو ہر مسلمان کا ورثہ ہیں اور اپنے اندر ایک آتش گیر قوت رکھتے ہیں اور بے خطا رہبر کا کام دیتے ہیں ان کو بروئے کار لایا جائے۔ ہمیں چاہیئے کہ صداقت اور دانائی کو اپنا رہنما بنائیں اور اُن ہی کی روشنی میں ان واقعات کا مقابلہ کریں جو اس سرزمین کے اندر ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والے ہوں گے یہ واقعات کیا ہیں؟

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے اندر اعلیٰ طاقت برٹش کے ہاتھ میں ہے جو قیام امن کے نظم کے ذمہ دار ہیں اور ہماری جان و مال اور دوسرے حقوق کے محافظ ہیں۔ ان فوائد کے عوض میں جو اس طرح ہمیں حاصل ہیں ہمارا فرض ہے کہ گورنمنٹ کے وفادار رہیں جو اس حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا اس امر میں کسی قسم کا تذبذب و تزلزل نہ ہونا چاہیئے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ قانون پارلیمنٹ اور فرمان شاہی دونوں نے ہندوستان کو سوراج کے لئے تیار کرنے کا عہد دے دیا ہے جو ایسا اعلیٰ ترین نصب العین ہے جس کی کسی قوم یا ملک کو آرزو ہو سکتی ہے۔ اصول نیابت کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کا ہر مسلم فرزند اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے سب سے بڑا وطن دوست ثابت ہو، کیوں کہ صرف ہندوستان کا فرزند ہونے کی حیثیت ہی سے ہم اس ملک کے اندر جائز طور سے شہریت کے کسی حق کا دعوے کر سکتے ہیں۔ جو حقوق اور فوائد اس وقت ہم کو حاصل ہیں یا جو آئندہ حاصل ہوں اُن کے عوض میں ہمارا فرض یہ ہے کہ مادرِ وطن کے وفادار رہیں لہٰذا اس امر میں کسی قسم کا تذبذب و تزلزل نہ ہونا چاہیئے۔

تیسری حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں سوراج کی طرف بڑھنے یا اُس کے حاصل ہونے کے معنی عملاً یہ ہیں کہ مزید قوت ہندو میجارٹی کو حاصل ہو جائے جس پر مسلم مینارٹی کو اعتماد نہیں ہے (کیوں کہ اس کے خاص فوائد اس طرح خطرہ میں پڑتے ہیں)، انجام کار جو اتحاد ہونا ہے نیز

اپنے قومی مستقبل کی حفاظت کے لئے یہ بسا ضروری ہے کہ اپنے خاص فوائد کی حفاظت کے لئے ہمارا ایک جدا قومی نظام و پروگرام ہو۔ یہ نہایت اہم مسئلہ ہے ہمیں چاہئے کہ محض توہمات کی بلند پروازیوں میں اس ملک کے اندر اپنی آئندہ حالت کی حقیقت سے چشم پوشی نہ کریں۔ جہاں تک سوراج کے آئینی اصول پر اور آئینی طریقوں سے حاصل ہونے کا تعلق ہے ہمیں اپنے ہم وطنوں پر کامل اعتماد رکھنا چاہئے مگر جہاں تک اپنے خاص فوائد کا تعلق ہے اُن کی حفاظت کے لئے ہمیں خود اپنے مساعی و نظام پر اعتماد کرنا چاہئے۔ لہٰذا اس امر میں کسی قسم کا تذبذب و تزلزل نہ ہونا چاہئے۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا سیاسی مستقبل، کونسلوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں اور مختلف سرکاری صیغوں اور محکموں میں ڈھالا جا رہا ہے۔ جہاں رعایا کے خاص و عام حقوق اور ضروریات کی نسبت غور اور فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ایسے بہت سے میدان ہیں جہاں قوموں اور فرقوں کی لڑائیاں لڑی اور جیتی جاتی ہیں۔ یہ ایسے ہی مواقع ہیں جہاں عام و خاص حقوق کے درمیان ہمیں تمیز کرنی چاہئے، اور ان مقامات پر جو مسلمان قائم مقام ہیں اُن کے اتحاد، قابلیت، ہمت اور آزادی پر ہمارا سیاسی مستقبل خاص کر منحصر ہے۔ مسلمان مینارٹی کی آواز اور رائے میں اثر اور احترام پیدا کرنے کے لئے یہ قطعاً ضروری ہے کہ وہ مسلمان قائم مقام جو کونسلوں اور پبلک جماعتوں میں ایک مشترک قومی پالیسی اختیار کریں جو کسی ایسے اصول پر ہو جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں۔ لہٰذا اس امر میں کسی قسم کا تذبذب و تزلزل نہ ہونا چاہئے

پانچویں حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں اور اس ملک میں محض گاؤ زوری بالکل فضول اور بیکار ہے۔ صرف شائستگی اور اخلاق، نظام اور ترتیب ہی وہ چیزیں ہیں جو قوموں اور افراد کے لئے اصلی قوت اور پختگی کا ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ خواہ مادر وطن کی خدمت ہو یا اپنی قوم کی، اس قسم کے آلات کی حد درجہ ضرورت ہے۔ محض شور و غل مچانے یا گالی کوسنے دینے یا شکوے گلے کرنے یا انتہا یہ کہ لیا ڈنڈی یا جسمانی قوت سے بھی کچھ کام نہیں چل سکتا۔ صرف آئینی طریقے ہی ناگزیر اور موثر ذرائع کامیابی کے ہو سکتے ہیں لہٰذا اس امر میں کسی قسم کا تذبذب و تزلزل نہ ہونا چاہئے۔

چھٹی حقیقت یہ ہے کہ صرف صحیح قسم کی تعلیم اور ایسی ترتیب اور تنظیم کے ساتھ جو ہماری حالت اور ضرورت کے عین مناسب حال ہو، ہماری قوم ان آلات سے مسلح ہو سکتی ہے اور وہ قابلیتیں حاصل کر سکتی ہے جو اُسے اس عظیم الشان آزمایش میں کامیاب کر سکتی ہیں۔ لہٰذا اس امر میں کسی قسم کا تذبذب و تزلزل نہ ہونا چاہئے۔

خاتمہ

حضرات جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے اس سے اصل تنقیح کی نوعیت ظاہر ہے اور اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ ہمارے مسئلہ کا اہم حصہ تعلیمی ہے جس پر ہمیں اپنی تمام تر قوت اور توجہ صرف کرنی چاہیئے۔ خطرۂ عظیم میں مبتلا ہوئے بغیر مثل گزشتہ چند سال کے ہم نہ اس سے تغافل کر سکتے ہیں۔ نہ چشم پوشی کر سکتے ہیں خواہ کوئی مصیبت آئے اور خواہ کیسا ہی نازک زمانہ ہو ہمارے تعلیمی پروگرام میں کوئی خلل نہ واقع ہونا چاہیئے۔ کیا گزشتہ جنگ سے زیادہ برٹش قوم اور برٹش سلطنت کے لئے کوئی اور نازک زمانہ آسکتا تھا جب کہ خود اس کا وجود معرض خطر میں تھا اور جب کہ ہر قابل خدمت مرد یا عورت نے اپنی زندگی کو اپنے وطن کی حفاظت اور عزت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ وہ پہلے سے بھی دنیا کی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ قوم تھے اور اس خوفناک جنگ کے زمانہ میں ان پر مصارف کا بے انتہا بار پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے ۱۹۱۸ء کا ایجوکیشن ایکٹ پیش اور پاس کیا اور اسی نازک زمانہ میں کروروں روپیہ کا صرف تعلیم کے لئے منظور کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندہ قومیں مہمات امور کو کس نظر سے دیکھتی ہیں اور اصلی کام کی باتوں کے لئے وہ کیا کچھ قیمت دینے کے لئے تیار ہو جاتیں۔

حضرات! آخر میں چند الفاظ میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اپنی تعلیمی تحریک کے اسلامی پہلو سے میری کیا مراد ہے اگر ہم اسلام کی اصلی آزادی اور روح کو پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں داور ہمیں ضرور زندہ کرنا چاہیئے)، تو ہمیں صرف خارجی نتائج کو نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ خصوصیت کے ساتھ معاملہ کی تہ کو پہونچنا اور اس کے اصول پر نظر کرنا چاہیئے۔ مکاتب اسکول کالج، یونیورسٹیاں، امتحانات اور ڈگریاں وغیرہ وغیرہ یہ سب ضروری ہیں لیکن ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ زندہ جسم کے لئے خارجی لباس تعلیم کی اصلی زندگی اور روح ہمارے فارغ التحصیل ہم قوموں کی تربیت اور اُن کے اخلاق ہیں۔ جس طرح ایک سمجھدار کسان پودے کی موٹائی یا بلندی کو نہیں دیکھتا بلکہ پھل کی مقدار اور نوعیت کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے گریجویٹوں کی تعداد یا اُن کی ڈگریوں پر اتنی توجہ نہیں کرتی چاہیئے جتنی کہ اُن کی تربیت واخلاق کی نوعیت پر۔ ہمیں ان کے علم اور شائستگی، صداقت، حب الوطنی، ہمت، صفائی قلب وجسم وزبان، صداقت پسندی، اعتدال، ایثار، کمزوروں کے ساتھ لینت اور متکبروں کے مقابلہ میں غلظت، جسمانی برداشت کی قوت، عملی قابلیت غیر متزلزل دجلوت وخلوت کی) دیانت،

حسنِ قدرت کا ذوق، ان سب باتوں کو بامعان نظر دیکھنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری حقیقی غرض و غایت یہ ہونی چاہیئے کہ ہماری تعلیم گاہوں کے ثمرات نے ہماری عبدیت و نیابت کے ذخیرہ میں کس قدر اضافہ کیا ہے۔

حضرات! میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے اس خطبہ کو نہایت صبر اور تلطف آمیز توجہ کے ساتھ سنا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

اجلاس سی و ہفتم

(منعقدہ بمبئی ۱۹۲۴ء)

صدر عالیجناب آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ بالقابہ

حالات صدر

نوٹ - ممدوح کے حالات اجلاس ۱۹۱۸ء منعقدہ سورت جلد ہذا میں درج ہیں۔

خطبۂ صدارت

حضرات! سب سے پہلے میں اُس بڑی عزت کے واسطے جو آپ نے دوسری بار مجھ کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا پریسیڈنٹ بنانے سے دی ہے اظہار تشکر اور ممنونیت کرتا ہوں۔ اوّل ۱۹۱۸ء کے اجلاس کانفرنس منعقدہ سورت میں مجھ کو صدارت کی عزت دی گئی تھی اور وہ اجلاس اس کے کارکنوں کی اَن تھک کوششوں سے بہت کامیاب ثابت ہوا تھا۔ اب یہ دوسرا موقعہ ہے کہ وہی عزت مجھ کو پھر دی گئی ہے۔ کاش مجھ سے بہتر شخص اس کام کے واسطے منتخب ہوتا۔ جو ذمہ داری کا منصب کہ آپ صاحبوں نے عطا کیا ہے مجھ کو اُس کے قبول کرنے میں بہت تامل تھا مگر میں نے اُس کو اپنا فرض سمجھ کر قبول کر لیا ہے مجھ کو اس فرض کی اہمیت کا پورا احساس ہے جو آپ نے میرے متعلق کیا ہے اور میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے مقدور بھر مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے باب میں اس مشہور و معروف کانفرنس کے مباحث کی رہنمائی کروں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس منصب کو ایک فرض سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ اس قوم کے اغراض و مقاصد کے لئے اس قدر ضروری اور اہم ہے کہ جب کسی مسلمان سے

اس کام میں مدد مانگی جائے جو اس کانفرنس کا مقصد ہو لیں ہے تو یہ اس کا فرض عین ہے کہ خوشی سے مدد کے واسطے تیار ہو جائے۔ میں نے منصب صدارت کو اسی احساس کے ساتھ قبول کیا ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس کانفرنس کے کام کو کامیابی کے ساتھ انجام کو پہنچانے کے لئے پوری مدد دیں گے اور اعانت کریں گے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت اہم اور ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ صاحبوں کو یقین دلانے کے واسطے دلائل کی حاجت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم پھیلانے کے واسطے پوری قوت کے ساتھ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان نے بہت سی باتوں میں ایک وسیع پیمانہ پر کارروائی شروع کی ہے اس لئے تعلیم یافتہ کام کرنے والوں کی ضرورت برابر بڑھتی جائے گی۔ اگر مسلمان ان کارروائیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں اور وہ اس ملک کی مسلسل ترقی میں شرکت کر کے اپنے آپ کو کارآمد باشندہ ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اُن کو اعلیٰ درجہ کی کوشش سے اپنے آپ کو اس مرتبہ حاصل کرنے کے قابل بنانا چاہیے جس کے وہ اس ملک میں اپنی اہمیت کی وجہ سے مستحق ہیں۔ اس مسئلہ پر مجھ کو زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ مجھ کو یقین ہے کہ اُن رایوں میں جن کے اظہار کی میں نے کوشش کی ہے آپ صاحبان میں سے ہر شخص کو میرے ساتھ اتفاق ہے۔ خواہ ہم کو کتنی ہی مشکلات پیش آئیں تعلیمی ترقی کے باب میں ہمارا موٹو یہ ہونا چاہیے کہ مستعد ہوں کمرہمت باندھیں اور اُن مشکلات پر غالب آئیں جیسا کہ ہماری ہمسایہ اقوام نے کیا ہے۔

تعلیمی کانفرنسیں ضروری ہیں میں نے حال میں بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس قسم کی تعلیمی کانفرنسوں کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہمارے معترضین محسوس کرتے ہیں کہ اس کانفرنس نے کامیابی کے ساتھ اس مقصد کو پورا کر لیا ہے جس کے واسطے وہ قائم ہوئی تھی اور قوم کو تعلیمی لحاظ سے اُس کی ضرورتوں اور طلبہ ادیوں کی حد تک پہنچا دیا ہے اور اس وسیع براعظم کے مختلف حصص میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے واسطے مقامی انجمنیں قایم ہو گئی ہیں اور اس میں یہ سب انجمنیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے واسطے قابلیت، گرمجوشی اور دل سے کام کر رہی ہیں اُس حالت میں شاید اس قسم کی نکتہ چینی بے موقعہ نہ ہو گی مگر جب کہ حقیقت حال یہ نہیں ہے اور مسلمانوں کی قوم زیادہ تر غیر منتظم ہے اور ابھی تک تعلیم میں بہت پیچھے ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس ملک کے مختلف مرکزوں میں اس قسم کی کانفرنسوں کی ضرورت ہے ہم کو بہت کچھ تلافی مافات کرنی ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے سخت کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ اعتراض کسی قدر بجا ہو گا اگر یہ کانفرنس تقریروں اور رزولیوشنوں کے بعد اپنے کام کو ختم کر دے اور کوئی عملی کارروائی نہ کرے۔ نتائج حاصل

کرنے کے لئے سال بھر تک مستقل اور مسلسل کام کرنے کی ضرورت ہے اور اس کانفرنس کا مقصد اسی قسم کی عملی کارروائی کی تحریک کرنا ہے فقط رزولیوشن پاس کرنا نہیں ہے۔ اس قسم کی کانفرنسوں کے منظور کردہ رزولیوشن سے وہ صیغے معلوم ہوتے ہیں جن میں سب سے پہلے کارروائی کی ضرورت ہے اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ نتایج سے ثابت کریں کہ یہ کانفرنسیں اپنے عمل میں بارآور ہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ مسلمان اپنی تعلیمی ترقی میں اُس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ وہ ہر حصۂ ملک میں منتظم ہیں اور اُنھوں نے تعلیم میں پیچھے رہنے کے دھبے کو پورے طور سے دور کر دیا ہے۔ اس پر بھی میری رائے میں اس قسم کی کانفرنسیں ضروری ہیں۔ اگر مان لیا جائے کہ ترقی تعلیم کی تحریک کی جو اس کانفرنس کے مقاصد میں سے ایک ہے اب ضرورت نہیں ہے پھر بھی یہ بات لازمی ہے کہ اس ملک کے مختلف حصص کے بڑے بڑے ماہرین فن تعلیم سال میں کم از کم ایک مرتبہ تبادلۂ خیالات اور تجربات کی غرض سے جمع ہوں تاکہ مختلف تعلیم و تربیت یافتہ دماغوں کے فوائد جو ہندوستان کے مختلف مرکزوں میں کام کر رہے ہیں زیادہ قابل اطمینان ترقی کے واسطے حاصل ہو سکیں۔

صوبہ بمبئی میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت اس موقعہ پر میں ایک بیان کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو حال میں ایک ذمہ دار با اختیار شخص نے کیا ہے کہ مسلمان صوبہ بمبئی میں تعلیمی نقطۂ نظر سے پس ماندہ نہیں سمجھے جا سکتے۔ میں یقین کرتا ہوں اور تم سب کو مجھ سے اتفاق ہوگا کہ اگر اس بیان کی توثیق ہو جائے تو یہ مسلمانوں کی حیرت انگیز ترقی ہوگی۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں جو ایڈریس کہ میں نے سورت کے اجلاس کانفرنس میں پڑھا تھا اُس میں مفصل اعداد سے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو بالخصوص اعلیٰ اور ثانوی تعلیم میں ثابت کیا تھا اور بتایا تھا کہ تعلیمی پستی کو دور کرنے اور اُس درجہ تک ترقی کرنے کے لیے جو ہمسایہ اقوام نے حاصل کیا ہے سخت کوششوں کی ضرورت ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہوگی کہ تین سال کی مختصر مدت میں اس صوبہ کے مسلمانوں نے تعلیمی معاملات میں ایسی غیر معمولی ترقی کی ہے اور اُن کو وہ درجہ حاصل ہو گیا ہے کہ اب وہ پس ماندہ قوم نہیں سمجھے جا سکتے۔ تعلیم میں مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ کرنے کے واسطے اس صوبہ کے شائع شدہ نقشہ جات کا مطالعہ ضروری ہے۔ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن صوبہ بمبئی کی پنج سالہ رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۱۷-۱۸ لغایتہ سنہ ۱۹۲۱-۲۲ میں سے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس مسئلہ پر بہت روشنی پڑتی ہے۔

تمام قسم کے مدارس میں مسلمان تعلیم پانے والوں کی تعداد سنہ ۱۹۱۶-۱۷ میں ۲۷ ۹ ۱۴۹ تھی اور سنہ ۱۹۲۱-۲۲ میں وہ تعداد ۱۷۱۴۸۱ ہو گئی یعنی عرصہ پانچ سال میں مسلمان تعلیم پانے والوں کی تعداد میں ۲ء۲۱ فیصدی کی اضافہ ہوا اور دیگر اقوام کے تعلیم پانے والوں کی تعداد میں اسی مدت میں ۲ء۲۷ فیصدی اضافہ ہوا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلافی مافات کرنے کے بجائے جو مسلمانوں کی تعلیم کے ہر ہی خواہ کا مقصد ہے صوبہ بمبئی میں دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان ۱٫۵ فی صدی پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہم نے ۲۱٫۲ فی صدی ترقی کی ہے مگر تلافی مافات کرنے کے بجائے ہم دوسری اقوام کے مقابلہ میں ۱½ فی صدی پیچھے رہے ہیں۔ اگر ہم سنہ ۲۳-۱۹۲۲ کے اعداد پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت ہم پیچھے ہٹے ہیں جیسا کہ ہم پیشتر بتا چکے ہیں تمام تعلیمی مدارس میں مسلمان طلبا کی تعداد سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ۱۸۱۴۱۷ تھی اور سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں وہ تعداد گھٹ کر ۱۷۸۷۵۵ ہوگئی۔ اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم نے تعلیمی پستی کے داغ کو دور کر دیا ہے بلکہ ہمارا تعلیمی درجہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں بجائے بڑھنے کے صاف طور سے کسی قدر گھٹ گیا ہے۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے صوبہ بمبئی میں سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت معلوم ہوتی ہے۔

ابتدائی تعلیم

	کل تعداد	مسلمان	فی صدی
جماعت اوّل (معصوم بچے)	۲۵۲۰۰۰	۴۷۸۰۰	۱۸٫۹
جماعت دوم	۱۲۸۰۰۰	۲۴۰۰۰	۱۸٫۷
جماعت سوم	۱۱۱۰۰۰	۱۷۳۰۰	۱۵٫۵
جماعت چہارم	۸۷۰۰۰	۱۲۹۰۰	۱۴٫۷
جماعت پنجم	۶۵۰۰۰	۱۰۲۰۰	۱۵٫۸

جماعت ہائے وسطیٰ

	کل تعداد	مسلمان	فی صدی
جماعت ششم	۴۱۰۰۰	۷۰۰۰	۱۷
جماعت ہفتم	۲۸۰۰۰	۳۸۰۰	۱۳٫۰
جماعت ہشتم	۲۵۰۰۰	۲۶۰۰	۱۰٫

جماعت ہائے اعلیٰ

جماعت نہم	۹۹۶۱	۷۹۶	۷٫۹۶
جماعت دہم	۷۶۹۹	۵۴۱	۷
جماعت یازدہم	۵۸۸۰	۴۲۰	۷

	کل تعداد	مسلمان	فی صدی
جماعت دوازدہم	۵۲۱۷	۴۲۷	۸٫۲

یونیورسٹی وانٹرمیڈیٹ

	کل تعداد	مسلمان	فی صدی
جماعت انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر	۲۲۸۲	۹۴	۴٫۱
جماعت انٹرمیڈیٹ سکنڈ ایر	۱۳۳۷	۸۱	۶٫۹
بی اے تھرڈ ایر	۶۲۶	۲۹	۴٫۶
" " فورتھ ایر	۶۹۵	۳۷	۵٫۳
ففتہ ایر	۷۹	۴	۵٫
پوسٹ گریجوایٹ سکستہ ایر	۸۴	۱	۱٫۲
" " سونتھ ایر	۴	صفر	
رسرچ اسٹوڈنٹ یعنی طلبائے تحقیقات علمی	۷	صفر	

مندرجہ بالا نقشہ سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک کہ ابتدائی تعلیم کے شروع درجوں کا تعلق ہے مسلمانوں نے خاصی ترقی کی ہے۔ صوبہ بمبئی میں مسلمانوں کی آبادی ۱۹٫۷ فی صدی ہے اور کم از کم معصوم بچوں کی جماعت کے متعلق یہ کہہ کر ہم اپنا دل خوش کر سکتے ہیں کہ ہماری تعلیم ہماری آبادی کی نسبت سے ہے لیکن جس قدر ہم اوپر جاتے ہیں ہماری نسبت گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ اعلیٰ پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں اور طلبائے تحقیقات علمی میں ہماری نسبت صفر ہے۔ اوسط فی صدی صوبہ کی کل آبادی پر نکالا گیا ہے لیکن اگر ہم ادنے ذاتوں کو جو اس صوبہ میں آباد ہیں اور تعلیم میں یقینی بہت پیچھے ہیں شمار سے خارج کر دیں تو ہماری تعلیم کا اوسط فی صدی اور بھی گھٹ جائے گا۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے مسلمانو کی تعلیمی حالت اعلیٰ اور کالیجیٹ تعلیم کے باب میں بمقابلہ عیسائیوں پارسیوں اور ہندوؤں کی اعلیٰ اقوام کے معلوم ہوگی۔

	ہندوستانی عیسائی	شریف اقوام کے ہندو	مسلمان	پارسی
آبادی	۱۲۱۵۷۸	۵۷۰۷۶۵۲	۲۱۱۵۳۳۱	۴۳۰۹۴
اعلیٰ تعلیم جماعت نہم	۳۲۲	۷۸۴۶	۷۹۶	۷۷۸
جماعت دہم	۲۶۳	۶۱۱۱	۵۴۱	۶۰۶
جماعت یازدہم	۱۱۶	۴۷۴۲	۴۲۰	۵۳۸

جماعتِ دوازدہم	١٣١	٤٠٣٩	٤٣٧	٥٨٧
یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کلاس فرسٹ ایر	١٢٦	١٧٤٥	٩٤	٣٧٠
یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کلاس سکنڈ ایر	٥٩	١٠٣٢	٨١	١٥٤
تھرڈ ایر	٣٠	٥١٩	٣٩	٥٢
فورتھ ایر	١٦	٥٦٣	٣٧	٦٨

مندرجہ بالا نقشہ کے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ بجز نیج اقوام کے دیگر ہمسایہ قوموں سے اگر ہم اپنی تعداد اور اعلیٰ اور کالیجٹ تعلیم میں اپنے درجہ کا مقابلہ کریں تو ہم کو اپنی ترقی پر مطمئن ہونے کا موقعہ نہیں ہے۔ ان اعداد اور حالات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ ہم تعلیم میں پستی کی حد سے نکل گئے ہیں اور اب ہم کو تعلیمی لحاظ سے پست نہ سمجھنا چاہیئے بالکل بے بنیاد ہے۔ اس دلیل کو غلط ثابت کرنے کے واسطے میں نے کسی قدر تکلیف اُٹھائی ہے اور اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ قوم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنا تعلیمی مرتبہ بلند کرے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آیندہ ترقی کی راہ میں گورنمنٹ اُس کی دل سے مدد کرے بہ حیثیت ایک پس ماندہ قوم کے اُس کے حقوق کسی طور سے زائل نہ ہونے چاہئیں۔ خود ہماری قوم میں ایک جماعت ہے جو بظاہر سمجھتی ہے کہ تعلیمی ترقی کے باب میں کافی کوشش ہو چکی ہے اور اب قوم کی زیادہ تر کوششیں دوسری سمتوں میں ہونی چاہئیں۔ اس غرض سے کہ تعلیمی ترقی کے باب میں قوم کی کوششوں میں کسی قسم کی کمی نہ ہو اور اس مقصد سے کہ قوم کا بہترین مفاد اسی میں ہے کہ تمام ضروری جوش اسی سمت میں جمع ہو سرکاری اعداد شمار سے اُس اصلی حالت کو صاف صاف بتانا ضروری تھا جو اعلیٰ تعلیم کے باب میں ہماری قوم نے کی ہے۔

مجھ کو یقین ہے کہ اعداد و شمار کے ذریعہ سے اس امتحان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کو یقین ہو جائے گا ثانوی اور اعلےٰ تعلیم کے تمام شعبوں میں ہر طرف سے اور زیادہ سخت کوششوں کی بہت ضرورت ہے۔

ابتدائی تعلیم | جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے مسلمانوں کی فی صدی نسبت بڑی نہیں گو جس قدر ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان کی کل اقوام کو ابتدائی تعلیم کے باب میں آیندہ ترقی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا خواندہ ہونے کا معیار فقط ٧ء٤ فی صدی ہے جو کسی طور سے بھی کافی نہیں ہے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہر گروہ و قوم کے لوگ ابتدائی تعلیم جبریہ ہو جانے کے دل سے موافق ہیں جب ۱۹۱۰ء میں میں نے صوبہ بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل میں مفت اور جبریہ ابتدائی تعلیم کا علم بلند کیا اور لیجسلیٹو کونسل اور نیز بمبئی کی میونسپلٹی میں اُس کے واسطے کوشش کرتا رہا تو اُس وقت

مجھ کو کوئی کامیابی کی امید نہ تھی مگر گزشتہ بیس سال میں عام رائے میں حیرت انگیز تبدیلی ہوئی ہے اور اب اس ملک میں مشکل سے کوئی متنفس ہوگا جو مفت اور جبریہ ابتدائی تعلیم کے فوائد سے ناآشنا ہو۔ صوبہ کی کونسل نے یکے بعد دیگرے تین ایکٹ منظور کیے ہیں اور ابتدائی تعلیم کے قانون کے ماتحت قواعد بھی بن گئے اور اب مقامی جماعتوں یعنی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا کام ہے کہ اس تجویز کی طلب میں اپنی خلوص نیت کا ثبوت دیں اور سارے صوبہ میں حتی المقدور بہت جلد اس تجویز کا عمل درآمد شروع کریں۔

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم | میں پیشتر کہہ چکا ہوں کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے باب میں ابھی تک ہماری قوم بہت پیچھے ہے۔ اعلیٰ تعلیم سے میری مراد فقط علوم عامہ میں اعلیٰ تعلیم نہیں ہے بلکہ پیشوں صنعت اور حرفت کی تعلیم بھی اُس میں شامل ہے۔ آپ سب صاحب محسوس کرتے ہوں گے کہ ہم کو کس قدر تلافی مافات کرنا ہے اس لیے میں تفصیل سے نہ بتاؤں گا کہ کس قدر کرنا باقی ہے۔ اصلی سوال یہ ہے کہ اُس کو کیوں کر پورا کریں۔ ایک مشکل جو میری رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی سدراہ رہی ہے وہ مذہبی رہنماؤں کا اثر ہے جس کا میں نے اپنے سورت کے ایڈریس میں بہت کچھ ذکر کیا تھا مگر اس مشکل کا اب بہت زیادہ اثر نہیں ہے۔ اور بہت سے نوجوان مسلمان تعلیم پانے کے دل سے خواہشمند ہیں۔ ایک سدراہ جو برابر رہی ہے اور جو باوجود اعلیٰ تعلیم کے شائقین کی روز افزوں تعداد کے آج بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اُسی قدر زور کے ساتھ موجود ہے وہ مسلمانوں کی مالی پستی اور اُس کی وجہ سے فنڈس کی کمی ہے اس ضرورت کا نام مختصر لفظوں میں اسکالرشپ ہے۔ اگر ضرورت مند طلبا کو ضروری امداد دینے کے واسطے کافی فنڈ مہیا ہو جائے تو ہماری ترقی اعلیٰ تعلیم میں بہت کچھ اضافہ ہو جائے گا اور کچھ عرصہ بعد ہم اپنی قوم سے تعلیمی پستی کا دھبہ جو مدت سے ہماری قوم پر لگا ہوا ہے دور کر سکیں گے۔

فوائد عامہ کے اوقاف | اُن مدوں میں سے ایک کو جن سے مطلوبہ مالی امداد مل سکتی ہے میں اپنے پہلے ایڈریس میں بیان کر چکا ہوں۔ میں نے فوائد عامہ کے اوقاف کی بڑی مقدار کی طرف توجہ دلائی تھی جو مسلمانوں نے زمانہ گزشتہ میں قائم کیے تھے۔ اگر ان اوقاف کا عمدگی سے انتظام ہو اور اُن کی آمدنی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی شاخوں پر صرف ہو تو مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا اصلی علاج ہوگا اور ہماری تعلیمی ترقی کے راستہ میں سے ایک اصلی سدراہ دور ہو جائے گا۔ اس باب میں جو کچھ راندیر میں ہو رہا ہے جو شہر سورت کے مضافات میں واقع ہے آپ کو اُس کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ سال گزشتہ جب میں سورت گیا تو مجھ کو راندیر بلایا گیا تھا اور وہاں میں نے ایک مدرسہ دیکھا جو فائدۂ عامہ کے ایک وقف

سے چلتا ہے۔ اس مدرسہ میں ہر قوم وملت کے طلبا بطور ڈے اسکالر کے تعلیم پاتے ہیں مگر اس کے متعلق ایک بورڈنگ ہوس بھی ہے جس میں غریب مسلمان طلبا بلا فیس طعام مکان اور تعلیم کے داخل کئے جاتے ہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس مدرسہ میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے کیوں کہ یہ تمام اسلامی اسکولوں کی عام خصوصیت ہے اور تمام مسلمانوں کا اس باب میں اتفاق ہے۔ دنیاوی تعلیم بھی عمدہ دی جاتی ہے لیکن خصوصیت جس کی طرف میں خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مفلس طلبا کو مفت کھانا مکان اور کپڑا ملتا ہے اور تعلیم دی جاتی ہے۔ میں اس بے حد فائدہ سے بہت متاثر ہوا جو یہ مدرسہ مسلمانوں کو پہنچا رہا ہے اور میرا مقصد اس کانفرنس میں اُس کا ذکر کرنے سے یہ ہے کہ وہ اصحاب کہ جن کو مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے اس مدرسہ میں تشریف لے جائیں اور دیکھیں کہ اس قسم کے مدارس کی تعداد ہندوستان میں بڑھ سکتی ہے یا نہیں۔ فائدہ عامہ کے اوقاف کا یہ سب سے بہتر مصرف ہے اور اگر ان اوقاف میں سے اکثر کا روپیہ جو ضائع ہو رہا ہے تمام ملک میں اس قسم کے مدارس قائم کرنے میں صرف کیا جائے تو اس سے ترقی تعلیم میں بہت مدد ملے گی۔ میرے سورت میں اس مضمون کا ذکر کرنے کے بعد ہندوستان کی مجلس واضعان قوانین نے مسلمانوں کے اوقاف کا قانون منظور کر لیا ہے اور ہم سب دل سے اُمید کرتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اوقاف کے انتظام میں زیادہ مستعدی ظاہر کی جائے گی اور اُن کی آمدنی زیادہ تر مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں صرف ہوگی۔

علم | بہت برسوں سے ہم مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے ذرائع اور طریقے سوچتے رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم سے فی الحقیقت کیا مراد ہے اور تعلیمی ترقی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا ہوں اس باب میں کسی قسم کا اختلاف آرا ہے کہ تعلیم کا آخر مطمح نظر حصول علم بغرض علم ہونا چاہیے۔ ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے بھی ان ہی معنوں میں حصول علم کی تلقین کی ہے جب کہ انھوں نے فرمایا علم حاصل کرو کیوں کہ جو علم حاصل کرتا ہے خدا کے راستہ میں نیک کام کرتا ہے، جو علم کا ذکر کرتا ہے خدا کی تعریف کرتا ہے جو علم کو تلاش کرتا ہے خدا کی پرستش کرتا ہے جو علم سکھاتا ہے خیرات بانٹتا ہے اور جو ایسے لوگوں کو علم سکھاتا ہے جو اس کے اہل ہیں وہ خدا کی عبادت کرتا ہے۔ علم حق و باطل میں تمیز کرنا سکھاتا ہے وہ ہم کو بہشت کا راستہ دکھاتا ہے وہ بیابانوں میں ہمارا دوست ہے تنہائی میں ہمارا مونس ہے جب کوئی دوست باقی نہ رہے تو وہ ہمارا ہجولی ہے وہ خوشی کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے مصیبت میں وہ ہم کو ڈھارس دیتا ہے، دوستوں کے مجمع میں وہ ہمارا زیور ہے اور دشمنوں کے

مقابلہ میں وہ ہتھیار ہے۔ علم سے خدا کا بندہ اعلیٰ درجہ کی نیکی حاصل کرتا ہے اور اعلیٰ رتبہ کو پہنچتا ہی اس دنیا میں بادشاہوں سے ملتا ہے اور عالم بالا میں کامل خوشی حاصل کرتا ہے۔

چوں کہ پیروان اسلام نے ان معنوں میں علم کو تلاش کیا اسی وجہ سے اسلامی تاریخ شاندار رہی حصول علم میں ہر مسلمان کو یہی اصول پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بہت ضروری ہے کہ زمانہ گزشتہ کے بڑے سائنس دانوں کی ہم تقلید کریں اور فقط علم کے لئے تکمیل کا اعلیٰ درجہ حاصل کریں۔ ہماری قوم کی تاریخ میں یہ زریں صفحہ فقط اس غرض سے پڑھنا مفید نہیں ہے کہ اپنے ہم مذہبوں کے زمانہ گزشتہ کے کارناموں کے عکس سے ہم بھی چمکیں یا اُن کی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کرکے افسوس کریں۔ تاریخ کے اس صفحہ سے پیروان اسلام کو ہدایت کے واسطے راہ نما منارہ کا کام لینا چاہیئے پچھلے مسلمانوں کی پیروی کرنی چاہیئے اور اُس بڑے نام کا اپنے تئیں مستحق ثابت کرنا چاہیئے جو ہمارا ہے۔ میں نے یہ باتیں اُس اصلی حالات کی بنا پر کہی ہیں جو اب دیکھے جاتے ہیں ہماری قوم کی موجودہ مالی حالت میں تعلیم زیادہ تر اس وجہ سے حاصل کی جاتی ہے کہ وہ حصول مشاغل کا ذریعہ ہے اور روٹی کمانے کا آلہ اکثر طلباء کی مالی حالت ایسی ہے کہ اُن کو ساری عمر سخت محنت پڑتی ہے اسکول اور کالج کی تعلیم کے زمانہ میں اُن کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے ذرائع تلاش کرنے پڑتے ہیں امتحانات پاس کرنے پر اُن کا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ مناسب نوکری تلاش کریں یا کسی علمی پیشہ میں کام کریں۔ علمی پیشوں میں لوگوں کی پیشتر سے کثرت ہے اور نوکری کے بازار کی اس سے بدتر حالت ہے۔ یونیورسٹیاں علوم عامہ میں گریجوایٹس کی بڑی تعداد ہر سال تیار کرتی ہیں مگر نوکریوں کا دروازہ اُسی نسبت سے فراخ نہیں ہوتا۔ موجودہ اقتصادی حالات میں امتحانات پاس کرنے کے بعد تعلیم یافتہ گروہ کو بڑی فکر یہ ہوتی ہے کہ روزی کمانے کے واسطے کوئی کام کریں۔ اِن حالات میں تعلیم کی اعلیٰ صورتوں کا ذکر کرنا بے فائدہ ہے۔ صنعت و حرفت، ادب و سائنس میں کمال اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ مدت تک مسلسل مشق اور مطالعہ کیا جائے۔ گریجوایٹ ہونا اس کے لئے فقط بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس معنی میں بہت خرچ ہے اور وہ اکثر لوگوں کی دسترس میں نہیں ہے منتہائے خیال جو میں نے بیان کیا ہی موجودہ اقتصادی حالت میں جہاں تک کہ اُس کے عام رواج کا تعلق ہے وہ فقط ایک اعلیٰ خیال ہی رہی گا جب تک کہ ہندوستان کے لوگوں کی اقتصادی حالت بہت کچھ نہ بدلے۔ تعلیم اور اقتصادیات میں قریب کا تعلق ہے اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ترقی تعلیم سے بہتر لوگ پیدا ہوتے ہیں اور بہتر لوگوں کے معنی ہیں بہتر مالی حالت ایسی تعلیم دینے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور قومی ترقی کا انحصار

تعلیمی اور اقتصادی دونوں قسم کی ترقی پر ہے۔ ترقی کے راستہ میں مشکلات کا ہونا لازمی ہے مگر مشکلات سے ہم کو شکستہ دل نہ ہونا چاہیئے بلکہ وہ ہم کو زیادہ کام اور سخت محنت کرنے پر آمادہ کریں تاکہ ہمارا مطمح نظر ہمارا مقصد اور ہمارا اعلےٰ خیال حاصل ہو۔

علی گڑھ یونیورسٹی | اگر سرسید ان مشکلات سے جو ان کو علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کرنے میں پیش آئیں دل شکستہ ہو جاتے اور ڈر جاتے تو قوم کو آج مسلم یونیورسٹی نصیب نہ ہوتی۔ خوش قسمتی سے علی گڑھ کو بہترین آدمیوں کی پُرجوش خدمات حاصل ہوئی ہیں جن کو ایثار کے ساتھ خدمت کرنے کا جوش تھا اور انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ آیندہ کے واسطے بہت نتیجہ خیز ہے۔ اس قسم کے تمام کارناموں میں ایک ضروری شرط یہ ہے کہ ایک شخص اعلیٰ ہمت کا ہو جو تمام مشکلات کے باوجود قوم کو اُس کے مقصود تک پہنچانے کے واسطے تلا ہو۔ سرسید میں ایسی ہی ہمت تھی جس کی بدولت وہ اپنا منتہائے آرزو حاصل کر سکے اور اُن کے لایق جانشینوں کو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی مل گئی جس کی سرسید کو آرزو تھی۔ یہ سب مسلسل کوششوں کے بعد ہوا ہے اور ایسے زمانہ میں ہوا ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی بیداری کا ابتدائی زمانہ تھا۔

یہ سُن کر آپ صاحب خوش ہوں گے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ۷۰۰ طلبا تعلیم پاتے ہیں اور تعلیم کی مانگ اس قدر زیادہ ہے کہ منتظمین یونیورسٹی کو بہت سے درخواست کنندوں کے داخلہ سے انکار کرنا پڑا۔ میں سُنتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی میں ممالک غیر کے طلبا بھی تعلیم پاتے ہیں جو ہمارے پیغمبر علیہ السلام کی ولولہ انگیز حدیث اطلبوا العلم ولو کان بالصین پر عمل کر کے دُور دراز ملکوں سے علم کی تلاش میں ہندوستان میں آئے ہیں یہ ایک قابل تقلید مثال ہے۔ یہ امر کہ علی گڑھ یونیورسٹی نے بہت سے درخواست کرنے والوں کو داخل کرنے سے انکار کر دیا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ موجودہ تعلیمی انسٹی ٹیوشن جو مسلمانوں کے لئے موزوں ہیں ساری قوم کی ضرورتوں کے لئے ناکافی ہیں۔ ہزاگزالٹیڈ ہائی نس حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے عثمانیہ یونیورسٹی اور ہر ہائینس بیگم بھوپال نے سلطانیہ کالج قائم کرنے سے اس ضرورت کو کسی قدر پورا کیا ہے اور مسلمانوں کو اُن کا بہت ممنون ہونا چاہیئے کہ وہ قوم کو تعلیمی پستی سے بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تمام انسٹی ٹیوشن ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کی روزافزوں ضرورتوں کے واسطے بظاہر ناکافی ہیں۔ اسی سلسلہ میں اس گراں قدر فیاضی کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو سیٹھ داؤد بھائی فضل نے مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے کی ہے اس فنڈ کے ٹرسٹیوں نے ایک اقامتی ہائی اسکول

اس صوبہ کے کسی صحت بخش مقام پر قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور مناسب جگہ اُس کے واسطے حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جب یہ مدرسہ تیار ہو جائے گا تو وہ مسلمانوں کی تعلیم میں بہت مدد دے گا۔

اسماعیل کالج | فی الحال آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اسمٰعیل کالج قائم کرنے کی تجویز جس کا عرصہ سے انتظار تھا اب مکمل ہو گئی ہے۔ سال گزشتہ ہز اکسلینسی گورنر صوبہ بمبئی نے اس کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور اب پوری توقع ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ کالج اس صوبہ میں مسلمانوں کی تعلیم کا کام دے گا۔ وہ اوّل درجہ کا کالج ہوگا جس میں ہر قوم کے طلبا تعلیم پائیں گے مگر ترجیح اُن لوگوں کو دی جائے گی جو بانی کالج کے ہم مذہب ہیں۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس صوبہ میں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے ساتھ آئندہ یہ کالج زیادہ تر ایک اسلامی کالج ہوگا۔ اس کالج کے قائم ہونے میں ایک بات ہے جس کی طرف میں آپ صاحبوں کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا ہوں گورنمنٹ صوبہ بمبئی نے اس رزولیوشن میں جو جاری کیا ہے بتایا ہے کہ گورنمنٹ نے اسمٰعیل کالج قائم کرنے کے واسطے سر محمد یوسف کے شاہانہ عطیہ آٹھ لاکھ روپیہ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے اور انتظام کیا ہے کہ اگر اس کالج میں آئندہ ایسے طلبا داخل ہوں جن کی دوسری زبان عربی ہو تو اُن کی تعلیم کے واسطے گورنمنٹ پروفیسر عربی مقرر کرے گی۔ مجھ کو یقین ہے کہ تم میں سے ہر شخص کو اقرار ہوگا کہ عربی زبان کو غور سے پڑھنے کی بہت ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس زبان میں ہمارے مذہب کا اصلی لٹریچر موجود ہے مسلمانوں کی محبت اپنے مذہب سے ضرب المثل ہے۔ اس محبت کا یقین دلانے کے واسطے کسی دلیل کی ضرورت نہیں مگر با ایں ہمہ یہ امر قابل افسوس ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبا میں زبان عربی کی تعلیم کی خواہش اس قدر نہیں ہے جیسی کہ ہونی چاہیے۔ مجھ کو یقین ہے ہر شخص کو اعتراف ہوگا کہ قوم میں ایک ایسی تعلیم یافتہ جماعت کا ہونا نہایت ضروری ہے جو مغربی علوم و فنون کی مہارت کے ساتھ ہماری مذہبی زبان کے بھی ماہر ہوں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں سنسکرت زبان میں ہیں اور آپ کو معلوم ہوگا کہ غالب تعداد ہندو طلبا کی سنسکرت کو بطور دوسری زبان کے لیتے ہیں تاکہ اُن کو اپنے مذہب سے براہ راست اور پوری واقفیت ہو اس صوبہ کے مسلمان طلبا میں یہ میلان طبیعت نہیں پایا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ عربی زبان کا سیکھنا زیادہ مشکل ہے اُس کے واسطے زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور اس کے امتحان میں فیل ہونے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان حالات کی بھی اصلی وجہ مسلمان طلبا کا افلاس ہو جس کی وجہ سے قدرتی طور پر اُن کو فقط امتحان پاس کرنے کی فکر ہوتی ہے کہ جس سے وہ اپنی روٹی

کمانے کے قابل ہوں۔ اُن کے واسطے ایسی ثانوی زبان کا منتخب کرنا جس میں امتحان پاس کرنا آسان ہو ضرور دل کش ہوگا۔ مگر اُن کے ساتھ ہی ہندو طلبار کے واسطے بھی وہی حالات موجود ہیں سنسکرت زبان کا بھی سیکھنا مشکل ہے مگر ہندو طلبا من حیث القوم اس مشکل سے نہیں ڈرتے اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران میں محنت سے زبان سنسکرت کا مطالعہ کرتے ہیں کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان طلبا ان کے نمونہ کی پیروی نہ کریں عربی کو بطور سکنڈ لینگویج کے لیں اور میرے نزدیک ہندوستان میں جو مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے اُس کو پورا کریں یعنی ایسے لوگ تیار رہوں جو مغربی علوم اور زبانِ عربی کے ماہر ہوں اور اپنی قوم کے لئے مفید خدمات انجام دے سکیں۔ گورنمنٹ نے جو اسمٰعیل کالج کے متعلق رزولیوشن منظور کیا ہے اُس میں عربی تعلیم کے انتظام کے واسطے رضامندی کا اظہار کیا ہے اور مجھ کو پورا بھروسا ہے اگر مسلمان طلبار کی طرف سے ہائی اسکولوں اور کالجوں میں عربی تعلیم کے واسطے اصلی خواہش کا اظہار ہو تو گورنمنٹ اپنے تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں میں عربی تعلیم کا بندوبست کردے گی۔ مجھ کو امید ہے کہ مسلمان طلبا اپنی قوم کے واسطے عربی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کریں گے اور جب اُن سے اپنے لئے سکنڈ لینگویج انتخاب کرنے کے لئے کہا جائے گا تو وہ عربی زبان کا حق فراموش نہ کریں گے۔ سر محمد یوسف کی شاہانہ فیاضی کا ذکر نامکمل ہوگا اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ اس فنڈ سے پچیس وظیفے جن میں سے ہر ایک تیس روپیہ ماہوار کا ہے اس سارے صوبہ میں مع سندھ کے فرسٹ ایر کلاس کے طلبار کو دیئے جائیں گے

سمندر پار وظائف میں نے اپنے سورت کے ایڈریس میں اس ملک کے مسلمانوں کے لئے سمندر پار وظائف قائم کرنے کی بڑی ضرورت کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلائی تھی۔ جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے مسلمانوں کی تعلیم کے راستہ میں اصلی مشکل امتحان میٹریکولیشن کے قریب واقع ہوتی ہے۔ میں بہت برسوں سے سمندر پار وظائف قائم ہونے کی بڑی ضروریات پر زور دے رہا ہوں۔ اُن کے ذریعہ سے مسلمان اُن اعلیٰ مراتب کو حاصل کر سکیں گے جن کے واسطے وہ خاص طور سے موزوں ہیں۔ آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ ایک شاہانہ قسم بمبئی یونیورسٹی کو سر کریم بھائی ابراہیم کے خاندان نے مسلمانوں کو اس قسم کے وظائف دینے کے واسطے سپرد کی ہے۔ داؤد بھائی فضل کے وقف کا ایک حصہ بھی جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اس قسم کے وظائف کے دینے کے واسطے مخصوص کر دیا گیا ہے لہٰذا اب سمندر پار وظائف کے لئے دو بڑی رقمیں ہمارے پاس ہیں اور قوم کو سر فاضل بھائی کریم بھائی کا خاص طور سے ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اپنے خاندان کی طرف

ان وظائف کی ابتدا کی اور مسٹر شریف دیوجی کانجی و دیگر ٹرسٹیان کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس بڑے وقف کا ایک حصہ جو ان کی نگرانی میں ہے انھوں نے ان وظائف کے واسطے مخصوص کر دیا۔ ٹاٹا وظائف سے جو چند سال ہوئے ان ہی اصولوں پر قایم ہوئے تھے بہت شاندار نتائج پیدا ہوئے ہیں اور اس سے قوی امید ہوتی ہے کہ ان سمندر پار وظائف سے بھی بڑے نتائج حاصل ہوں گے اور مسلمانوں کی قوم کو ان طلبار کی ذات سے بہت بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔ اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ ملکوں میں بڑی بھاری قابلیت حاصل کرکے واپس آئیں گے۔ علم کو علم کی غرض سے سیکھنے کا اعلیٰ خیال ایسے قابلیت والے اشخاص کے ذریعہ سے پورا ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔

تعلیم نسواں | اس صوبہ کے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی حالت بہت بُری ہے سنہ ۱۹۲۲-۲۳ء میں سکنڈری مدارس میں فقط آٹھ مسلمان لڑکیاں تھیں اور جہاں تک کالج کی تعلیم کا تعلق ہے ان کی تعداد صفر تھی۔ ہمارے پیغمبر علیہ السلام نے حصول علم کے باب میں ذکور و اناث میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اُنھوں نے دونوں صنف کو علم تلاش اور حاصل کرنے کے واسطے حکم دیا ہے۔ جب تک تعلیم یافتہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ کام میں شرکت کرکے اپنے بچوں کی ترقی کے واسطے کوشش نہ کریں۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ تعلیم نسواں کے خلاف تعصب اب بتدریج کم ہو رہا ہے مگر تعلیم نسواں کے راستہ میں پھر مشکل روپیہ کی ہے۔ میں تعلیم اور روپیہ کے باہمی تعلق کو پیشتر بیان کر چکا ہوں۔ اگر مناسب مقدار میں روپیہ موجود ہو تو تعلیم نسواں کا مسئلہ ایسا مشکل نہ رہے گا جیسا کہ وہ اب ہے۔ اس کامیابی کو بیان کرتے ہوئے جو علی گڑھ کے مدرسہ کو ہوئی میں نے ایک پرجوش کام کرنے والے کی ضرورت کو بیان کیا ہے جس طرح یہ اصول پبلک اور قومی انسٹی ٹیوشنوں کے باب میں صحیح ہے۔ وہ شخصی کوششوں کے باب میں بھی عائد ہوتا ہے۔ میں آپ صاحبوں کے سامنے صرف ایک شخص کی مثال پیش کروں گا جس نے اپنی دوربینی سے تعلیمی معاملات میں اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے میں اپنے خاندان کی مدد کی۔ آپ صاحبوں میں سے کسی شخص نے جسٹس بدرالدین طیب جی کا نام نہیں سنا ہے۔ اس خاندان کی تاریخ لکھنے کے قابل ہے کیوں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک متنفس اپنی ذات سے اپنے خاندان کی تعلیمی ترقی کے واسطے کیا کچھ کر سکتا ہے جسٹس طیب جی کے والد ماجد طیب جی بھائی میاں بڑودہ کے ایک تاجر تھے اور بہت عیال دار تھے اُنھوں نے قصد کیا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ قسم کی تعلیم دے کر جو اُن دنوں میں میسر آ سکتی تھی اُن کے واسطے بہترین مواقعے پیدا کریں۔ ان کے سب بیٹوں نے جو تعداد میں چھ تھے اپنے اپنے دائرہ میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا۔

تعلیم کے بڑے فوائد سے مستفید ہو کر انھوں نے اپنے بچوں کو خواہ ذکور ہوں خواہ اُناث بہترین تعلیم دی جو اُس زمانہ میں میسّر آسکتی تھی۔ اس خاندان کی اب یہ حالت ہے کہ اُس میں بہت سے افراد ہیں اور اُن میں ذکور و اُناث میں مشکل سے کوئی متنفس ہوگا جو انگریزی نہ جانتا ہو۔ اس خاندان کے باب میں طریق عمل یہ تھا کہ اول لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دی گئی اور اُس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دی۔ اس خاندان نے دکھایا ہے کہ کس طرح شخصی کوشش سے ذکور و اُناث کی تعلیم میں اعلیٰ ترقی ہو سکتی ہے۔ ذکور و اُناث دونوں کی تعلیم کے واسطے ایک وقت میں اور ایک ساتھ کافی مقدار میں روپیہ کا بند و بست ہونا مشکل ہے۔ لہٰذا اول مردوں کی تعلیم ہو اور مردوں کی تعلیم سے عورتوں کی تعلیم پر اثر پڑے گا اور قوم کی ترقی گو دھیمی رفتار سے ہوگی مگر یقینی ہوگی بہترین طریقہ جو ہماری دسترس میں ہو اس پر ہم کو ساری توجہ مبذول کرنی چاہیے اور قوم اور نیز خاندان کی تعلیم کے واسطے ایک بڑی تعداد ایسے آدمیوں کی ہم کو تلاش کرنی چاہیے جو اپنے ارادوں میں پورے ہوں۔ قوم کی ترقی اُس کے افراد کی ترقی پر منحصر ہے۔

حضرات! آپ کا اور زیادہ وقت لینے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے مہربانی سے میری تقریر کو صبر کے ساتھ سنا جیسا کہ میں نے سورت کے مقام پر درخواست کی تھی اب بھی اُس درخواست پر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں کہ ہم سب دل سے دعا کریں۔ خدائے تعالےٰ اپنا رحم فرمائے اور ہر مسلمان کو ترقی اور تہذیب کے اعلیٰ مقصد میں خدمت اور ایثار کی توفیق دے۔

نواب سر عبدالقیوم خاں
صدر اجلاس سی و ہشتم (علی گڑھ سنہ ۱۹۲۵ ع)

اجلاس سی و ہشتم

اجلاس سی و ششم

(منعقدہ علی گڑھ ۱۹۲۵ء)

صدر نواب صاحبزادہ سر عبدالقیوم خاں رئیس پشاور کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کے۔ بی۔ ایم۔ ایل۔ اے

حالات صدر

نواب صاحب۔ سلطان ابراہیم لودھی کی اولاد میں ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ پانی پت کی لڑائی میں جب ابراہیم لودھی کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا تو اس کی اولاد میں سے بعض افراد مشرقی افغانستان میں جاکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک شاہزادہ گیارھویں صدی ہجری کے آخر میں علاقہ یوسف زئی میں گیا اور وہاں مقام ٹوپی (تحصیل صوابی ضلع پشاور) میں سکونت پذیر ہوا بعدازاں اس خاندان کے بعض افراد موضع برگ علاقہ غیر اور تنرتاؤ علاقہ ہشت نگر میں بھی آباد ہو گئے چونکہ یہ خاندان نسبی اعزاز کے علاوہ علمی، اخلاقی اور امور شرعی میں پابندی کے لحاظ سے نمایاں خصوصیت رکھتا تھا لہذا عوام اور خواص میں خاندان مذکور کے افراد صاحبزادہ کے لقب سے مخاطب کئے جانے لگے۔ اور سرحد کے مختلف قبائل بہت جلد ان کی بزرگی اور اخلاقی قوت کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے۔

نواب صاحب کے بزرگوں میں سے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشہور عالم اور اپنے زمانہ کے صاحب کرامت ولی سمجھے جاتے تھے گذشتہ صدی میں نہ صرف درویش کامل کی حیثیت سے بلکہ زبردست مذہبی پیشوا ہونے کے لحاظ سے نہایت با اثر بزرگ تھے ان کی عظمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ امیر دوست محمد خاں کابل سے ان کی ملاقات کو آئے تھے خود نواب صاحب کے والد صاحبزادہ عبدالرؤف خاندانی وجاہت اور نسبی شرافت کی وجہ سے اپنے حلقہ میں با اثر شخص اور زبردست عالم و فاضل تھے۔ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بہت سے خیالات زمانہ حاضرہ کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں اس لیے اس زمانہ کے تنگ خیال ملا ان کے مخالف ہو گئے اور ۱۸۷۳ء میں مذہبی تعصب کی بنا پر جبکہ وہ نماز عشا سے فارغ ہو کر مسجد سے گھر کو جا رہے تھے کئی شخصوں نے مل کر شہید کر دیا وہ متعدد فارسی اور عربی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں اور بعض غیر مطبوعہ ہیں۔

نواب صاحب ۱۲ر دسمبر ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے والد کے انتقال کے وقت دس برس کی عمر تھی عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد انگریزی شروع ہوئی اور انٹرنس کلاس تک تعلیم پائی پشتو فارسی زبان کے علاوہ جو کہ ان کی مادری زبان ہے۔ اردو انگریزی میں کافی مہارت اور استعداد پیدا کی تعلیم کے بعد ۱۸۸۲ء میں آپ نے گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت اختیار کی اور اپنی فطری تیز فہمی خوش تدبیری اور عمدہ قابلیت کی وجہ سے مناصب اعلیٰ تک ترقی کی۔ ایک طرف ان کا معاشری اور ملی تعلق آزاد اور جنگی قوموں سے دوسری طرف یہ سلسلہ ملازمت انگریزوں سے وابستگی مگر وہ اپنی کمال فراست حسن تدبیر کے لحاظ سے نہ صرف گورنمنٹ برطانیہ کے نزدیک صاحب اعتماد رہے بلکہ تمام قبائل اور مختلف جرگے بھی ان کو اپنا ہوا خواہ اور دوست سمجھتے۔

پولٹیکل اہم خدمات کے لحاظ سے ان کی تمام سروس نیک نام اور شاندار نظر آتی ہے اکثر سرحدی کمیشنوں کے آپ ممتاز رکن رہے ہیں اور بہت سے نازک معاملات سرحدی کو آپ کی اصابت رائے نے حل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

بیس پچیس برس سے جو خوشگوار تعلقات گورنمنٹ برطانیہ اور اقوام آفریدی و شنواری کو باہم مربوط کیے ہوئے ہیں وہ نواب صاحب ہی کے مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں یا آج جس دانشمندانہ طریقہ عمل کے ساتھ گورنمنٹ انگریزی درۂ خیبر پر کاربند ہے۔ نواب صاحب کی اس سنجیدہ پالسی کا نتیجہ ہے

جو بہت غور کے بعد ان کے دل و دماغ نے پیدا کر کے ایک ایسے ملک میں امن و امان کی فضا پیدا کر دی ہے۔ جہاں آئے دن خون ریزی اور ہنگامہ آرائی معمولی سی بات تھی۔

اس بہترین تدبیر اور سیاسی حکمت عملی کے اعتراف میں گورنمنٹ ہند نے آپ کو چترال اور خیبر جیسی اہم ایجنسی کا جو سرحد کی کنجی ہے پولیٹیکل ایجنٹ بنایا۔ آپ سے پہلے یہ عہدہ تجربہ کار یورپین افسران کے لیے مخصوص تھا۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں سرحد پر امن قائم رکھنے کی غرض سے جو عظیم الشان خدمت سلطنت برطانیہ کی آپ نے انجام دی اس کے صلہ میں آپ کو نواب اور کے۔ سی۔ آئی۔ ای کے خطابات دیئے گئے ۱۹۱۹ء میں افغانستان سے انگریزوں کی آخری جنگ ہوئی اس موقع پر بھی آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں اس خدمت کا صلہ گراں قدر جاگیر کی صورت میں آپ کو دیا گیا۔ جس کے بعد بڑی عزت اور نیک نامی کے ساتھ آپ نے اپنی طویل سروس کا زمانہ ختم کر کے پنشن پر سبکدوشی حاصل کی۔

وہ ایک طرف اپنی ڈیوٹی اور فرض شناسی کے لحاظ سے اگر صوبہ سرحد میں ایک ممتاز شخصیت رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ خیال کیا جاتا ہے جبکہ انہوں نے قبائل اور سرحدی جرگوں میں علمی اور اخلاقی اسپرٹ کا پیدا کرنا اپنی زندگی کا مقصد اولین سمجھا اور اس سلسلہ میں جو بیش بہا یادگار انہوں نے اپنے کارنامۂ عمل کی چھوڑی ہے وہ اسلامیہ کالج پشاور کا قائم کرنا ہے۔ صحت در آب وہوا اور طاقت ورقوائے جسمانی کی موجودگی میں صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی کمزوری کی بین علامت ان میں علوم جدیدہ کا فقدان اور ان وسائل سے بہرہ ور نہ ہونا تھا جن کی عالمگیر علمی جنگ کے سبب سے تمام دنیا اپنی اپنی تیاری میں مصروف پیکار ہے۔ انہوں نے اس مقصد کے حصول میں اپنی تمام قوت اپنے تمام اثر کو پورے زور کے ساتھ صرف کرنے کی انتہائی کوشش کی اور بالآخر تمام مشکلات پر غالب آ کر کامیاب ہوئے۔ آپ نے سب سے پہلے ایک کمیٹی ترتیب دی کہ اسلامیہ اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں سر جارج روس کیپل صاحب چیف کمشنر صوبۂ سرحد کی سرپرستی میں مسلمانان سرحد کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک بڑے ریزیڈنشل کالج اور اسکول کی بنیاد ڈالی جس کے لیے تقریباً پندرہ لاکھ روپیہ علاقہ سرحد سے وصول کیا دو سو ایکڑ زمین خریدی اور نہایت وسیع پیمانہ پر کالج اور ہاسٹل کی دلفریب اور عالی شان عمارات تعمیر کی گئیں ۱۹۱۳ء سے اس وقت تک یہ کالج اور اسکول نہایت کامیابی کے ساتھ درس عمل دے رہے ہیں طلبہ کی رہائش

کے لیئے آٹھ بڑے بڑے ہاسٹل ہیں عربی انگریزی کتب خانوں کی جدا جدا عمارتیں ہیں نماز کے لیئے عظیم الشان مسجد بنائی گئی ہے درۂ خیبر سے نکلنے میں یہ پہلی رفیع الشان عمارت ہے جو ہندوستان میں داخل ہونے والوں کو دور سے نظر آتی ہے۔ کالج میں۔ بی سلے اور بی۔ ایس۔ سی۔ تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور ایم۔ اے تک کی تعلیم کے لیے اسٹاف موجود ہے طلبہ کے لیے دائمی وظائف کا خاص طور سے اہتمام کیا گیا ہے۔ کالج کا اصلی نام دارالعلوم صوبہ سرحد ہے۔
دارالعلوم کا اپنا ریلوے اسٹیشن اپنا ڈاک خانہ اپنا تار گھر وغیرہ موجود ہیں اس طرح گویا اسلامیہ کالج ایک چھوٹے سے علمی شہر کا نام ہے جس میں باقاعدہ سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ سایہ دار درخت لگائے گئے ہیں جا بجا موسمی پھولدار درختوں اور پودوں سے سڑکوں کی روشوں کو زینت دیکر دلفریب اور خوش منظر کرنے کی پوری کوشش کی گئی جو بلاشبہ دارالعلوم کے ساتھ گارڈن ٹون کا نمونہ بن گیا ہے۔ نواب صاحب۔ اس کالج کے آنریری لائف سکرٹری ہیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جاوے گا تعلیم وتربیت کے عمدہ نتائج قوم کے مضبوط اور توانا جسم میں زندگی کی نئی روح پیدا کرتے چلے جاوینگے اور آیندہ نسلیں ان کے نام اور کام کو عزت کے ساتھ یاد رکھیں گی۔
سنہ ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ نے ان کو صوبہ سرحد کی طرف سے لیجس لیٹو اسمبلی کا ممبر نامزد کیا جنہوں نے تین سال کے عرصہ میں اپنے صوبہ کی بہتری کے لیے نہایت مفید خدمات انجام دیں صوبہ سرحد میں جدید اصلاح کے نفاذ کے لیے اسمبلی میں رزولیوشن پیش کرکے اس کے پاس کرانے کی جدوجہد فرمائی۔ ان کی ہمیشہ سے یہ بہترین خواہش اور آرزو رہی ہے کہ خوانین سرحد علمی اخلاقی اور سیاسی دوڑ میں ہندوستان کی دوسری اقوام کے دوش بدوش چلنے کی قوت پیدا کریں سنہ ۱۹۲۶ء میں آپ دوسری مرتبہ اسمبلی کے ممبر نامزد ہوئے مسلمانان صوبہ سرحد کی عام رہنمائی کے علاوہ اُنہوں نے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی تعلیم وتربیت پر بھی خصوصیت کے ساتھ توجہ کرکے کثیر نوجوانوں کو علم وعمل سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔
امارت، ثروت، اقتدار حکومت کے موجود ہوتے ہوئے نواب صاحب کی خانگی زندگی نہایت سادہ بے تکلف اور پر اخلاق واقع ہوئی ہے وہ ہر کہہ ومہہ سے تواضع اور تکریم کے ساتھ پیش آتے ہیں، حاجتمندوں کی حاجت برآری میں ان کو خاص ذوق اور مزہ ملتا ہے سیرچشمی مہمان نوازی ان کا جوہر طبیعت ہے۔
آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کمیٹی نے ان کی تعلیمی خدمات اور قومی ہمدردی کے لحاظ

سے ۱۹۲۵ء میں اس وقت جب کہ علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی کے عالیشان دربار
ہوئے تھے کانفرنس کا صدر منتخب کیا اس موقع پر جس جامعیت کے ساتھ پر از معلومات خطبہ
انھوں نے دیا وہ موصوف کے مسئلہ تعلیم سے کامل واقفیت کا کافی ثبوت ہے ذیل میں یہ فاضلانہ خطبہ
ضیافت ناظرین کے لیے درج کیا جاتا ہے۔ وہو ہذا۔

نوٹ۔ سر موصوف نے میری درخواست پر اپنے حالات تحریر فرما کر بھیجے انھیں کا یہ خلاصہ ہے۔

انوار احمد

خطبۂ صدارت

حضرات!

آپ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اس سالانہ اجلاس کا صدر منتخب کرکے جو میری عزت افزائی فرمائی ہے میں اُس کے لیے آپ کا بہت ممنون و شکر گزار ہوں۔ جب میں ان ممتاز اصحاب کا خیال کرتا ہوں جو سال بسال گزشتہ اڑتیس ۳۸ برس کے عرصہ میں آپ کے جلسوں کی صدارت فرماتے رہے ہیں اور جب میں اُن قابل اور معزز احباب کو دیکھتا ہوں جو اس وقت اس ہال میں جمع ہیں، تو اپنی کمزوریاں ایسے نمایاں طور پر میری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں کہ میں اپنے دل میں آپ صاحبوں کو مخاطب کرنے کی جرأت نہیں پاتا۔ اپنے انتخاب کی صرف ایک یہی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے کہ آپ لمبے لمبے اور پیچیدہ خطبہ ہائے صدارت کو سنتے سنتے تھک گئے تھے۔ اور اب آپ ایک ایسے شخص کی سیدھی اور صاف گفتگو میں کچھ عملی تجاویز اور کام کی باتیں سُننا چاہتے ہیں جو آپ کے نزدیک آپ کے افغان بھائیوں اور سرحدی پٹھانوں کے خیالات کا ترجمان سمجھا جاسکتا ہے! شاید ہندوستان میں مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ پر نظر کرکے آپ خیال کرتے ہوں کہ افغانوں میں جو پہلے اپنی حکومت کا سکہ بٹھا چکے ہیں اب بھی بہت سی خوبیاں ہوں گی اور عجب نہیں کہ مسئلہ تعلیم پر بھی ان کے خیالات کچھ دلچسپ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ زمانہ حال کے سرحدی افغانوں میں اپنے آبا و اجداد کی سب یا اکثر صفات موجود ہیں۔ مشرق کی دیگر اقوام کی طرح وہ بھی مصائب کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں مگر یہ امر اُن کی بھی تسلی اور اطمینان کا موجب ہوگا کہ اُن کو بھی ہندوستان کی دیگر اقوام کے ساتھ بیٹھکر قومی ترقی کی تدابیر میں مشورت کا موقعہ دیا گیا۔

کانفرنس کے کارنامے

اس کانفرنس کی اہم اغراض میں سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے مغربی تعلیم کی نفرت دور کی جائے۔ میں اس کانفرنس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل کر چکی ہے! مغربی علوم کی پیاس اب نہ صرف ہندوستان کے لوگوں میں پائی جاتی ہے بلکہ تیراہ و سوات دور دراز غیر آباد علاقوں میں بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ دو ہی سال ہوئے ہیں کہ چترال کے ولیعہد نے پشاور کے اسلامیہ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اسلامیہ کالج اور

اسکول میں آفریدی و محسود اور توری اقوام کے لڑکے انگریزی کتابیں یاد کرتے ہوئے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ سوات کی خود مختار حکومت میں ایک انگریزی اسکول قایم ہو گیا ہے اور تیراہ میں اس کے قیام کی خواہش ظاہر کی جا رہی ہے۔ الغرض ہندوستان اور اُس کے ہمسایہ علاقوں میں مغربی تعلیم کی خواہش پیدا ہو گئی ہے، پرانے تعصبات دُور ہو چکے ہیں اور لوگ سمجھ گئے ہیں کہ بغیر مغربی علوم کے وہ اپنی حالت سنوار نہیں سکتے اس تمام کامیابی کا سہری سہرا آپ کی کانفرنس کے سر ہے۔

تعلیم کا مسئلہ ایک وسیع اور مشکل مسئلہ ہے۔ اس پر اس قدر لکھا گیا ہے اور کانفرنسوں میں وقتاً فوقتاً کہا گیا ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں اس کے کس پہلو پر بحث کروں اور کس پہلو کو چھوڑوں۔ میں اس مضمون پر سلسلہ وار بحث کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ صرف ان چند مسئلوں کا ذکر کروں گا جو آج کل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے غالباً آپ موجودہ کالج اور اسکول کی تعلیم کی نسبت میری رائے سننا چاہیں گے۔ اس کے ضمن میں میں تعلیم کا اعلیٰ مقصد بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد چونکہ آج کل زراعتی تجارتی اور صنعتی تعلیم کی اہمیت کا بہت چرچا ہے، آپ ضرور توقع کریں گے کہ میں اُن کی نسبت بھی کچھ کہوں بعد میں بچوں اور نوجوانوں کی اخلاقی تعلیم کے بارے میں کچھ بیان کروں گا۔ کیونکہ یہ مسئلہ میرے نزدیک بہت اہم ہے۔ آخر میں تعلیم نسوان کے متعلق ایک جملہ کہہ کر میں اپنے مضمون کو ختم کر دوں گا اور امید رکھوں گا کہ آپ حضرات مجھے معاف فرمائیں گے اگر دوران مضمون میں کوئی ناموزوں یا نا ملایم الفاظ میرے منہ سے نکلے ہوں۔ کیونکہ میں آپ کی زمانۂ حال کی نامکمل تعلیم کا ایک مکمل نمونہ ہوں اور میں یہ دعویٰ نہیں رکھتا کہ جس مضمون پر میں آپ سے مخاطب ہونے لگا ہوں اس میں مجھے کوئی خاص مہارت حاصل ہو۔

علمی پیشوں اور ملازمت سرکاری کے لیے تعلیم

ہمسایہ اقوام کے مقابلہ میں ڈگریاں حاصل کرنے کا سوال آج کل بڑی اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اعداد و شمار کے انبار لگائے جا رہے ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہمارے انٹرمیڈیٹ کے سند یافتہ اور گریجویٹ دوسری اقوام سے تعداد میں کم ہیں۔ گویا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ایک قوم کی قدر و قیمت اُس کے گریجویٹوں کی تعداد سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس خیال کے لوگ یونیورسٹی کی تعلیم کو ایک دروازہ خیال کرتے ہیں جس سے گزر کر سرکاری ملازمت کے محل میں داخل ہو سکتے ہیں اور سرکاری ملازمت کا نام اُن کے ذہن میں دولت و قوت کا مترادف ہے۔ خیال یہ ہے کہ جس قوم کے لوگ سرکاری ملازمت میں زیادہ ہوں گے اتنا ہی اُس قوم کا رسوخ سرکار میں زیادہ ہو گا۔ ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے

جہاں لوگوں کے مذاہب جدا ہیں اور ایک دوسرے سے ہمدردی بھی کم ہے، کسی ایک قوم کے افراد کا غلبہ سرکاری دفاتر میں دوسری اقوام کے مفاد کے لیے خطرہ کا موجب ہو سکتا ہے، اور ہر قوم کو وقتاً فوقتاً اپنے حقوق کی حفاظت کے لیئے تدابیر کرنی پڑتی ہیں۔ مگر اپنی ہمسایہ قوم کے مقابلہ میں اپنے "فرقہ وارانہ حقوق" کو نعرۂ جنگ بنانے سے پہلے ہمیں ان پر ذرا زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کر لینا چاہیئے۔

آپ جانتے ہیں کہ اپنے ملازمین کے تقرر کے بارے میں ہر حکومت کا اصول انتخاب "قابلیت" ہے۔ اگر کوئی حکومت گوارا نہیں کرتی کہ اُس کے دفاتر پر کسی ایک فرقہ کے لوگ قابض ہو جائیں تو یہ بھی اسی غرض کے لیئے ہوتا ہے کہ سرکاری کام خوبی سے چلیں، خواہ کسی ملازم سرکاری کی قابلیت علمی کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ بے لوث کام اور انصاف نہیں کر سکتا تو اُس سے بڑھ کر کوئی شخص اپنے منصب کے لیے نا قابل نہیں۔ اسی طرح وہ سرکاری عملہ بھی جس کی نظر ہمیشہ کسی خاص فرقہ کی بہبودی پر لگی رہے اور دوسرے فرقوں کو دبلنے اور پست کرنے ہی کی فکر میں رہے، دنیا میں سب سے زیادہ نا قابل عملہ ہے، خواہ اُس کے افراد علمی لیاقت میں کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا "قابلیت" کے اصول کا مفہوم ملتزم اس کا ہوا کہ سرکاری دفاتر میں ہر فرقہ کے لوگوں کا حصّہ ہو۔

میں آپ کے ساتھ اس بات میں متفق ہوں کہ ہماری درس گاہوں کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے لیے آدمی پیدا کریں۔ مگر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اُن کا سب سے بڑا مقصد یہی ہونا چاہیئے۔ نہ میں یہ یقین کرتا ہوں کہ ہمیں گریجویٹ بنانے میں دوسری اقوام کے ساتھ مقابلہ کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور نہ مجھے یہ یقین ہے کہ ہم اس مقابلہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس یقین نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ دیگر اقوام نے انگریزی تعلیم کو ہم سے بہت عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔ اب ہم اُس کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر کام کے لیے بقول شاعر:-

ہر کارے و ہر مردے

ایک خاص قسم کی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ ہمارے نوجوان یونیورسٹی کے امتحان پاس کرنے میں ہندوؤں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے آدمی نہیں جو ادب، فلسفہ و سائنس وغیرہ میں ہندوؤں کے مقابلہ میں پورے اتر سکیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ سو ہندو اور سو مسلمان ایک کالج میں تعلیم کے لیے بھیجیں تو میرے اندازہ میں مسلمانوں کی نسبت ہندو زیادہ پاس ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندو، مسلمانوں کی نسبت تعلیم سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں گے۔ کیونکہ صرف امتحان پاس کرنا ہی تعلیم کا فائدہ نہیں ہے۔ مگر اس

میں کچھ شک نہیں کہ امتحانات میں ہندو زیادہ پاس ہونگے۔ اس تفاوت کی وجہ فطرتوں کا اختلاف ہے
ہندو طالب علم اس لیئے اپنی کتابوں پر زیادہ محنت کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی توجہ کو اپنے گرد وپیش کی چیزوں
سے کامل طور پر منقطع کرسکتے ہیں۔ مسلمان طالب علم زندگی کے ہر پہلو میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لیئے
وہ کتابوں کے لیئے کم وقت بچا سکتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انتہائے کار یہ خوبی ثابت ہوگی یا نقص!

اگر آپ کے درس گاہوں کا مقصدِ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے لیئے آدمی پیدا کرنا ہے اور
اُن ملازمتوں کے لیئے یونیورسٹی کی ڈگری شرط ہے، تو آپ کو ہمیشہ پست و ذلیل رہنا ہوگا۔ اپنے آپ
کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ ہے؟ دھوکا دینے سے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ شاید حاضرین میں سے بعض
اصحاب فوراً کہنے پر آمادہ ہوں کہ ہمارا مقصدِ اعلیٰ گریجویٹ پیدا کرنے میں ہندوؤں کی برابری کرنے کا
نہیں ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہماری درسگاہیں حقیقی تعلیم دیں اور ہمارے بچوں میں اصلی قابلیت پیدا ہو نہ کہ صرف
نمایشی قابلیت جو محض سرکاری ملازمت کے لیئے کارآمد ہوسکتی ہے۔" آپ کا ایسا خیال عین دانشمندی ہوگا
ایسے مقابلہ میں پڑ کر جس کی شرائط کامیابی فطرتاً آپ کے موافق نہیں ہیں آپ اپنی ہمت کو پست نہ کریں
اگر آپ کا سُبک گام حریف رسّی پر ہوا میں چلنے کا مشاق ہے اور آپ کو قدرت نے بھاری بھرکم وجود عطا کیا
ہے تو دانائی سے بعید ہوگا کہ آپ رسّی پر چلنے میں اُس کا مقابلہ کریں۔ اس کو زمین پر اُتر لینے دیں جہاں
وہ اور آپ برابر ہونگے۔ اگر ہندو ہم سے بعض پیشوں میں سبقت لے گئے ہیں تو یہ ہوسکتا ہے کہ ایسے
کاروبار بھی ہوں جن میں ہم اُن سے سبقت لے جائیں۔ اگر انھوں نے بعض پیشوں میں مہارت پیدا کی
ہے تو باوجود اس کے ہمارا قدرتی رجحان اور طرف ہے، کیا یہ ناگزیر ہے کہ ہم بھی اُنھی پیشوں میں کمال
پیدا کریں؟ پیشوں کے انتخاب میں بھی تقسیم کار کے اصول پر عمل کرنا چاہیئے۔ مناسب یہی نظر آتا ہے کہ ہر فرقہ
کے لوگ اُنھی پیشوں کو اختیار کریں جن کے لیئے وہ فطرتاً سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اُس سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ ہم سرکاری ملازمت کے لیے اپنے آدمی
تیار نہ کریں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم ملازمت سرکاری کو اپنا مقصدِ اعلیٰ قرار نہ دیں۔ ہمیں اپنی قوت اور کمزوری
کا بغور مطالعہ کرنا واجب ہے، اور اپنی تعلیمی پالیسی کو اپنے قوائے کے اندازے اور علم پر علیٰ وجہ البصیرت
قایم کرنا چاہیئے۔ یہ عقلمندی نہیں ہے کہ باز کو کبوتر کی طرح کھابک میں رکھ کر غوں غوں کرنے کی
تعلیم دی جائے۔ باز تعلیم دینے سے کبوتر نہیں بن سکتا وہ اپنی فطرت کھو بیٹھے گا اور کبوتر کی فطرت
اُس میں سرایت نہیں کرسکے گی۔ ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی کی بنیاد اندھا دُھند دوسروں کی تقلید پر نہیں ڈالنی
چاہیئے۔ دوسروں نے جو اپنے طریق سے حاصل کیا ہے ہمیں اس پر حسد نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ غور و فکر

کے ساتھ اپنے لیے جدا راستہ تجویز کرنا چاہیے۔ ہمارے آدمی ہر پیشے اور صیغہ میں ہونے چاہئیں مگر ہماری خصوصیت اور کثرت صرف اُنھی پیشوں میں ہو جن کے لیے ہم طبعاً و فطرتاً سب سے زیادہ موزوں ہوں۔ اسی طریقے سے ہم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جھگڑا کیے بغیر ترقی کی شاہراہ پر چل سکتے ہیں۔

ہر فرقہ میں ایسے آدمی ضرور ہوتے ہیں جو دوسری اقوام کے ساتھ اپنے تعلقات کو ہمیشہ "فتح" اور "شکست" کے الفاظ میں تعبیر کیا کرتے ہیں یا وہ اِس بات کو کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ ہم کسی میدانِ عمل میں بھی اپنی شکست کو مانیں۔ وہ میرے مشورہ کو مغلوبیت کی پالیسی تصور کریں گے۔ مگر یہ درست نہیں، جو مشورہ میں اُن کو دیتا ہوں اُس پر عمل کرنے سے اُن کو اتنی کامیابی ہوگی کہ جتنی اب تک نہیں ہوئی ہے۔ اصولِ جنگ و حرب کے بموجب اس مشورہ کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ۔ ہمیشہ یہی تدبیر مناسب نہیں ہوتی کہ جن مواقع پر دشمن کا زور ہو وہیں اپنی فوج کو جمع کر لیا جاوے بعض اوقات مناسب یہ ہوتا ہے کہ ان مقامات پر صرف اتنے ہی سپاہی رکھے جائیں جو اُن کی حفاظت کر سکیں اور باقی تمام طاقت سے ایسے مقامات پر حملہ کیا جائے جہاں دشمن کو حملے کا گمان بھی نہ ہو۔ اکثر اوقات جب بالمقابل حملے کامیاب نہیں ہو سکتے تو پہلو کے حملے سے غنیم کی صفیں اُلٹ دی جاتی ہیں۔ مگر ہمیں اپنے برادرانِ وطن کے مقابلے میں اس قسم کے خیالات کو دل میں نہیں لانا چاہیے۔ ہمارا مقابلہ معاندانہ جنگ نہیں ہے بلکہ ترقی کی شاہراہ پر برادرانہ اور دوستانہ "تسابق" ہے۔ اس لیے اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے بچنے کے لیے ہمیں ایسے پیشوں پر اپنے تمام زور اور اپنی تمام توجہ کو صرف کرنا چاہیے جن کو اُنھوں نے چھوڑ رکھا ہے۔

شاید آپ مجھے الزام دیں کہ میں نے تمام مسلمہ اور قدیم تعلیمی اغراض و مقاصد کو پسِ پشت ڈال دیا مگر اُن کی جگہ کوئی نیا مقصد پیش نہیں کیا۔ آپ مجھ سے اس سوال کا جواب طلب کریں گے جو میں نے خود ہی اُٹھایا ہے یعنی آپ مجھ سے دریافت کریں گے کہ وہ کون سے پیشے ہیں جن میں مسلمان ہندوؤں سے اسی طرح سبقت لے جا سکتے ہیں جیسے کہ ہندو علمی پیشوں میں مسلمانوں سے بڑھ گئے ہیں؟

مقاصدِ تعلیم

قبل اس کے کہ میں آپ کے سامنے اُن تعلیمی مقاصد کو پیش کروں جو کہ آپ کی حالت اور زمانہ کے حالات کے لحاظ سے آپ کے لیے زیادہ موزوں ہیں میں انسان کے منتہائے نظر اور مقاصد کی بے ثباتی کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم زمانے کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیں تو ہمارے مقاصد و اغراض بھی بدلتے رہنے چاہئیں ہم اگر قدیم اغراض و مقاصد کو ناکافی خیال کرتے ہیں تو ان کی اہانت کے لیے ہم ان کو ناکافی نہیں کہتے اور ہماری غرض ان مقدس رہنماؤں کی توہین کرنی ہوتی ہے جن کے مقرر کردہ مقاصد کو زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ترک کر دیتے ہیں۔ ان کی طاقتیں آخر

انسانی طاقتیں تھیں اور اُن کی نظر محدود تھی گویا ہماری نظر اُن سے بھی زیادہ محدود ہے لیکن ہم کائنات کا نظارہ ایک ایسے مقام سے کر رہے ہیں جو اُن کو اپنے عہد میں میسّر نہیں تھا۔ لہٰذا ہم وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو وہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر آپ کسی پہاڑ پر کبھی گئے ہوں گے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھیں تو ایک چوٹی سب سے بلند معلوم ہوتی ہے؛ آپ یقین کرتے ہیں کہ یہ سب سے بلند ہے۔ کیونکہ جس مقام پر آپ کھڑے ہیں وہاں سے کوئی دوسری چوٹی اس سے بلند تر نظر نہیں آتی۔ آپ چڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور جب بڑی کوشش کے بعد چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک اور چوٹی ہے جو یہاں سے اتنی ہی بلند ہے جتنی یہ چوٹی دامن کوہ سے بلند نظر آتی تھی جب آپ اس پر بھی چڑھ جاتے ہیں تو ایسی ہی ایک اور چوٹی سامنے آجاتی ہے! جب آپ دامن میں ہوتے ہیں اور پہلی چوٹی سے بلند کوئی چوٹی نہیں دیکھتے تو یہ آپ کی آنکھوں کا قصور نہیں ہوتا ہے۔ جب آپ پہلی چوٹی کے سر پر ہوتے ہیں تو اُسی قوتِ بصر سے دوسری چوٹی نظر آنے لگتی ہے۔ اگر آپ پہلی چوٹی پر چڑھنے کی تکان سے گھبرا کر بے قراری کے عالم میں یہ اصرار کریں کہ جس چوٹی پر آپ چڑھ چکے ہیں وہی سب سے بلند ہے اور آنکھوں کے سامنے جو بلندی نظر آ رہی ہے اُس کو نہ تسلیم کریں تو اُس بلندی کے وجود کے گو آپ منکر ہو سکیں مگر دنیا اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ اگر ہمت ہار کر آپ کہیں کہ اس پر چڑھنا محال ہے تو آپ صرف اپنی کم ہمتی کا ثبوت دیں گے۔ اس پر چڑھنا بھی ایسا ہی ممکن ہے جیسے پہلی چوٹی پر۔ جو حقیقت ان پہاڑ کی چوٹیوں کی ہے وہی انسانی اغراض و مقاصد پر صادق آتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ آگے ہی قدم رکھنا چاہیئے اور بلند سے بلند مقامات پر چڑھنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ کسی منتہا و مقصود کا قابلِ حصول ہونا کیا ہے؟ صرف قوم کی مستعدی اور بہادری کا معیار ہے! مستعد اور دلاور لوگوں کے لیے ہر مقصد قابلِ حصول ہے بشرطیکہ اُن کا طریقِ عمل غلط نہ ہو۔ اور غافل اور بزدل لوگوں کے لیئے کچھ بھی قابلِ حصول نہیں۔

ہماری روحانی اور سیاسی اغراض کے ساتھ ساتھ ہمارے تعلیمی اغراض کی بھی تبدیلی ہونی چاہیئے جب ملازمت سرکاری اور علمی پیشوں کے لیے ہماری درسگاہوں کا مقصد اعلیٰ محدود و مخصوص تھا اس وقت ہماری سب سے بڑی سیاسی تمنّا یہ تھی کہ سرکار کے ماتحت بڑے بڑے عہدے حاصل کریں۔ اب ہماری آرزو یہ ہے کہ اس وسیع حصہ ملک کے نظم و نسق اور حکومت میں حصہ پائیں۔

ایک وقت تھا جب یورپین مصنفوں کے خیالات وحی الٰہی کے طور پر سمجھے جاتے تھے اُن کے علم کی روشنی سے ہماری آنکھیں چوندھیا گئی تھیں اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی طاقت ہم سے سلب ہو گئی تھی۔ ہم گیہوں کو بھوسے سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اب ہم اُن کے مشاہدات کے نقائص کو دیکھنے لگے ہیں۔

اور اُن کی دلائل کے سقم کو سمجھنے لگے ہیں۔ ہم اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ قدرت نے ہمیں ذلیل قوی نہیں دیئے ہیں اور اُن کے مقابلہ میں ارتقا کے کسی پست زینہ پر نہیں ہیں اور یہ کہ ہم بھی اگر چاہیں تو انسانی علم و معلومات کو وسیع کرنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

علمی تحقیقات

تعلیم کے اغراض و مقاصد کی بحث میں اس عظیم الشان مقصد کے بیان سے شروع کرونگا جو تمام ممالک اور تمام زمانوں میں تعلیم و تعلم کی سب سے اعلیٰ غرض رہی ہے۔ آپ کی قوم یا ملک کی خاص ضرورتیں کچھ ہی ہوں آپ اس اعلیٰ ترین غرض کو نظر انداز نہیں کرسکتے جو تمام تعلیمی اغراض کے درمیان "ایورسٹ" یعنی ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کی طرح ممتاز و نمایاں ہے۔ میری غرض جدید حقایق کا دریافت کرنا اور نئے قوانین فطرت کا تلاش کرنا ہے۔ یہ اس تاریکی میں جس سے انسان گھرا ہوا ہے چمکتے ستاروں اور روشن آسمانوں کا پیدا کرنا ہے ہمارے قومی اور ملکی فرائض بھی ہیں مگر یہ فرض انسانیت کا ہے اس لیے سب سے اقدم اور افضل اور سب پر فائق ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم مسلمانوں نے جن کے تعلیمی مسائل کو سلجھانے کے لیے ہم آج اس ہال میں جمع ہوئے ہیں اس بارے میں کیا کوششیں انجام دی ہیں؟ دنیا کے موجودہ علم و معلومات میں کیا اضافہ کیا ہے؟ اور اس اضافہ کے لیے ہم نے کیا کیا سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔ ہم نے جن کو علم کی محبت کا سب سے بڑھ کر دعویٰ ہے، حدود علم کی توسیع میں کیا حصہ لیا ہے؟ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ ہم نے اسکول کالج اور یونیورسٹیاں بنائی ہیں۔ اگر ان مقامات سے زندہ علم کے چشمے نہیں بہتے تو یہ سنگِ سفید کے اُجلے مقبروں کی طرح صرف نظر فریب ہیں جن کے اندر گلی سڑی اور بوسیدہ ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کوئی قوم اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہیں کہہ سکتی جس میں ایسے آدمی موجود نہیں جن کے افعال و اقوال دنیا کی علمی مجالس میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہوں۔ سطحی علم کی اشاعت کرکے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اپنا کام مکمل کرلیا۔ عالموں کی تعداد کام نہیں آتی بلکہ اُن کی وسعتِ معلومات حقیقی کار آمد چیز ہے۔ تمام دنیا کے لیمپوں سے سورج کی روشنی زیادہ ہے۔ مصنوعی لیمپ اس سے زیادہ کچھ مفید نہیں کہ ہم رات کے وقت اُن کی مدد سے ایک نسبتاً خفیف سی روشنی پیدا کرکے اپنے ضعفِ بصر کی کچھ تلافی کرلیں۔ لیمپ دن کی روشنی کے قایم مقام نہیں ہوسکتے اسی طرح سطحی علم عمیق علم کا قایم مقام نہیں ہوسکتا۔ جو روشنی ایک منوّر ذہن کا انسان اپنے گرد و پیش ڈالتا ہے وہ سورج کی روشنی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ دوسروں کی تعلیم و تربیت کے لیے اکسیر ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں وہ طاقت ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ادنیٰ فطرت کو اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ کسی قوم میں ایک ایسے آدمی کا وجود سینکڑوں سطحی علم والوں سے زیادہ مفید ہے۔

یکے مرد جنگی بہ از صد ہزار ا

میں جانتا ہوں کہ ایسی نورانی فطرت اور ایسے منوّر ذہن بنانے سے نہیں بن سکتے، ہوا جہاں چاہتی ہے چلتی ہے ہم اس کی آواز سنتے ہیں مگر نہیں کہہ سکتے کہ یہ کہاں سے آئی ہے اور کہاں جائیگی لیکن اگر ہمیں اپنی تعلیم کا واقعی خیال ہو تو ہم علمی تحقیقات و تفتیش کے لیے اپنے مدارس میں انتظام کر سکتے ہیں جن مضامین کی خاص طور پر تحقیق کی ضرورت ہو اُن کے لیے اور عام طور پر علوم طبیعی کی تحقیقات کے لیے اوقاف مقرر کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح پر جب قابل و ثوق تصانیف پیدا ہو جائیں تو ہم بحیثیت قوم کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان مضامین کو سمجھتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میدان میں کامیابی کا انحصار جتنا روپیہ پر ہے اُتنا ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہمارے علماء کے قوائے عقلی اور محنت پر ہوگا۔

ہماری سب سے بڑی تعلیمی غرض حق کی تلاش ہونی چاہیئے۔ سچائی کا پایہ سب سے بلند ہے مذہب سے بھی بلند ہے کیونکہ سب سے اعلیٰ مذہب حق کی تلاش ہے۔ اگر ہم اپنی قوم میں سچائی کی محبت پیدا کر سکتے ہیں، زندگی کے اہم مسائل کی طرف اس کی توجہ منعطف کرا سکتے ہیں۔ ان مسائل کے صحیح حل قوم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور سچائی معلوم کرنے کے صحیح ذرائع قوم کے ذہن نشین کر سکتے ہیں تو ہمارا تعلیمی مقصد حاصل اور علمی کام مکمل سمجھنا چاہیئے۔ تعلیم کو خواندگی کے ساتھ مخلوط نہ کرنا چاہیئے۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی ناخواندہ ہو سکتا ہے اور ایک خواندہ آدمی نہ تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے ہمارا مقصود خواندگی نہیں بلکہ تعلیم ہے۔ مگر اب تک ہم صرف لکھنے پڑھنے کی ترویج کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں، حروف محض علامتیں ہیں اور کتابیں بطور خزینوں کے ہیں جن میں یہ علامات محفوظ رہتی ہیں لیکن علم اُن حقایق و معانی کا نام ہے جو ان علامات سے حاصل ہوتے ہیں۔ حروف علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں، مگر صرف یہی ایک ذریعہ نہیں اور اکثر اوقات یہ ذریعہ تسلّی بخش بھی نہیں ہوتا۔ آپ کے طالب علم اُن علامات پر ہی ٹھہرے رہتے ہیں، معانی تک نہیں پہنچتے اس طرح سے اگرچہ وہ خواندہ ہوتے ہیں مگر تعلیم یافتہ نہیں کہے جا سکتے اگر ہمارا مقصد قوم کو تعلیم دینا ہے تو ہمیں ایسے آدمی پیدا کرنے چاہئیں جو علم کے سرچشمے ہوں۔ یہی لوگ دوسروں کو بھی مستفیض کر سکتے ہیں۔

ایسے آدمی ہندوستان میں عام طور پر کمیاب ہیں، مگر مسلمانوں میں بالکل ہی نادر ہیں۔ ہندوؤں نے علوم طبیعی اور ادب کے متعدد نامور ماہر پیدا کیے ہیں جن کے کام کی مغرب میں بھی وقعت کی گئی ہے جب میں سنتا ہوں کہ آپ کی قوم سرکاری ملازمتوں میں اپنے حصہ کے لیے شور و غل مچا رہی ہے، تو میں حیران ہوتا ہوں کہ کبھی آپ کے دل میں میدان علم میں مسابقت کرنے کا شوق بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ ملازمت سرکار تو

کے معنی اکثر اوقات اس سے زیادہ نہیں ہوتے کہ انسان اپنی روح اور اپنے دماغ کو ایک پیالہ سالن کے
عوض رہن کردے! اگر یہ امر کہ آپ سچائی کی تلاش میں ہندوؤں سے یا کسی سے پیچھے رہ گئے ہیں واقعی ماتم کرانے کے لائق ہے!
آپ اکثر اپنی سیاسی غلامی کا ذکر کرتے ہیں مگر کبھی آپ نے اپنی عقلی اور اقتصادی غلامی کا بھی
خیال کیا ہے؟ سیاسی غلامی سے تو صرف جسم پر قیود عائد ہوتے ہیں۔ مگر عقل کی غلامی سے انسان کی روح
اسیر ہوجاتی ہے۔ علوم طبیعی و مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے آپ کو ہر عیّار معترض کے سامنے سر جھکانا
پڑتا ہے۔ جو آپ کے مذہب یا قوم پر نکتہ چینی کرے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ عوام ناواقف ہیں بلکہ یہ کہ آپ کے
عالم ناواقف ہیں۔ جب کبھی یورپ میں علوم طبیعی یا فلسفہ کے متعلق کوئی نیا خیال یا قرینہ و قیاس پیش کیا
جاتا ہے تو آپ کی مذہبی درسگاہوں میں ہل چل پڑ جاتی ہے۔ ہمارے عالم دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتے
ہیں۔ بعض تو فوراً اُن مسائل کا انکار ہی کردیتے ہیں! حالانکہ انھیں علوم طبیعی کی مبادیات سے بھی واقفیت
نہیں ہوتی!! دوسرے جو کچھ تھوڑی بہت سائنس جانتے ہیں وہ سائنس کے مشکوک قیاسات سے بھی
اس قدر خائف ہوجاتے ہیں کہ مقدس کتابوں کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر ایسے معانی پیدا کرلیتے ہیں جو شاید
ان الفاظ کے معنی ہی نہیں ہوسکتے! یہ قابل افسوس حالت اس لیے ہے کہ ہم میں اُن مسائل کی تہ تک
پہونچنے والے آدمی موجود نہیں!

میرے بچپن کے زمانہ میں تھوڑی سی انگریزی پڑھ لینے سے اور تھوڑی سی مغربی علوم کی واقفیت
سے اکثر لوگ مذہب سے متنفر ہوجاتے تھے۔ مگر میں اب یہ دیکھ کر خوش ہوجاتا ہوں کہ مسلمانوں میں ایسے
لوگ پیدا ہورہے ہیں جن کے مذہبی اعتقادات بڑے سے بڑے علمی انکشافات سے بھی متزلزل نہیں ہوتے
اور جو اپنی مقدس کتابوں کو ابدی روشنی اور رہنمائی کا منبع سمجھتے ہیں۔ مگر آئندہ اس سے بھی زیادہ
مذہب اور سائنس کے عمیق علم کی ضرورت ہوگی تاکہ ہم سائنس اور مذہب کی تطبیق کرسکیں اور دونوں کے
حقائق پر کاربند ہوسکیں۔

جب تک ہم کسی بات کی تہ کو نہ پہنچ سکیں ہمیں آزادی خیال نہیں ہوسکتی۔ داناؤں کی باتوں کو تسلیم نہ
کرنا آزادی نہیں بلکہ گستاخی اور ضد ہے۔ علماء کی ناواقفیت اور ضد کا اثر عام لوگوں کے اخلاق پر پڑتا ہے
بازاری لوگوں کے اخلاق بھی مقتدایانِ قوم کے اخلاق کا عکس ہوتے ہیں۔ خواہ یہ عکس کیسا ہی خفیف ہو
کیا ہم اپنی قوم کے دماغوں کو تعصب اور جہالت سے لبریز رکھ کر یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ ہیں؟
یا کورانہ تقلید کرکے اور روزانہ اخباروں کے ہر بے سر و پا بیان کو تسلیم کرکے ہم تعلیم یافتہ کہلا سکتے ہیں؟
ہمارے دلوں پر یورپین سائنس دانوں اور موجدوں کا اس قدر رعب غالب ہے کہ ہم اُن کی ہر بات تسلیم

کرنے کو تیار ہیں۔ ایسی افواہوں پر بازاری لوگ ہی صرف یقین نہیں کرتے بلکہ وہ اخبار نویس سب سے پہلے یقین کر لیتے ہیں جو ان افواہوں کو پھیلاتے ہیں۔ مذہبی خیال کے لوگ سائنس کی فوق العادت طاقت کو شیطان کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کے شر سے بچنے کے لیے خدا سے دعائیں مانگتے ہیں کیا ہماری قوم کے دل و دماغ کی یہ حالت جو میں نے بیان کی تسلی بخش ہے؟ کیا ہم ابتدائی تعلیم کو عام کر کے قوم کے دل و دماغ کو بلند کر سکتے ہیں؟ نہیں اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہماری اپنی قوم میں ایسے محقق اور مفتش پیدا ہوں جو باقی لوگوں کے لیے روشنی اور رہ نمائی کا موجب ہوں۔ بغیر ان لوگوں کے ہماری قومی تعلیم کی بنیاد محکم نہیں ہو سکتی۔ عوام الناس کے خیالات اور حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہوگا کہ ان کے اپنے ہم وطن اور ہم مذہب لوگ بھی وہ قابلیت پیدا کر سکتے ہیں جو یورپین سائنس دانوں کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھی۔ جب ان کو یہ نظر آنے لگے گا تو بڑی سرعت کے ساتھ ان میں ایجاد کا مادہ ترقی پائے گا اور ان کے اخلاق میں مضبوطی اور خودداری پیدا ہو جائے گی۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کام کا معیار گریجویٹوں کی تعداد نہیں ہونی چاہیئے جو وہ سال بھر میں پیدا کریں۔ بلکہ معیار یہ ہونا چاہیے کہ ان کے اندر کس قدر نئے علمی حقایق و معارف دریافت ہوتے ہیں۔

اپنی تعلیم گاہوں میں تحقیقات کی روح پیدا کرنے سے قوم میں رواداری اور بے تعصبی کا مادہ بھی پیدا ہوگا سچائی کی روح سے بڑھ کر کوئی چیز باہمی تنازعات کو مٹانے والی نہیں۔ سچی راہ ایک ہی ہوتی ہے مگر غلط راہیں بہت ہوتی ہیں۔ اگر قوم کے تعلیم یافتہ لوگوں میں حق بینی اور تحقیقات کی روح پیدا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ قوم اتفاق سے اس طرح پاش پاش ہو جیسی کہ اب نظر آتی ہے آپ سب نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی باہمی ردو کد اور حیص بیص کو دیکھ لیا ہو جس مسئلہ پر وہ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں وہ نہ بہت عمیق ہے اور نہ مشکل، مگر چوں کہ قوم کے دماغوں نے بحث مباحثہ کی تربیت پائی ہے اور ٹھنڈے دل سے تحقیق کرنے کے عادی نہیں اس لیے صلح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سچائی کی محبت سے زیادہ کوئی چیز خیالات کو بلند اور حوصلوں کو وسیع نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے مباحثے اور مجادلے کی روح سے زیادہ کوئی چیز تنگ ظرفی اور تنگ دلی کو نہیں بڑھاتی۔ بحث و جدال کی غرض دوسرے پر فوقیت پانا ہوتی ہے اور اس کی خوراک لڑائی جھگڑا ہے۔

سچائی کی محبت بھی دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو مبلغ میں ہوتی ہے۔ اور دوسرے وہ جو حق کے متلاشی میں پائی جاتی ہے۔ مبلغ ایک امر کو تحقیق کے بعد یا بلا تحقیق کے صحیح مان لیتا ہے اور اپنے جان و دل سے دوسرے لوگوں کو منوانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ معلوم کرے کہ اس کی سچائی واقعی سچائی ہے یا پوشیدہ جھوٹ ہے اسے ہمیشہ اپنی صورت اور اپنے اطوار سے یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے

کہ جس مدعا کی وہ وکالت کر رہا ہے اُس کے متعلق خود اُسے کامل یقین ہو اور کسی قسم کا شک اس کے دل میں نہیں آتا۔ پراپگنڈا" کرنے والے کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ وہ حق کی جستجو نہیں کر سکتا۔ جوئندۂ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خیالات کا ہمیشہ امتحان کرتا رہے۔ اُن کے نقائص دور کرتا رہے اور اُن کو حق کے قریب تر لانے کی کوشش میں لگا رہے۔ جس چیز کا وہ مطالعہ کرے اُس کے نئے پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے اور جو کچھ وہ اپنے ذہن میں رائے قایم کر چکا ہے اُس کے چھوڑنے کے لئے اُسے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے اسکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے دلوں میں سچائی کی محبت کو قایم کرنا چاہیئے نہ کہ مباحثے اور مجادلے کی عادت کو تعصب سے زیادہ کوئی چیز افراد و اقوام کے قوائے ذہنی کو نقصان نہیں پہنچاتی ہیں نے ابھی تک قوم کو ہی مخاطب کر کے علمی تفتیش اور تحقیقات کے لیے وسائل بہم پہنچانے کی فہمایش کی ہے مگر میں اب چند الفاظ اپنے اہل علم اصحاب کو بھی کہنا چاہتا ہوں کیونکہ اس کام کی ذمہ داری آخر کار انہی کی سر ہوگی۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے اہلِ علم موجود ہیں جو ہندوستان اور یورپ میں پوری تعلیم حاصل کر چکے ہیں اور وہ اس کام کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انھیں فرصت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ علمی تحقیق اور تفتیش کے کام کو انجام دیں اور اسے اپنا شغل بنائیں تو اُن کی اور اُن کی قوم و ملک کی عزت کا باعث ہوگا۔ ہندوستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ درجہ کی اسناد حاصل کر لینا کافی نہیں۔ اُن کے کام کا موازنہ اس اندازہ سے کیا جائے گا کہ دنیا کے موجودہ علم میں انھوں نے کتنا اضافہ کیا۔ قدرت نے ہر ایک کے حصہ میں نہیں رکھا کہ وہ نئے قوانین فطرت دریافت کرے یا دنیا کے مسلمات میں انقلاب پیدا کر دے مگر ہر ایک شخص نئے حالات مشاہدہ کر کے اُن کو جمع و مرتب کر سکتا ہے۔ اگر آپ میں خوشنما محلات تعمیر کرنے کی قابلیت نہیں ہے تو اُس کے لیے اینٹیں بنانا تو بہت مشکل کام نہیں، اگر آپ اتنا ہی کر سکیں تو آپ نہ صرف سچائی کی خدمت کریں گے بلکہ خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال دنیا پر آشکارا کریں گے کیونکہ سب سے بڑی اور خوبصورت ترین سچائی خود باری تعالےٰ عزّ اسمہٗ کا وجود ہے۔

زراعتی تعلیم

آپ شاید بے چینی کے ساتھ اُس سوال کا جواب سُننے کے منتظر ہوں گے جو ابتدائی تقریر میں خود میں نے کیا تھا یعنی یہ کہ مسلمانوں کو کون سے پیشوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ تیار کرنا چاہیئے؟ مگر تعلیم کی اصولی اور بنیادی غرض کو روٹی کمانے کے ذرایع اور وسائل کے ذکر سے پہلے بیان کرنا لازم تھا۔ انسانی زندگی کا سہارا صرف روزی ہی پر نہیں ہے۔ جب آپ اپنی قوم کی ترقی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صرف تعلیم سے ہی ہمیں راہِ نجات مل سکتی ہے، تو غالباً آپ کا اس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ اگر آپ تعلیم پا جائیں تو آپ کو کھانے کو زیادہ ملے گا۔ پہننے کو نفیس کپڑے ہونگے اور رہنے کے

لیے عمدہ مکانات ملیں گے ۔ ملک میں آپ کا اثر اور دنیا میں آپ کی عزت اور شہرت ہوگی ۔ اگر ان چیزوں کے آپ خواستگار ہوں تو حق بجانب ہیں ۔ کوئی انسان ذلت اور مصیبت کی زندگی سے خوش اور اس پر قانع نہیں ہو سکتا ۔ مگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کس قسم کی تعلیم ہم کو یقیناً اور جلدی اُن مقاصد تک پہونچا سکتی ہے ۔ اگر آپ ایک محل میں رہتے ہوں اور دسترخوان پر پانچ پانچ طرح کے کھانے چنتے ہوں اور آپ کا بھائی ایک پھونس کے چھپّر کے نیچے زندگی بسر کرے اور اُسے اپنے سوکھے ٹکڑے حلق سے اُتارنے کے لیے پانی میں بھگونے پڑیں، اور آپ کو علم ہو کہ آپ کی دولت اُس کی اور اُس جیسے اور فاقہ کش مزدوروں کی کمائی کا نتیجہ ہے ۔ تو آپ کے محل اور رنگ برنگ کے کھانوں سے آپ کو کیا خوشی اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے!

اگر آپ کا گزارہ علمی پیشوں کی کمائی پر ہے تو یہ آپ کی حالت کا صحیح نقشہ ہے ۔ ملک کی دولت کا جس قدر حصہ آپ کی جیب میں آتا ہے اُسی اندازے سے دوسروں کی جیبیں خالی ہو کر آپ کی دولت زیادہ اور دوسروں کی پونجی کم ہوتی ہے ۔ آپ جوار یا گیہوں کی ایک بال بھی نہیں اگاتے، آپ سوت نہیں کاتتے، آپ کپڑا نہیں بنتے ۔ آپ کے لیے کاشتکار اور جولاہے یہ کام کرتے ہیں ۔ آپ اُس کے عوض اپنے علم سے صرف اُن کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں جس کا فائدہ اکثر مشکوک ہوتا ہے ۔ آپ خود اس صورت سے امیر بن سکتے ہیں مگر اپنے ملک یا قوم کو امیر نہیں بنا سکتے! جب تک آپ ایک خوشہ کے بجائے دو نہ پیدا کریں اور ایک گز کپڑے کے عوض دو گز کپڑا نہ بنائیں ملک امیر نہیں ہو سکتا ۔ آپ کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعلیم اس میں کارآمد نہیں ہو سکتی ۔ اس غرض کے لیے آپ کو کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنا چاہیئے ۔ اگر ہمارے بڑے بڑے زمینداروں کی سالانہ آمدنی لاکھوں تک پہنچتی ہے ۔ نوجوانوں کو کھیاوی کاشت اور زراعت کے جدید طریقوں کی تعلیم دلائیں اور پھر اُنھیں اپنی زمینداریوں پر ملازم رکھیں تاکہ وہ ان کی پیداوار کو زیادہ کریں تو وہ اپنے آپ کو، اپنی قوم کو، اپنے ملک کو امیر بنا سکتے ہیں ۔ مگر جو حالت میں خود اپنے صوبہ میں دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ بڑے بڑے زمینداروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُن کی کتنی زمین ہے، اور وہ کہاں واقع ہے؛ اپنی آمد و خرچ کے حساب کی بھی جانچ نہیں کرتے تمام زمین ایک مقررہ اجارے پر کاشتکاروں کو دیدی جاتی ہے ۔ جو اپنے آرام کی خاطر اُسے ایسے طریق سے کاشت کرتے ہیں جس میں کم سے کم محنت پڑے خواہ پیداوار زیادہ نہو ۔ ہزارہا بیگہ زمین زمینداروں کی غفلت کی وجہ سے بنجر پڑی رہتی ہے ۔ یہ زمیندار قدیم وضع کے ناواقف لوگ نہیں بلکہ اُنھوں نے وہ سب علوم حاصل کیے ہیں جو آپ اپنے اسکولوں اور کالجوں میں سکھاتے ہیں مگر اُنھوں نے صرف خرچ کرنا سیکھا ہے ۔ کمانا اور بڑھانا نہیں سیکھا ۔ اگر آپ انھیں علمی اور عملی زراعت سکھاتے اور اُن میں زمینوں پر کام کرنے کی رغبت پیدا کرتے تو وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم

کو فارغ البال اور نہال کر دیتے! مگر آپ نے اُن کو قانون داں بنا دیا ہے ۔ انھیں اپنے حقوق کا علم سکھا دیا ہے اور مہذب طرزِ معاشرت جس کے معنی "مسرفانہ زندگی" ہیں سکھا دی ہے ۔ اگر آپ کی زمین بلا کاشت پڑی ہے اور آپ کا سرمایہ قلیل ہے ۔ تو محض حقوق کا علم حاصل کرنے سے کیا فائدہ ؟ آپ نے تہذیب مغربی کے صرف ایک پہلو کی نقل اُتاری ہے یعنی اُس تعلیم کی جو یونیورسٹیوں سے مخصوص ہے اور ایسے علوم و فنون کو چھوڑ دیا ہے جن سے دولت پیدا ہوتی ہے ! میں اس بیان کو واضح کرنے کے لیے کہ انگریز ان کاموں کو کس کس طرح کر رہے ہیں ۔ مسٹر رابرٹس برون ماہر زراعت صوبۂ سرحدی کے ایک لیکچر سے جو انھوں نے اسلامیہ کالج پشاور کے یونین ہال میں کچھ عرصہ ہوا دیا تھا، چند اقتباسات نقل کرتا ہوں ۔

میں آپ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ میرے ملک اسکاٹ لینڈ میں کس کس طرح زراعت و فلاحت کو ترقی دی گئی ہے ۔ وہاں بھی اس صوبے (سرحد) کی طرح چند بڑے بڑے زمیندار ہیں ۔ بعض کی تمام آمدنی زمین کی پیداوار سے بہم پہنچتی ہے ۔ بعض تجارت میں لگے ہوئے ہیں ۔ مگر شوقیہ زراعت بھی کرتے ہیں، اور تقریباً سب ہی خود کاشت کے لیے کچھ کھیت الگ رکھتے ہیں ۔ مقصد اس کا بعض اوقات اپنے کھانے پینے کے لیے عمدہ سبزی، ترکاری اور اناج بہم پہنچانا ہوتا ہے، بعض کو کسی خاص صنف زراعت کا شوق ہوتا ہے، بعض گھوڑوں کے شوقین ہوتے ہیں اور بارکش گھوڑوں کی طاقتور نسلیں اور نوعیں پیدا کرتے ہیں، بڑے شوق سے جانور پالتے ہیں ۔ بہترین سانڈ مول لیتے ہیں اور کسی نہ کسی قسم مویشی یا جانور کی افزائش نسل سے موسوم انجمن کے ممبر ہوتے ہیں ۔ اُن کے پرورده سانڈ اُن کے کاشتکاروں کے کام آتے ہیں ۔ بعض دل بہلانے کے ہی لیے دودھ و مکھن سازی کے کارخانے چلاتے ہیں ۔ بہترین دودھ والی گائیں پالتے ہیں ۔ اُن کے دودھ کی کمی بیشی کے وجوہات کی یادداشتیں اور نقشے رکھتے ہیں، کارآمد جانوروں کی افزائش نسل کی مساعی انجمنوں کے ممبر ہوتے ہیں جن کا مقصد جانوروں کی دودھ کی مقدار کا بڑھانا اور مویشیوں کی ترقی نوع میں کاشتکاروں کی معاونت کرنا ہوتا ہے، بڑے بڑے دولتمند اور خاندانی امرا بڑے شوق اور ولولہ سے ڈیری کا مشغلہ کرتے ہیں ۔ ہزمیجسٹی الگزنڈرا بڑے شوق سے ڈیری میں اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں" !

"بعض زمین کی کاشت عمدہ ترین اقسام کے گیہوں جو اور دیگر اناج پیدا کرنے کی نیت سے کرتے ہیں ۔ مگر یہ کام عموماً سوداگرانِ تخم کرتے ہیں، جو اعلےٰ سے اعلےٰ قسم کے پودے اور بیج پیدا کرتے اور بیچتے ہیں ۔ تخم فروشی بڑی بڑی تنخواہوں پر ایسے ماہرانِ فلاحت کو ملازم رکھتے ہیں، جو نئی نئی قسم کے بیج اور پودے پیدا کریں ۔ الغرض یہ لوگ خود اپنی اُمنگ سے وہ تمام کام کرتے ہیں جن کو ہندوستان میں سرکاری محکمہ ہائے زراعت انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں" ....

... انگلستان کی زراعتی ترقی کے لیے کام کرنے والوں میں ایک اور گروہ کا ذکر بھی ضروری ہے یہ مرغیاں پالنے والے ہیں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ انگلستان کے ہر چھوٹے بڑے قصبہ میں "مرغ پروروں" کی ایک کلب اور سوسائٹی پائی جاتی ہے؟ ہر گاؤں میں مرغیوں کے شوقین ہیں۔ بعض مرغیوں کے نسب نامے بلا مبالغہ اسی طرح محفوظ رکھے جاتے ہیں، جس طرح پرانے سے پرانے امراء کے خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب محفوظ رہتے ہیں۔ اور اُتنی ہی پشت تک چلے جاتے ہیں! مرغیوں کی بعض اقسام کے انڈوں کا حساب بیس بیس سال سے رکھا جاتا ہے۔ بہتوں کے پاس ایسی مرغیاں ہیں جو سال میں ۲۰۰ دو سو انڈے دیتی ہیں" یہاں تک مسٹر رابرٹس برون کے لیکچر کا اقتباس تھا۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں کتنے زمیندار ہیں جو زراعت کے ان شعبوں میں دلچسپی لیتے ہوں؟ یہ تمام بوجھ اور اُس کے ساتھ ناکامی کا الزام حکومت پر کیوں ڈالا جاتا ہے؟ ہمارے صوبہ سرحدی میں بھی لوگ بعض جانوروں کے نسب کی پرواہ کرتے ہیں لیکن وہ کون سے جانور ہوتے ہیں۔ وہ مرغ۔ سانڈ یا بٹیر ہوتے ہیں جو لڑانے کے کام آتے ہیں! جس چیز پر مجھے زیادہ تعجب ہوتا ہے وہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات ہیں۔ جو وہ افزائش پیداوار اور زراعت کے فنون کی نسبت ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری قومی مجالس میں ریزولیوشن اس امر کے متعلق پیش اور پاس کیئے جاتے ہیں کہ مسلمان زراعت کی تعلیم حاصل کریں تاکہ محکمہ جات زراعت تجارت، صنعت و حرفت میں اعلیٰ عہدوں پر مامور ہو سکیں! میں حیران ہوں کہ آپ کب ملازمت کے خیال کو چھوڑیں گے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں گے؟ ہماری آنکھوں میں ایک قسم کی کجی ہے، جو نظر کو ہمیشہ ملازمت کی طرف مائل رکھتی ہے! اس کی اصلاح ضروری ہے۔ ایک امیر زمیندار کے رستہ میں کیا روک ہے کہ وہ اپنے فرزند کو زراعت کی تعلیم دے اور زمینداری کے کام پر لگا دے؟ مگر نہیں! وہ اُسے ضرور قانون کی تعلیم دیگا اور زمین کو جاہل کاشتکاروں کے سپرد کر دیگا۔ یا اگر اُسے زراعت کی تعلیم دیتا ہے تو اُس کے لیئے محکمہ زراعت میں ملازمت کی کوشش کریگا۔ اولاد کو زمینداری کے انتظام پر صرف اُسی صورت میں لگایا جاتا ہے جب وہ کسی اور کام کے لائق نہ ہو۔ بلکہ اس کام کے بھی ناقابل ہو۔

تجارتی تعلیم

اب میں ایک اور قسم کے پیشہ کی تعلیم کی طرف آپ کی توجہ کو منعطف کرنا چاہتا ہوں جس سے گو ملک مالدار نہیں ہوتا مگر آپ کی قوم کے پاس زیادہ روپیہ آسکتا ہے۔ میرا مطلب تجارت سے ہے یہ بڑا فائدہ مند پیشہ ہے اور آپ کے برادران وطن کی دولت کا بیشتر حصہ اسی کے ذریعہ کمایا جاتا ہے میں اسے مفید افزائش دولت و پیداوار پیشوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس سے ملک کی مجموعی دولت میں اضافہ نہیں ہوتا اور نہ میری دانست میں یہ پیشہ ناگزیر ہے جس کے بغیر کسی اقتصادی اور معاشرتی نظام

میں گزارہ نہ ہوسکتا ہو۔ مگر سرمایہ داری کے طریق کے تحت جو اس ملک میں اور دیگر بہت سے ممالک میں رائج ہے تاجر کا پیشہ بڑا ضروری اور سیر حاصل پیشہ ہے۔ اس کے لیے بہت اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں اس پیشہ میں تجارت کے اصول سکھانے نہیں بلکہ تجارت کا عملی کام سکھانا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض طبائع ہر چیز کا مطالعہ اس کے اولیات سے شروع کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ ہر چیز یونیورسٹی میں سیکھی جاتی ہے اگر اس قسم کے تخیلات عمل میں کام نہیں آتے۔ آپ کو ایسی تجاویز کو سننے میں بھی تضیع اوقات سے بچنا چاہیئے کہ آپ اپنے بچوں کو تجارت کے گریجویٹ بنائیں اور پھر سرکار سے درخواست کریں کہ اس عجیب الخلقت آفرینش کے لیئے ملازمتیں مہیا کرے۔ زیادہ سے زیادہ تعلیم جو آپ کے عملی تاجر کے لیئے ضروری ہے وہ ہائی اسکول کی تعلیم ہے؛ میں خاص حالات کا ذکر نہیں کرتا جو بطور استثنا پیش آسکتے ہیں مگر قوم کو اس سے زیادہ کا انتظام نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر آپ اس سے زیادہ کا انتظام کریں گے تو اپنے روپیہ اور طالب علم کی قوت دونوں کو اکثر ضائع کریں گے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس تعلیم کی بدولت اس کا مذاق ہی بدل جائے جب یہ نوجوان اسکول فائنل کا امتحان پاس کرلیں تو انھیں کسی بڑے تاجر کے کارخانہ میں بطور شاگرد بھیج دینا چاہیئے۔ ان کی ضروریات تھوڑی ہونی لازم ہیں اور ان کے مطالبات کم ہونے چاہئیں۔ صرف اسی صورت سے وہ ہندو تاجروں کا مقابلہ کرسکیں گے۔ خوش قسمتی سے مسلمانوں میں بوہروں اور خوجوں کی تاجر قومیں موجود ہیں۔ جو تجارتی قابلیت میں دنیا کی ہر قوم سے مقابلہ کرسکتی ہیں۔ ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہیئے۔ جس کے ذریعہ آپ کی قوم کے ہونہار اور نیک چلن بچے جن کو اس طرف رغبت ہو، آپ کے تاجر بھائیوں بوہروں اور خوجوں وغیرہ کی دوکانوں میں تجارت کا کام سیکھنے کے لیے بھیجے جاسکیں۔ ہر نوجوان اسی کام کو سیکھے جس کو وہ آئندہ زندگی میں اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اُسے صرف اُس قدر تنخواہ پر قانع ہونا واجب ہے جو کارخانہ دے سکے۔ کارخانہ پر اس کا کچھ بوجھ نہیں ہونا چاہیے اور بازاری شرح سے زیادہ اُس کی تنخواہ مناسب نہیں۔ آپ اس قسم کا ایک دفتر قائم کریں جہاں آپ کی قوم کے تاجر اپنی ضرورتوں کی اطلاع دے سکیں اور آپ کے اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر ایسے لڑکوں کے نام بھیج سکیں جو تجارت کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہوں۔ کیا آپ کی قوم کو تجارت کا علم سکھانے کے لیئے اس سے بڑھ کر قابل عمل اور کم خرچ کوئی تجویز ہوسکتی ہے؟ اگر یہ بھی قابل عمل نہیں تو میں حیران ہوں کہ آپ کے لیے کون سی بات قابل عمل ہوسکتی ہے! اس کے لیے ہمارے تاجروں میں تھوڑی فراخ حوصلگی کی ضرورت ہے۔ اگر ان لوگوں نے اس سے پہلے اس کام میں دلچسپی لینے سے انکار کردیا ہے تو دوبارہ اُن سے استدعا کرنی چاہیئے۔ سب ایک رائے کے تو نہیں ہوسکتے۔ اُنھیں اپنے بھائیوں کو تجارت کے راز بتانے میں بخل سے کام لینا نہیں چاہیئے۔ اگر یہ لوگ کام سیکھ کر اپنے کاروبار کھولیں گے تو اکثر اُن کے

معاون و مددگار اور گاہک ہی ہونگے۔ اور اگر اپنے کام کھولنے کے لیے اُن کے پاس سرمایہ نہ ہوگا تو انہی کے کارخانوں میں بطور نائب و منیجر کام کریں گے۔ بوہرے اور خوجے اپنے نیک کاموں کے لیے مشہور ہیں۔ ان کو چاہیے کہ خیرات کو اُس کے بہترین معنوں میں سمجھیں۔ سب سے اعلیٰ قسم کی خیرات وہ ہے جس سے کسی شخص کو روزگار کے لائق بنا دیا جائے۔ میں بوہروں اور خوجوں تک ہی اس اپیل کو محدود نہیں کرتا بلکہ جہاں کہیں مسلمانوں میں صاحب کاروبار تاجر موجود ہوں انہیں قوم کے ہونہار بچوں کے لیے اپنے دروازے اور دل کھول دینے چاہئیں!

بعض کروڑپتیوں اور ہزار ہا لکھ پتی اور خوش حال ہندو دوکان داروں کی زندگیوں پر نگاہ کرکے ہمیں اُن غریب طالب علموں کے مستقبل کی نسبت جو ایسے حالات میں تجارت کو پیشہ بنائیں گے مایوس و متفکر نہ ہونا چاہیے۔ جب میں اپنے صوبہ کی زرخیز زمین کو دیکھتا ہوں اور اُن فصلوں کو جو اُن میں پیدا ہوتی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ جو دولت ان زمینوں سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ سب جائز یا ناجائز طریقوں سے کسی نہ کسی تاجر کے گھر میں چلی جاتی ہے۔ نیز جب میں اُن تاجروں کی دولت کو دیکھتا ہوں جو انھوں نے ایک ہی عمر میں کمائی ہے۔ اور جب میں زمینداروں اور سرکاری ملازموں کے افلاس اور شکستہ حالی کی طرف نظر کرتا ہوں تو میں یہ محسوس کیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ تعلیمی پالیسی درست نہیں جو ہم سے ہل چھوڑ کر اور ہمیں دوکان کے تختے سے اٹھاکر دفتر کی کُرسی پر بٹھانا چاہتی ہے!

صنعتی تعلیم

اب میں ایک ایسی تعلیم کا بیان کرنا چاہتا ہوں جس کی میں اس لیئے قدر نہیں کرتا کہ وہ آپ کی دولت کو بڑھائے گی بلکہ اس کی دقعت میرے دل میں اس لیے ہے کہ وہ آپ کی قوت اور اقتدار کو مفید ہوگی۔

قریب مستقبل میں آپ کو دو باتوں میں سے ایک اختیار کرنی ہوگی۔ یا تو آپ کو زمانہ حال کے عیش و عشرت کے ساز و سامان ترک کرنے ہوں گے یا ان کو اپنے ملک میں تیار کرنا ہوگا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ میں سے بہت کم ان خوش نما لباسوں کو اتار کر پھینک دینے اور اُن بے شمار اشیاء کے بغیر گذارہ پر رضا مند ہوسکیں گے جو مشین سے تیار ہوتی ہیں۔ آپ میں سے بہت کم بیل گاڑیوں میں سفر کرنا پسند کریں گے یا دیہاتی گنواروں کی طرح برہنہ پا گٹھری لٹھ پر لٹکا کر کچی سڑک پر جوتیاں ہاتھ میں لیئے چلنا گوارا کریں گے۔ میری دانست میں اس وضع کو کوئی اختیار نہیں کرے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی۔ اگر آپ غیر ملکی صناعوں کی دائمی غلامی میں رہنا نہیں چاہتے تو اپنی ضروریات معاشرت خود پیدا کریں۔

ایک وجہ اور بھی ہے کہ ہمیں کیوں اپنے نوجوان کو صنعتی پیشوں کی جانب مائل کرنا چاہیئے؟ آپ بھی اپنے

غیر مسلم برادران ملک کے ساتھ مل کر اپنی قسمت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی آرزو رکھتے ہیں۔ دوسرا سوال غیر مسلموں کے دوش بدوش اور ہم پلہ رہنے کا بھی ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو اُن ذمہ داریوں کے لیے جو عنقریب آپ پر عائد ہونے والی ہیں۔ اور دوسرے ہر قسم کے تمدنی امور حوادث کے لیے ابھی سے تیار نہیں کریں گے تو اندیشہ ہے۔ کہ وقت پر آپ اُن ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے اہل ثابت ہوں گے! حکومت سے جو سیاسی حقوق اور مراعات آپ طلب کر رہے ہیں وہ ہر مقصد کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ آپ کو بالآخر اپنی ہی قابلیت اور اپنے ہی ذرائع اور وسائل پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اگر آپ کی ہمسایہ اقوام نے ایک ذمہ دار حکومت کے تجارتی صیغوں محکموں سررشتوں اور بنکوں اور مال و خزانوں کے دفاتر کے لیے قابلیت پیدا کرلی ہے تو آپ کو صنعتی اور زراعتی محکموں اور صنعتوں کے لیے ہنرمند کاریگر، دستکار و مشین ساز مہیا کرنے چاہئیں۔

کسی قوم کو اس کی سیاسی ذمہ داریوں کے قابل بنانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بڑی بڑی افواج ہی بھرتی کی جاویں کیوں کہ جب تک یہ افواج پوری طرح منظم اور کامل طور سے آراستہ نہ ہوں۔ وہ کچھ مفید نہیں ہو سکتیں۔ ہمارا جنگ عظیم کا تجربہ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ تعداد افواج پر اتنا انحصار کامیابی نہیں جتنا کہ انتظام اور سامان پر فتح و نصرت کا دار و مدار ہے! پس اگر آپ اپنے آپ کو زراعت اور صنعت و حرفت کے صیغوں کے لیے تیار کریں تو آپ ہندوستان کی حکومت کے کوئی ادنیٰ اور غیر ضروری جزو ثابت نہیں ہوں گے۔ ایک ملک کی نظم و حکومت کے لیے اوّل سرمایہ اور اس کے بعد قابل صنّاع دستکار اور مزدور لابد ہوتے ہیں۔ بلکہ میری رائے میں محنتیوں کی ضرورت سرمایہ پر بھی مقدم ہے۔ خیال کر لیجئے کارخانوں کے مزدور، ٹریم و موٹروں کے ڈرائیور، بجلی کے مستری اور سینکڑوں دیگر صنعت و حرفت کی مجموعی مشینری کے زندہ انسانی کل پرزے اگر مل کر ہڑتال کر دیں تو کلکتہ، بمبئی اور دوسرے عظیم الشان شہروں کا انتظام ایک منٹ بھی چل سکتا ہے؟ میرا مطلب اس توضیح سے صرف یہ ہے کہ اگر آپ صنعت و حرفت اور فنون کارآمد میں کمال پیدا کریں اور اسے اپنی قومی خصوصیت بنا لیں تو آپ ملکی جسم کا ایک ایسا ضروری عنصر ہو جائیں گے جس کے بغیر ملک و قوم کی زندگی محال ہو گی۔ ملک کے کارخانے، ریلیں اور تار قومی جسم کے لیے بمنزلہ دست و پا اور آنکھ اور کانوں کے ہیں۔ بغیر ان کے قوم ایک بہرے گونگے اور اندھے اپاہج کے مثل ہے جس پر صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ صادق ہے نیز جہاں ڈاکٹر اور وکیل قانون داں اور معلم زیادہ ہوں۔ اس ملک کی مخلوق بحیثیت مجموعی اس زمین پر رینگنے والے کیڑے کی مثال ہے جس کا سر جسم سے بھاری زبان ضرورت سے زیادہ لمبی مگر دست و پا ندارد ہوں کہ ان کے بل پر کھڑا ہو سکے یا روزمرہ تمدن میں آنے سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ آپ ہو سکے معلّموں، فاقہ کش وکیلوں اور بیکاروں کی تعداد کو بڑھانے کی فکر میں ہیں۔

اس خالی میدان یعنی صنعت و حرفت اور فنون میں ترقی کی گنجایش کو نہیں دیکھتے جہاں ابھی بہت تھوڑا مقابلہ ہے گریجویٹ پیدا کرنے میں تمام قوت صرف کر دینے کے بجائے آپ کو کل پرزے اور آلات کے صناع اور برقیات کے ماہر پیدا کرنے کی کوشش چاہیے۔

ابتدائے کلام میں جو میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کو وہ پیشے اختیار کرنے چاہئیں جن کے لیے آپ میں خاص استعداد ہو تو میرا مطلب یہی تھا مسلمانوں میں فنون کار آمد کے ہنرمندوں اور آبائی پیشہ ور دستکاروں کے قصبے کے قصبے آباد ہیں۔ ان لوگوں کی گھٹی میں مشینوں کا علم پڑا ہے اور وہ کل پرزوں کو اپنی طفولیت سے پہچانتے ہیں۔ کیا ہم نے ان کو اُبھارنے کے لیے کچھ کیا ہے ؟ کیا ہم نے ان کی خداداد استعداد کو قوم کے فائدہ کے لیے کام میں لانے اور بہتر بنانے کی کوشش کی ہے؟

اگر ہم اُن کے لیے سرمایہ مہیا نہیں کر سکتے تو کم از کم ہم انھیں جدید آلات اور طریقوں سے تو آشنا کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے کارخانے لایق ہو کر خود بنائیں گے۔ اب بھی بہت سے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے کامیاب کارخانے قوم کی امداد کے بغیر صرف اپنے قوت و بازو سے بنا رکھے ہیں قوم سے ایک لفظ "تحسین" کے بھی وہ شرمندہ اور متوقع نہیں! ہر سال کروڑوں روپیہ ہندوستان اور یورپ میں نوجوانوں کی کتابی تعلیم پر ہم خرچ کرتے ہیں اور اس کے لیے وظائف و امداد دیتے ہیں۔ کامیاب وکیلوں اور معلموں کی اُن کی لفظی بحثوں اور گویائیوں پر پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ مگر قوم کے ان عملی اعضا اور کار آمد جوارح کو اپنی مجالس میں شریک تک نہیں کرتے! کل پرزوں اور آلات کے عامل و صناع اور برقیات کے ماہر بلکہ سب ہنرمند پیشہ ور دستکار زمانۂ حال کی سوسائٹی کا آہنی پیکر اور ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ہر ملک کی اصلی طاقت اس کے صناعوں اور ہنروروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس ملک میں اس فرقہ نے نشو و نما نہیں پائی اقوام عالم میں اس کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں۔ علمی پیشہ کے لوگوں میں نہ وہ برداشت گرم و سرد کی ہوتی ہے اور نہ وہ ہنر جو ایک حقیقی مقابلہ کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ روس میں وکیل بے کار ہوئے تو ان کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا کہ اس کے سوا وہ کسی اور کام کے لیے موزوں نہ سمجھے گئے۔ آپ سرکاری ملازمتوں میں اپنے آدمی داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ حکومت کے ہر محکمہ میں اپنا جائز حصہ مانگیں تو حق بجانب ہوں گے مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حکومت کی طاقت کا منبع اور خزانہ کہاں ہوتا ہے۔ طاقت اصلی دفتروں، مجسٹریٹوں اور گورنروں میں نہیں ہوتی بلکہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اس حکومت کی ریل اور تار کے سلسلوں، جہازوں اور کارخانوں پر متصرف ہوں۔ سرکاری دفاتر کا ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجانا بجائے خود اچھی بات سہی مگر ریلو

تاروں سرکاروں کارخانوں کا ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ہندوؤں نے علمی پیشوں میں اور تجارت و کاروبار میں مہارت پیدا کرلی ہے۔ آپ صنعت و حرفت کے کاموں میں مہارت پیدا کریں۔ ان کے خون اور رگ و پے میں اگر تجارت اور کاروبار ہیں تو تمہارے خون اور رگ و پے میں صنعت و حرفت موجود ہے۔ تمہارے درمیان لوہاروں، موچیوں، اور جولاہوں کی بڑی تعداد میں ہونا تمہاری بدقسمتی نہیں بلکہ خوش قسمتی ہے کہ تمہاری قوم میں یہ لوگ موجود ہیں تمہارے ہندو بھائیوں نے مدت ہوئی اُن کو اپنی قوم سے نکال دیا تھا، اُنھوں نے بڑی غلطی کی اب وہ پچھتاتے ہیں اور اُن کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ تمہیں ان کی تقلید نہیں چاہیئے۔ اگر آپ انھیں تعلیم دیں اور انھیں اسی درجہ کا ہنر سکھائیں جیسا کہ یورپ کے ہُنرمندوں میں ہے تو آپ نہ صرف اپنی غربت کے مسئلہ کو حل کرلیں گے بلکہ اپنے دست و بازو مضبوط کرلیں گے!

میں یہ نہیں بتا سکتا ہوں کہ آپ کو اس ملک میں چھوٹے پیمانہ پر کارخانے کھولنے چاہئیں یا بڑے اسکیل پر یا اس مسئلہ کا حل حالات کے مطابق ہوگا۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ "اپنے ہنرمند اور کاریگروں کو آلات اور کل پرزوں کے استعمال میں ماہر کرو"۔ یہ سب سے بڑی خدمت ہے۔ جو آپ اپنے ملک اور قوم و مذہب کی کرسکتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کاریگروں کے لیے یہاں کام فراہم نہ کرسکیں گے تو اُن کو مشرق و مغرب میں کہیں بھی بھیجدیں ہر جگہ اُن کے ہنر کی قدر کی جائے گی۔ مسلمانوں کے ایسے بہت ملک ہیں جہاں لوگ ان کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ خیال نہ کرو کہ وہ بھوکے مریں گے اور اسی طرح قوم پر بوجھ ہوں گے جیسے کہ آپ کے گریجویٹ ہیں۔ جہاں انگریزی نہیں سمجھی جاتی ہے وہاں آپکے گریجویٹ بیکار ہیں مگر مشینوں کی زبان تمام دنیا میں ایک ہی ہے ہر ملک میں سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں جو آپ اپنے مسلمان بھائیوں کو بطور اظہار ہمدردی غیر ملکوں میں بھیجتے ہیں۔ ان کی مشکلات کو حل نہیں کرسکتیں۔ لیکن اگر آپ ان کے پاس ہنرمند کاریگروں کا ایک دستہ بھیجدیں تو یہ حقیقی امداد ہوگی۔

میں کسی ایسی تحریک کے حق میں نہیں ہوں جو ہمیں صنعت کے پُرانے اور بوسیدہ طریقوں کا پابند کرنا چاہتی ہو" میرا رُخ سخن اعلیٰ ٹکنکس اور مشنری کی طرف ہے۔ اور وہی میرے مطمح نظر اور نصب العین ہیں۔ میں اس پر اتنا اضافہ اور بھی کرنے کو آمادہ ہوں کہ آپ کے حوصلہ مند نوجوانوں کو فن جہازرانی بھی حاصل کرنا چاہیئے۔ خواہ انھیں کسی حیثیت میں کام کرنے کا موقع ملے۔ اور جہاں کہیں بھی یہ موقع مل سکے ان کی زندگی خوش گوار ہو یا ناخوشگوار، مگر انھیں اس فن کو سیکھنا ضرور چاہیے۔ ایک وقت آئے گا جب کہ آپ کو اِن آدمیوں کی ضرورت ہوگی اُس وقت آپ کی قوم کی قدر و قیمت اہل فن کی تعداد سے معلوم ہوگی نہ کہ گریجوئٹوں کی تعداد سے!

آپ کو کالجوں میں ریاضی اور سائنس وغیرہ پڑھتے دیکھ کر مجھے پُرانے مکتبوں کے وہ طالب علم یاد

آجاتے ہیں۔ جو عربی صرف ونحو و بلاغت پڑھا کرتے تھے۔ سالہا سال ان علوم کے حاصل کرنے میں لگا دیتے تھے۔ صرف ونحو و بلاغت کے قواعد ان کے نوک زبان ہوتے تھے۔ مگر جب لکھنے بولنے اور پڑھنے میں اُن کے استعمال کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ اُن قابلیتوں سے کوئی کام نہیں لے سکتے تھے۔ اگر علم و ریاضی اور سائنس ہم اس لیئے پڑھیں کہ روزی کمانے کی فکر میں اُن کو فراموش کردیں تو ایسے علم سے کیا فائدہ ہے؟ ان کا سب سے بڑا فائدہ تو جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، انسانی علم و معلومات کا دائرہ وسیع کرنے میں ہے۔ دوسرے درجہ پر ان کا فائدہ عملی فنون میں ہے۔ مگر یہ دونوں استعمال ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ایک میں ترقی ہو تو دوسرے میں ترقی لازمی ہے۔

میں اس پر بحث نہیں کرونگا کہ اِن تخیلات کو حقیقت کا لباس کس طرح پہنایا جائے؟ اس کے فیصلہ کے لیئے ہمیں آپس میں مشورہ کی ضرورت ہوگی۔ سب قسم کے آدمیوں کو اکٹھا کرنا ہوگا وہ جن کو قدرت نے خیالات کی دولت بخشی ہے، وہ جن کو عملی معاملات کا تجربہ ہے۔ اور وہ جن کے پاس روپیہ ہے۔ مگر صرف ایسے آدمیوں کو جو صحیح نیت سے اِن معاملات پر غور کرنا چاہیں۔ تمام عظیم الشان کاموں کے لیے پہلی شرط مستعدی ہے۔ اگر آپ کسی کام کے لیے مستعد ہیں تو آپ ناکام نہیں ہو سکتے خدا کی رحمت ہمیشہ ایسے آدمیوں پر نازل ہونے کے انتظار میں رہتی ہے۔ جو مخلوق کی بہتری کے لیئے کوئی کام کریں۔ بقول شاعر ؎

عام ہیں اس کے تو الطاف شہید سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی "قابل" ہوتا!

آپ میں امیر لوگ بھی ہیں، آپ میں وہ بھی ہیں جن کے پاس لاکھوں روپیہ ہے۔ اور جو لاکھوں روپیہ دے سکتے ہیں اگر وہ اپنی دولت کو ایک قومی وقف سمجھیں جسے انھیں اپنے ہمجنسوں کی بہتری کے لیے صرف کرنا چاہیئے اور یہی ہر متقی مسلمان کا خیال ہونا چاہیئے) تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ شاید بہترین تدبیر یہ ہو کہ ایک انڈسٹریل کانفرنس کا انتظام کیا جائے جو بہتر ہوگا کہ اسی ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ قرار دی جائے۔ جس میں بڑے بڑے تاجر مختلف حرفتوں کے کامیاب کارخانہ دار اور اہل علم شامل ہوں۔ شاید اس صورت سے اس مسئلہ کو حل کرنا ممکن ہو سکے۔ آیا آپ کو بڑے بڑے ٹکنکل کالجوں کی ضرورت ہوگی یا چھوٹے چھوٹے صنعتی اسکول کافی ہونگے یا دونوں کی ضرورت ہوگی۔ طلبا کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان صنعتی وظائف دیکر بھیجنا پڑے گا یا ملک میں بنک اور کارخانے کھولنے ضروری ہوں گے وغیرہ" ان مسائل کو مجوزہ کانفرنس اور مشورہ باہمی کے انعقاد تک ملتوی رکھنا چاہیئے۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں کہ ہر سال ریزولیوشن پاس کر دیئے جائیں جن پر کبھی عمل نہیں کیا جاتا اور جن پر عمل کرنے کی نیت ہی نہیں ہوتی۔ ہم اس طریقہ سے اپنا اعتبار ضائع کرتے ہیں جس وقت تک ہمارا ارادہ واقعی

کچھ کرنے کا نہ ہو ہمیں اپنی زبان بند رکھنی واجب ہے۔ اس باب میں جو مسائل ہو سکتے ہیں ان میں ایک مسئلہ یہ بھی ہو گا کہ صنعتی تعلیم کس زبان میں ہونی چاہیئے؟ یہ ایک بڑا وسیع اور اہم سوال ہے۔ اور یہ موقع اس کی تفصیلی بحث کا نہیں۔ اس کا حل اس امر کے فیصلہ پر منحصر ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان کیا ہو گی یعنی اس ہندوستان کی زبان جس کی قومیت میں شامل ہونے کی ہم سب آرزو رکھتے ہیں۔ اس اہم سوال کو سیاست دانوں خصوصاً سواراجیوں کو حل کرنا چاہیئے۔ ملکی حالات صدہا سال سے اس زبان کے مسئلہ کے حل میں مصروف تھے۔ یعنی ہندوستان میں جب سے مسلمانوں اور غیر ملکیوں کی آمد و شد جاری ہوئی اور مختلف ممالک کے لوگ بڑے بڑے شہروں میں یکجا ہونے لگے تو ایک مشترک زبان مغرب میں "اسپرانتو" کے اجراء کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ زبان اب عام طور پر کل بر اعظم ہندوستان میں پشاور سے طیوطی کارن تک اور بمبئی سے آسام تک سمجھی جاتی ہے۔ قومی تعصبات کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو یہ زبان ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان کا کام دے رہی ہے اور دے سکتی ہے۔ مسلمان اور غیر مسلمان دونوں اس کو برابر استعمال کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑی خوبی اس کی گنجایش ہے کہ حسب ضرورت مسلمان چاہیں تو عربی اور فارسی کے الفاظ اور ہندو اپنی ضرورت کے لیے سنسکرت اور دیسی بھاشاؤں کے الفاظ جس قدر چاہیں داخل کر سکتے۔ بظاہر یہ ممکن نہیں کہ تینتیس کروڑ کی تمام آبادی کو انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جا سکے۔ جو کچھ تعلیم انگریزی موجود ہے۔ اس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چند لوگوں میں عمدہ خیالات اور طاقت ایجاد موجود ہے لیکن انگریزی کے ذریعہ نہ وہ اپنے خیالات کو کونسلوں اور کمیٹیوں وغیرہ میں بخوبی ظاہر کر سکتے ہیں اور نہ موجد اور مخترع اپنی ایجادات اور مصنوعات کو عمدہ طور پر انگریزی میں روشن اور ذہن نشین کر سکتے ہیں اپنی زبان میں اگر چاہیں تو کافی علمی اور کارآمد اصطلاحات نہیں پاتے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کو جزائر برطانیہ کی مختلف زبانوں کی طرح ایک مشترکہ زبان میں بدلنے اور مدغم ہو جانے کے لیئے ابھی صدیاں درکار ہیں۔ اس سے پیشتر اُردو ہی جس میں ہندوستان کی قومی زبان بن جانے کے آثار صدیوں سے نشو و نما پا رہے ہیں اس قابل نظر آتی ہے کہ اس کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے بہر حال یہ ایک اہم سوال ہے جو ایک علیحدہ کانفرنس کی توجہ چاہتا ہے۔ اگر انگریزی کے ذریعہ بھی صنعتی تعلیم دیجائے تو اُس کے لیے انگریزی زبان دانی کی زیادہ ضرورت نہیں تھوڑی انگریزی اس کے لیے درکار ہے۔ اور وہ بہت جلد سیکھی جا سکتی ہے۔ امریکہ میں میرا ذاتی مشاہدہ ہے، کہ مختلف اقوام کے لوگ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے ہی اپنے صنعت و حرفت اور ہر قسم کے کاروبار بڑی خوبی سے سرانجام دے رہے تھے" آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ ہمارے موٹر ڈرائیور مستری وغیرہ بغیر انگریزی کے کتابی علم کے بالکل ناخواندہ ہونے کی حالت میں بھی بہت تھوڑے وقت میں کاریگر بن سکتے ہیں اور تمام آلات پرزوں مشینوں وغیرہ کے نام و اصطلاحات خواص و اعمال پر بخوبی قادر ہوتے ہیں۔

اخلاقی تعلیم

اب میں اُس مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو غالباً آپ کی طبیعتوں اور مزاج کے زیادہ موافق ہے۔ جب آپ نے اپنے قومی مدرسوں کی بنیاد ڈالی تو آپ کی غرض یہ تھی کہ ان میں اور سرکاری مدرسوں میں کوئی بات مابہ الامتیاز ہو کیونکہ علوم دنیاوی جو آپ کے مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں وہ سب سرکاری مدارس کے درس میں بھی شامل ہیں۔ آپ کا یہ خیال تو نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ کے مدرسے تعلیمی ساز و سامان کی موجودگی اور دنیوی علوم کی درس و تدریس میں سرکاری مدارس سے بڑھ جائینگے آپ کا خیال ظاہر ہے کہ یہ تھا کہ آپ کے قومی مدارس ایسے ہونگے جن میں نہ صرف "تشحیذ اذہان" کی فکر کی جا ئیگی۔ بلکہ نئی پود کے اخلاق پر بھی ان کی تعلیم و تربیت کا اثر پڑیگا" پس کیا ہم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں؟ آیا یہ مقصد ہمارے ذہن میں محفوظ بھی رہا ہے؟ کیا ہم نے اپنے مدارس کو بے مغز مشینوں کی طرح نہیں بنا دیا ہے۔ جن میں "میٹریکیولیٹ" "انڈر گریجویٹ" اور "گریجویٹ" یعنی زمانہ حال اور جدید تعلیم کے "مکتھ ملّا" اور "نیم ملّا" اور "ملّا" ڈھلتے۔ اور خراد اتارے جاتے ہیں؟

سوال یہ ہے۔ کہ کیا ہمارے طالب علم دوسروں سے بہتر اخلاق کے ساتھ آراستہ ہو کر دنیا میں داخل ہوتے ہیں؟ کیا وہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیئے کام کرتے ہیں۔ آپ سب صاحب اپنے اپنے تجربے سے اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ مجھ سے اگر پوچھیئے تو میں اپنے طالب علموں کے اخلاق و عادات کی نسبت مطمئن نہیں! میں نہیں دیکھتا کہ اور لوگوں کی نسبت ان میں قوم کی، ملک کی، یا بنی نوع انسان کی زیادہ محبت ہے۔ سرکاری مدارس کے طلبا سے زیادہ نہ ان میں دیانت ہے نہ جرأت! وہ اوروں سے بہتر مسلمان بھی نہیں۔ اگر اس لفظ کے محدود معنی بھی لیئے جائیں یعنی اسلام کے رسمی عقائد اور شعائر کی انھیں معمولی واقفیت بھی نہیں ہوتی۔ میں اس بات کا انکار نہیں کرتا کہ علی گڑھ کے طالب علم یونیورسٹی سے چلے جانے کے بعد بھی باہم محبت سے ملتے ہیں۔ مگر اس حد تک نہیں کہ ایک دوسرے سے مل کر بڑے پیمانے پر کسی عملی کام کو کریں۔ اس کوتاہی کا علم میرے ضمیر کے لیئے بہت تکلیف دہ ہے کیوں کہ میری رائے میں اس سے زیادہ دھوکہ اپنے آپ کو دینا محال ہی!

میں جانتا ہوں کہ تمام اسلامی مدارس میں ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لیے رکھا جاتا ہی۔ میں واقف ہوں کہ ہر اسکول میں مذہبی تعلیم کے لیے ایک خاص معلم رکھا جاتا ہی۔ مگر اس وقت اور اس عمر میں جو مقدس اصول سیکھے جاتے ہیں اور جو نیک اثر طلبا اپنے استاد سے قبول کرتے ہیں ناگفتہ بہ ہی اور اسقدر کہنا کافی ہے کہ ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا ست
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

اس ناکامی کی وجہ بہت گہری نہیں آپ عموماً مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کام ایک ایسے کم تنخواہ اور معمولی

لیاقت کے آدمی کے سپرد کرتے ہیں جس کی لڑکوں اور دیگر اساتذہ مدرسہ کے دل میں بہت کم عزت اور پرواہ ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو خود اپنی ذات سے پوشیدہ رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں، بغیر سچائی اور کامل سچائی کے ہم نجات نہیں پائیں گے۔ جو کام آپ اپنے ادنیٰ درجہ کے اُستادوں سے لیتے ہیں وہ آپ کے مدارس کے ہیڈ ماسٹروں کے کرنے کا ہے۔ اگر ان میں اس کی قابلیت نہیں تو اب وقت ہے کہ وہ قابلیت پیدا کریں۔ ہمارے اساتذہ اصلی معنوں میں معلّم نہیں ہیں بلکہ وہ لڑکوں کے دماغ میں صرف الفاظ و عبارات ٹھونسنا جانتے ہیں۔ چھوٹی جماعتوں کے اُستاد مقرر کرتے ہیں ہمیں اس بات کا خصوصاً لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اساتذہ علم النفس کے اصول و قواعد کے سمجھنے والے ہوں اور اپنا عمدہ اثر دوسروں کے چال چلن پر ڈال سکتے ہوں۔ ان کے مقاصد زندگی عالی ہونے چاہئیں اور اُن کے چال چلن خالص اور بے لوث ہونے واجب ہیں تاکہ ابتدا ہی سے ہمارے بچوں کو راہِ راست پر لگا سکیں ہر اسکول کو چاہیئے کہ وہ مذہب اسلام کی کسی خاص خصوصیت میں کمال و امتیاز پیدا کرے اور ہر مسلمان طالب علم اس کو نصب العین قرار دے کہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی اسلامی وصف اور خصوصیت میں دوسروں کے لیے نمونہ بنائیگا"

افسوس کے ساتھ اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہم نے اپنے علماء کو بھوکا رکھ کر ذلیل کر دیا ہے۔ اُنھوں نے اس کا انتقام یوں لیا ہے۔ کہ ہمارے دل و دماغ میں علم کے بجائے توہمات بھر دئے ہیں۔ اگر ہم اپنے مدارس کے مذہبی معلّموں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھیں گے تو وہ بھی یہ خاموش بدلہ لیں گے کہ ہمارے بچوں کے دلوں میں علم و عمل اور بزرگوں کی تعظیم کے عوض جہالت اور مذہب و اخلاق کی حقارت بھر دیں گے!

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس کی وجہ کہ ہمارے بچے مذہب و اخلاق کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کچھ بہت دور نہیں ان کے دلوں میں اس لیے ان کی وقعت نہیں کہ آپ کے دل میں بھی وقعت نہیں۔

مگر میں اس الزام کے بیان کو زیادہ طول نہیں دونگا۔ اس کا بیان کرنا میرے لیے اتنا ہی ناگوار ہے جتنا آپ کے لیئے سُننا۔ میں آپ پر الزام رکھتا ہوں مگر خود کو بھی بری الذّمہ قرار نہیں دیتا۔ آپ کی آنکھ کے تنکے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں مگر اپنی آنکھ کے شہتیر کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ہوں۔

اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ ہم اپنی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو کس طرح درست کر سکتے ہیں؟ میں مذہبی تعلیم کی نسبت کچھ کہنے کی اہلیت نہیں رکھتا، البتہ اخلاقی تعلیم کی نسبت چند باتیں عرض کرنے کی جراءت کرتا ہوں۔ میرا ارادہ علم الاخلاق پر کوئی کتاب یا رسالہ لکھنے کا نہیں اور نہ یہ ممکن اور مناسب ہے کہ ایک مختصر ایڈریس میں علم الاخلاق کے تمام ابواب پر بحث کی جائے میں صرف چند عملی تجویزیں پیش کرتا ہوں کہ ہم کس طرح اپنے مدارس کی اخلاقی تعلیم کو درست کر سکتے ہیں؟ میں صرف دو ایک اخلاقی صفات کی طرف اشارہ کرونگا جن کی عدم موجودگی ہماری ترقی میں ایک کاوٹ ہے۔ بچوں کے سامنے فرداً فرداً اخلاقی صفات پیش کرنے سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی طبیعتوں

میں یہ احساس پیدا کیا جاوے کہ ان کی عزت، غیرت، اور اخلاق کا بھی ایک درجہ ہے۔ جس پر خواہ کتنی ہی ناکامیاں پیش آئیں، انھیں ثابت قدم رہنا واجب ہے۔ انھیں اپنی سمجھ کے مطابق اپنے اخلاق پر سچائی کے ساتھ قایم رہنا چاہیئے۔ انھیں کسی مقصدِ عالی کے لیئے اپنی زندگی کو وقف کرنا چاہیئے۔ اور اس "قانون پر کاربند ہونا چاہیے جس کے مطابق ہر شخص پر فرائض عائد ہوتے ہیں۔

اس کے بعد قومی نقطۂ نگاہ سے جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ کسی مشترک غرض کے لیے ایک دوسرے سے ملکر کام کرنا ہے" ہر بے تعصب مشاہد کے نزدیک مغرب کے لوگوں میں (جن کی زندگی کا ہر شعبہ اتحادِ عمل کی ایک اعلیٰ مثال ہے) اور مشرق کے باشندوں میں (جو ایک تجارتی کمپنی کو بھی کامیابی سے نہیں چلا سکتے) یہ ایک بین فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ نہیں کہ مغرب کے لوگ تعلیم یافتہ ہیں اور مشرقی جاہل ہیں) اگر تعلیم کے معنی صرف علم حاصل کرنا ہیں تو علم اور دماغی روشنی ایک شخص کو صرف یہ بتا سکتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے مگر وہ اسے عمل کے قابل نہیں بنا سکتی۔ اگر تعلیم کا اعمال پر اثر پیدا کرنا ہو تو قوتِ ارادی کی تربیت مقدم ہے۔ نہ صرف عقل کو روشن کرنا چاہیئے بلکہ قوتِ ارادی کو بھی جلا دینی چاہیئے۔ نئی خواہشات اور تازہ جذبات پیدا کرنے چاہئیں۔
اہل عرب مطیع اسلام ہوئے تو سب کے سب جاہل تھے مگر ان میں اتحادِ عمل کا وصف حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت سے پیدا ہو گیا تھا۔ مگر بعد میں جب وہ علوم میں تمام عالم کے رہنما ہو گئے تو ان میں پھوٹ پڑگئی۔ الغرض تربیت کا یہ اثر ہے جس کی ہمیں اپنے معلموں سے توقع رکھنی چاہیئے۔ ہم کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ ان کا اثر ایسا ہی قوی اور وسیع ہوگا جیسا کہ آنحضرت صلعم کا تھا مگر ہر معلم کو خواہ اس کی حیثیت کیسی ہی کمتر کیوں نہ ہو، دل میں یہی امنگ رکھنی چاہیے کہ وہ اپنے شاگردوں کے لیے نیک نمونہ بنے اور اُسے اپنے محدود دائرہ میں اسی قسم کا اثر ڈالنا چاہیئے جیسا کہ حضور سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کا تھا۔ ہزاروں معلموں کے اثرات جب جمع ہو جائیں گے تو قوم کے اخلاق میں ایک دس ہی برس کے عرصہ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جائیگا!

اگر ہمارے نوجوانوں کو یہ تعلیم دینی ہو کہ وہ مل کر اتحادِ عمل سے کام کریں تو انھیں ایک دوسرے پر حکومت کرنے کا اور ایک دوسرے کی اطاعت کرنے کا ہنر سکھانا لازم ہے۔ تمام انسانی نظامات کی کامیابی کا راز صرف حاکموں کی حکومت کی قابلیت اور ماتحتوں کی اطاعت کی استعداد میں پوشیدہ ہے!

ایک غیر ملکی حاکم کی اطاعت جس کی پشت پر قوت اسلحہ ہو نہایت آسان امر ہے مگر جس شخص کو ہم نے خود انتخاب کر کے اپنا سردار بنایا ہو اس کی اطاعت ایک امر مشکل ہے۔ جن قوموں میں اس کی اہلیت ہے وہ متحد اور مضبوط ہیں۔ برخلاف ان کے جن میں یہ اہلیت اور استعداد نہیں وہ غیر متحد اور کمزور رہیں! قرآن شریف نے اس حکم میں کہ "وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ فَاحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" یعنی جب تم لوگوں پر حکومت کرو تو انصاف

کے ساتھ کرو۔" ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم اپنے بھائیوں پر کس طرح حکومت کریں، اور اس حکم میں کہ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" یعنی خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت کرو۔ اور اس کی جو تمہارے میں سے تم پر حاکم ہو اطاعت کرو" ہمیں اطاعت باہمی کا سبق سکھایا گیا ہے۔ ان دو اصولوں پر عمل کیے بغیر مختلف الخلقت انسان جیسے کہ ہم ہیں متحد نہیں ہو سکتے۔ پہلے اُن کو اپنے سردار منتخب کرنے چاہئیں۔ سرداروں کو انصاف پسند اور دیانتدار ہونا چاہیئے۔ اور مقتدیوں کو اُن کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

زمانۂ حال کے مسلمان دنیا بھر میں سب سے زیادہ غیر منتظم اور نا متحد قوم ہیں۔ اور اس کی بڑی وجہ اُن کے طبائع کی ضد اور سختی اور دلوں میں ایک دوسرے کا اعزاز نہ ہونا ہے۔ ہم بالغ لوگوں کی اصلاح آسانی سے نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی طبائع سے بچپن کی نرمی اور اثر پذیری مفقود ہو چکی ہے۔ مگر ہم بچوں کی اصلاح میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور اس کام کے لیے معلموں کی امداد کی ضرورت ہے۔ آپ نے سپاہیوں کو سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اگر دو بھی ہوں تو قدم ملا کر چلتے ہیں۔ ڈرل ماسٹر نے جو سبق انھیں سکھایا ہے وہ اس کو نہیں بھول سکتے۔ ڈرل ماسٹر نے ان کے ہاتھ پاؤں کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک معین طریق کی حرکات بلا ارادہ بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ یہی طریق ہے جس پر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معلم ہمارے بچوں کے دل و دماغ کی تربیت کریں۔ اُن میں یہ عادت پیدا کر دینی چاہیے۔ کہ وہ ہمیشہ منتظم مجالس کے ممبر بن کر رہیں۔ اپنے قوانین اور اپنے انتخاب کردہ سرداروں کے پابند ہوں۔ خواہ مجالس کا کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ انھیں دنیا میں راہ گم کردہ بھیڑوں کی طرح نہیں پھرنا چاہیئے۔ اگر آپ اپنے لڑکوں کو شیرازوں میں پابند رہنے کی عادت ڈالیں اور خود روی اور مطلق العنانی کی زندگی سے وہ دست بردار ہو جائیں تو تھوڑی عمر میں ان کو منتظم قوم بنانا آسان ہوگا۔ الا فلا۔ اکثر یورپین اسکولوں میں ایک بڑا لڑکا "پریفکٹ" کہلاتا ہے۔ اسے تادیبی امور میں باقی لڑکوں پر ایسا ہی اختیار حاصل ہوتا ہے جیسا کہ اسکول کے ماسٹروں کو یورپین لوگوں کی طبیعت میں رضا کارانہ اطاعت کی بنیاد یہیں سے رکھی جاتی ہے۔ ایک لڑکے کے لیے ماسٹر کی اطاعت کرنا آسان ہے۔ مگر اپنے جیسے ایک دوسرے لڑکے کی اطاعت جب تک طبیعت پر ضبط نہ ہو مشکل کام ہے۔ یہی تربیت ہے جو اس کی باقی زندگی میں کام آتی ہے۔

میں صرف ایک اور صفت کا ذکر کروں گا جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی اقتصادی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معلمین زبانی تلقین اور عملی مثال سے اپنے شاگردوں میں پیدا کریں گے۔ یہ کفایت شعاری کی صفت ہے۔ میں اس کے فوائد بیان نہیں کروں گا۔ ہمارے ہندو بھائیوں کا نمونہ اس بارہ میں ہمیں سب کچھ سکھا سکتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ کمانا ہی کافی نہیں بلکہ بچانا بھی ضروری ہے۔ معلموں کو چاہیے کہ وہ لڑکوں کو اپنی جیب خرچ میں سے کچھ بچانے کی تلقین کریں۔ تاکہ ابتدا سے ہی یہ عادت ان میں پختہ ہو جائے۔ اس ضمن میں میں صرف

آفریدی لوگوں کی ایک مثال بیان کروں گا کہ آفریدی کیسے عجیب طریقہ سے اپنے بچے کو کفایت شعاری اور نشانہ بازی ایک بات میں سکھا دیتا ہے۹ کارتوس آفریدوں کے ملک میں مہنگے بھی ہیں اور کمیاب بھی ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کو یوں ہدایت کرتا ہے "بیٹا! اتنے کارتوس میرے پاس ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر آٹھ آنے خرچ ہوئے ہیں۔ تم جانتے ہو میرے پاس کتنا تھوڑا روپیہ ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے کتنے دشمن ہیں۔ اگر تم ایک کارتوس سے ایک دشمن کا حساب بیباق نہیں کر سکتے ہو تو تم جانتے ہو کیا نتیجہ ہوگا"؟ اب مجھے اس سوال پر بحث کرنی چاہیئے کہ ہم اپنے مدارس میں کس طرح اخلاقی تعلیم کا انتظام کریں۔ آپ اپنے اسکولوں کے دنیوی علوم کی تعلیم کا انتظام نہیں بدل سکتے کیونکہ یہ سرکار کے زیر نگرانی ہے۔ مگر آپ اپنے قومی اسکولوں میں کچھ وقت مذہبی تعلیم کو دیتے ہیں اور دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ آپ بچوں کی اخلاقی درستی پر بہت سا وقت خرچ کرتے ہیں۔ مگر ہر اسکول کا طریق جدا ہے۔ اور بہت اسکولوں میں نہیں تو اکثر میں یہ طریق تعلیم بالکل ناقابل اطمینان ہے اگرچہ مختلف ضلعوں اور مختلف صوبوں کی اخلاقی ضروریات جدا جدا ہیں۔ تو بعض میں آپ کو مثلاً مردانگی اور جرأت کا سبق سکھانا پڑیگا اور بعض میں ان کی حیوانیت اور تندمزاجی کو کم کرنا پڑے گا۔ بعض جگہ آپ کو مہمان نوازی کا سبق سکھانا پڑے گا اور بعض جگہ ان کی مہمان نوازی کو روکنا پڑے گا تاکہ ان کے گھرے قہوہ خانے نہ بنجائیں"۔ الغرض ہر ضلع کا اخلاقی مسئلہ جدا ہوگا اور انتہائی کارکامیابی کا انحصار آپ کے ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں کے علم اور توجہ اور محنت پر ہوگا۔ ہر ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ماتحت لڑکوں کی طبیعتوں کا بغور مطالعہ کرتا رہے۔ اور نیز ان لوگوں کی طبائع کا مطالعہ بھی جن کے درمیان وہ رہتا ہے۔ اور پھر لڑکوں کے اخلاق سے وہ خرابیاں دور کرے جو ان کی بڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ الغرض ہر ایک مدرسہ کے لیے ایک جدا مسئلہ ہوگا جس کا حل بھی جدا قسم کا ہوگا۔ مگر چونکہ آپ ان سب کو نیکی کی ایک ہی سطح پر لانا اور ان کے سامنے ایک ہی مقصود رکھنا چاہتے ہیں۔ خواہ ان کی اصلی اخلاقی حالت کچھ ہی ہو۔ نیز چونکہ آپ ان کو ایک ہی مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں خواہ کسی جگہ سے سفر شروع کریں۔ تو آپ کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ وہ مقصود کیا ہے جس کی طرف آپ ان سب کو لیجانا چاہتے ہیں۔ اس امر کے طے کرنے کے لیئے اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں کے پرنسپلوں اور ہیڈ ماسٹروں کے باہمی مشورہ کی ضرورت ہے۔ جن کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کس قسم کے اغراض وہ اپنے طالب علموں کے سامنے پیش کریں۔ اور ان کے اخلاق کو درست کرنے کے لیے وہ کون سے عملی طریق اختیار کریں۔ میں یہ فیصلہ کرنے کا ذمہ نہیں اٹھاتا کہ آپ کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے ہندوستان بھر کے اسلامی مدرسوں کے لیے ایک ہی نصاب چاہیئے یا آپ کو اخلاقی تعلیم کے لیے بھی انسپکٹر مقرر کرنے چاہئیں جو اسی طرح اسلامی مدارس کی اخلاقی تعلیم اور اخلاقی حالت کا معائنہ کریں جیسے دنیوی تعلیم کے انسپکٹر مقرر ہیں۔ میں ان تمام سوالوں کو ان لوگوں کے

لیے چھوڑتا ہوں جن کو تعلیم کا زیادہ تفصیلی تجربہ ہے۔ میرا مقصد صرف اخلاقی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو ظاہر کرنا ہے۔

تعلیم جوانان

آپ نے بڑے صبر و تحمل سے میرے اس ایڈریس کو سنا ہے۔ میں اور زیادہ عرصہ کے لیے آپ پر بار خاطر نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے صرف ایک اور بات کہنی ہے۔ اور پھر میں ختم کردوں گا۔ بہت سے ماہران تعلیم نے زمانۂ حال میں آپ کو یاد دلایا ہے کہ آپ نے اپنے بالغوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔ وہ بالکل درست کہتے ہیں کہ قومی ترقی کے لیے بالغوں کی تعلیم بھی ایسی ہی ضروری ہے۔ جیسی بچوں کی۔ میں ان کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں کہ آپ نے بالغوں کی تعلیم کا فکر نہیں کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ نے اس مقدس درسگاہوں کو جو صدیوں سے بالغوں کی تعلیم کے لیے قایم تھے تباہ کر دیا ہے۔ آپ ان کو ہفتہ میں ایک دفعہ اپنی مسجدوں میں بلاتے ہیں مگر وہ بھوکی بھیڑوں کی طرح اپنی خوراک کے لیے منہ اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں جو آپ انھیں نہیں دیتے۔ وہ چارہ مانگتے ہیں اور آپ انھیں پتھر دیتے ہیں۔ ورنہ فرمایئے کہ وہ خطبے جو آپ کے پیش امام مساجد میں ایسی زبان میں پڑھتے جن کو مقتدیوں میں سے کوئی بھی نہیں سمجھتا، پتھر نہیں تو کیا ہیں؟ بلکہ پیش امام بھی اکثر اوقات نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے مقتدیوں کو آیندہ جمعہ تک عمل کرنے کے لیے کیا سبق پڑھا رہا ہے۔ اگر آپ اس خطبہ کی اصلاح کریں اگر آپ اسے حقیقی خطبہ بنا دیں جیسے ہمارے مذہب کے پیشوا پڑھا کرتے تھے تو آپ اپنی قوم کو بہت جلدی تعلیم یافتہ بنا لیں گے۔ میں پھر وہی کہوں گا جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہمیں تعلیم اور خواندگی کو مخلوط نہیں کرنا چاہیے۔ ہم کو حقیقی تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ صرف ناظرہ خوانوں کی ضرورت نہیں، تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک آفریدی جو اپنی حفاظت کے لیے بندوق کا استعمال کر سکتا ہے حقیقی معنوں میں آپ کے بہت سے عالم بابوؤں سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے سیاسیات میں اس کی نگاہ زیادہ عمیق ہے اور وہ آپ کے بابو کی نسبت اشیاء کی قدر و قیمت کو زیادہ صحیح طور پر پرکھتا ہے۔

سوال اب یہ ہے کہ ہم اپنی مساجد کو کس طرح بالغ العمر لوگوں کے لیے اصلی معنوں میں سبق اصلاح بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ اپنے علماء کی اصلاح کا تہیہ کریں تو آپ اس چکر میں پھنس جائیں گے کہ آیا تمام قوم کی اصلاح پہلے ہو جس سے علماء کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ یا علماء کی اصلاح پہلے ہو جس سے قوم کی اصلاح ہو سکتی ہے؟ لیکن اس مشکل کو ایک آسان طریق سے حل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پیش امام عموماً اتنے عالم نہیں ہوتے کہ وہ اپنے خطبے خود تیار کر سکیں۔ اس لیے وہ خطبوں کی ایک پرانی کتاب استعمال کرتے ہیں جو عربی میں لکھی ہوئی ہے۔ اور جس میں سے وہ ہر جمعہ کو ایک خطبہ پڑھ دیتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ چاہیے کہ ان کی بجائے ایک سادہ اور آسان اردو میں لکھی ہوئی کتاب مہیا کر دیں جس میں ۲ ۵ خطبے ہوں یا اگر قمری سال کا لحاظ

کیا جائے تو ۴۸ ہی کافی ہیں۔ یہ خطبے زمانہ کی ضروریات کے مطابق مفید مذہبی اور اخلاقی مضامین پر لکھے ہوئے ہوں۔ آپ کی قوم میں جو بہترین آدمی ہیں وہ ایک ایک خطبہ لکھ دیں مگر ان کے نام ظاہر نہ کرو کیوں کہ آپ کے لوگ ایک دوسرے کے حاسد ہیں۔ باون یا ۴۸ خطبوں میں ان تمام مضامین کا ذکر ہونا چاہیے جو آپ کی قوم کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ مگر ان میں کسی متنازعہ فیہ امر پر بحث نہ ہو۔

جب آپ اس کتاب کو تیار کر لیں اور چھاپ دیں تو تمام فرقوں کے علما سے اس کی تصدیق کروالیں کہ یہ کتاب جمعہ کے خطبوں کے لیے استعمال کرنے کے لائق ہے۔ ان کی اس پر مُہر ثبت کرالیں اور انھیں یقین دلاویں کہ آج تک ان کی مُہریں اس سے زیادہ مبارک مقصد کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوئیں۔ اگر شہر کے سرگروہ لوگ اُن خوبصورت جلدوں کو اپنی مسجدوں کے پیش اماموں کو بطور ہدیہ دے دیں اور اصرار کریں کہ وہ ان ہی خطبوں کو سنیں گے تو آپ کے بالغوں کا بہت سا حصہ جلد تعلیم پا جائے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُن خطبوں کی کتابوں کو ایسے علما بھی استعمال کریں جو اپنے مقتدیوں کی ضروریات اور زمانے کی ضروریات کو سمجھتے ہیں۔ مگر صرف اُن کے لیے مفید سمجھتا ہوں جو اپنے خطبے خود تیار نہیں کر سکتے۔ اور اس لیے ان کو پُرانے عربی خطبوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ میرے اپنے جدامجد جو اپنے زمانے میں ایک معروف مذہبی پیشوا تھے اپنی ملکی ضروریات کے مطابق اپنے خطبے خود لکھا کرتے تھے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ یہی طریق آج کل سب روشن دماغ علماء کا ہے۔ میں یہ خیال نہیں کرتا کہ یہ خطبوں کی کتاب آپ کو ہمیشہ کے لیے کارآمد ہوگی۔ اس کو بھی زمانے کے بدلنے کے ساتھ بدلنا پڑے گا اور اس کے ایڈیشن ضروریات زمانہ کے مطابق ترمیم ہو کر شائع ہوتے رہیں گے۔

تعلیم نسواں

میں یقین کرتا ہوں کہ مستورات کی تعلیم کے بعض حامی اور شائق اس جگہ موجود ہیں اور وہ بہت مایوس ہوئے ہوں گے کہ تعلیم اناث کے بارے میں ایک لفظ بھی میں نے اب تک نہیں کہا۔ میں عورتوں کی تعلیم کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھتا ہوں اور جو تجاویز میں نے مردوں کی تعلیم کے لیے پیش کی ہیں وہ عورتوں کے حق میں بھی صادق آتی ہیں۔ میرے نزدیک عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ ہی نہیں بلکہ حساب کا ایک معمولی سوال ہے۔ قوم کی ترقی کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ قابل افراد کی بڑی سی بڑی تعداد ہے۔ اگر ہم مردوں کو تعلیم دیں اور عورتوں کی تعلیم کو فراموش کر دیں تو قوم کی مجموعی قابلیت کم رہ جائیگی۔ جاہل عورتیں نہ صرف اپنے فرائض کو ادا نہ کر سکیں گی بلکہ قدرت نے جہاں کہیں انھیں تیز دماغ اور مضبوط ارادہ بخشا ہے، فطری قوتوں کی تربیت سے محروم رہ کر وہ مردوں کے رستہ میں مزاحم ہوں گی اور ان کی قابلیت کو بھی کم کر دینگی۔ عورتوں کا اثر نہ صرف اپنے بچوں کے اخلاق اور خاوندوں کے دلوں پر ہوتا ہے،

بلکہ وہ قوم کی مجموعی قوت کو بہت بڑی حد تک کم یا زیادہ بھی کر سکتی ہیں۔ اگر یورپین عورتیں دوران جنگ میں دفتروں اور کارخانوں کا کام سنبھال لیتیں تو کوئی یورپین قوم میدان جنگ میں اتنی فوج نہ بھیج سکتی! علاوہ جنگ کے امن کی صورت میں بھی ایک تعلیم یافتہ عورت اگر اپنے شوہر کے کام کو سمجھے اور اس کے افکار میں شریک ہو سکے تو بیحد مفید ہو سکتی ہے۔ میں اس بحث کو کہ "عورتوں کے لیے بہترین نصاب کیا ہونا چاہیے" اس کانفرنس کے کسی آیندہ پریسیڈنٹ کے لیئے چھوڑتا ہوں جو ناممکن نہیں کہ خود فرقۂ اناث ہی سے ہو۔

دعا اور خاتمہ

مسلم یونیورسٹی کے احاطہ اور عمارات میں کوئی تقریر خطبہ اور ایڈریس مکمل متصور نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اُن میں اس کے جلیل القدر بانی کا سچی اور دلی شکر گزاری کے ساتھ تذکرہ نہ ہو اور ان کی رُوح پر فتوح کے لیئے دعا نہ کی جائے۔

مجھے امید ہے کہ آپ سب صاحب سر سید اعظم اور ان کے فاضل فرزند سید محمود محترم اور ان کے دست و بازو فصیح اللسان نواب محسن الملک بہادر اور نمونۂ خُلقِ مجسّم نواب وقار الملک بہادر کے لیے جن کی رُوحیں غالباً ہماری آج کی کارروائیوں کی اس وقت ناظر ہیں، میرے ساتھ دست دعا اٹھائینگے اور شریک فاتحہ بخیر ہوں گے۔ مجھے اپنے دوست نواب حاجی محمد اسحاق خاں بہادر اور سید محمد علی مرحومین کو بھی اس دعا میں فراموش نہ کرنا چاہیئے جنہوں نے صدق و وفاداری کے ساتھ اپنے عالی مرتبہ پیش روؤں کی قدم بقدم تقلید کی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اب اے خواتین و حضرات! میں اس صبر و تحمل اور مہربانی کی بابت آپ کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں جس کے ساتھ آپ نے میری سمع خراشی کو سُنا اور اس ایڈریس کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام

آنریبل سر عبد الرحیم کے سي آئي اي
صدر اجلاس سی و سوم (دهلي سنه ۱۹۲۶ ع)

اجلاس سی و نہم

(منعقدہ دہلی ۱۹۲۶ء)

صدر سر عبدالرحیم کے سی ایس آئی بالقابہ

حالات صدر

نوٹ - ممدوح کے حالات اجلاس بست و نہم منعقدہ پونا میں درج ہیں۔

خطبۂ صدارت

حضرات! یہ دوسرا موقع ہے کہ آپ نے میری عزت افزائی فرما کر مجھ سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس سالانہ اجلاس کی صدارت کی خواہش کی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں زیادہ سے زیادہ محض ایک شوقیہ واقف تعلیمات ہوں۔ اس لئے امید ہے کہ آپ مجھ سے یہ توقع نہ کریں گے کہ میں اُن مسائل سے بحث کروں جن پر بحث کرنا صرف ایک ماہر کا حق ہے۔ میں صفائی کے ساتھ آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اعداد و شمار میں بھی مہارت نہیں ہے۔ اعداد کا انبار مجھے پریشان کر دیتا ہے۔ جو لوگ تعلیمی اعداد کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اُن کو میں صاحبزادے آفتاب احمد خاں صاحب کا نام بتائے دیتا ہوں جو مسلم یونیورسٹی کے نامور وائس چانسلر ہیں اور جو عرصہ دراز سے اس کانفرنس کی روح رواں ہیں۔ نیز میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کا بھی حوالہ دیئے دیتا ہوں جو بڑے

ریاضی داں اور ماہر تعلیم ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کا کام ہے کہ اگر چاہیں تو آدھے گھنٹے کے اندر تمام اعداد و شمار پوری تنظیم و ترتیب کے ساتھ اور تمام مناسب قسم کے مطلوبہ نقشے اور جدول آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ میرے دوست سر عبد القیوم رئیس صوبہ سرحدی نے پارسال ہی تعلیم کے متعلق ایسی جامع و مانع تفصیل پیش کی تھی اور ایسی مفید اور عملی تجاویز بتائی تھیں کہ مجھے یقین ہے کہ ان کا وہ خطبۂ صدارت ابھی کچھ زمانہ تک آپ کی پیشِ نظر رہے گا۔ پھر کل ہی کی بات ہے کہ میں نے وہ دلچسپ خطبہ پڑھا تھا جو مسٹر سید سلطان احمد وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے یونیورسٹیوں کے مقاصد کے متعلق دیا تھا اور جس میں خصوصیت کے ساتھ انھوں نے ان خدمات کو بیان کیا تھا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انجام دی ہیں اور جس کے ساتھ ہماری اس کانفرنس کا بہت گہرا تعلق ہے اور گو خود مجھے بھی ایک سے زیادہ یونیورسٹی کانووکیشنوں میں اور ہندوستان کے مختلف حصص کے اندر تعلیمی کانفرنسوں میں اور علمار کی ایک سے زیادہ جماعتوں میں خطابت کا اتفاق ہوا ہے مگر مجھے ایسا کم بخت حافظہ نصیب ہوا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ بڑی حد تک میں ان باتوں کو ہرگز نہ دہراؤں گا جو پہلے کہہ چکا ہوں۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص واقعات کے متعلق خود اپنے تاثرات کو بالکل ٹھیک ٹھیک اور فطری طریقہ سے ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بالکل ممکن ہے کہ اگر وہ کوئی نئی بات نہ کہہ سکے تاہم اپنے سامعین کے اندر کسی نہ کسی حد تک شوق و خواہش تحقیقات ضرور پیدا کر سکے گا۔ یہ وہ بات ہے جس کی آپ کی اجازت سے میں اس موقع پر کوشش کروں گا۔

حقیقی تعلیم

جیسا کہ آپ واقف ہیں تعلیم کے جو جامع معنی اس زمانہ میں قرار دیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ انسان کی ذہنی، روحانی اور جسمانی قابلیت کو ترقی دی جائے اس کے قوارِ مشاہدہ و استخراج و ترتیب نتائج کو بڑھایا جائے اس کے تصور اور جذبات عالیہ کو قوت دی جائے۔ اس کی اخلاقی اور جسمانی فطرت کے تمام بہترین جوہروں کو جلا دی جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس جسمانی شخصیت کو جو بنیاد ہے تمام دوسری قوتوں کی جہاں تک ممکن ہو مکمل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا مضمون دائمی اور ہر دم تازہ دلچسپی رکھتا ہے اور چونکہ حالات زندگی ایک قرن سے دوسرے قرن تک ایک صدی سے دوسری صدی تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی کوئی تعلیمی تجویز نہیں ہو سکتی کہ ہر زمانہ کے لئے یکساں ہو اور نہ کوئی ایسا مستقل طریقہ ہو سکتا ہے جو تمام ممالک و اقوام یا درحقیقت تمام افراد

کے لئے یکساں موزوں ہو۔ یہ صداقتیں ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان سے برابر اعراض کیا جاتا ہے۔ تی
ہماری بہت سی ناکامیوں کا یہی سبب ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے (مگر اس کی طرف سے بھی برابر چشم پوشی ہو رہی
ہے) کہ تعلیم اسکول اور کالج تک ہی ختم نہیں ہو جاتی نہ وہ ان کی احاطوں تک محدود ہے۔ حقیقی تعلیم
ایک زندہ ترقی کن اور خود پھیلنے والا انتظام ہے اگر تعلیم اس نوعیت کی نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس کا
تصور نہایت ناقص ہے۔ تعلیم کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہنا چاہئے جب تک کہ ہمارے قوائے
کہنگی و فرسودگی کے سبب تعلیم سے متمتع ہونے سے قاصر نہ ہو جائیں۔ اگر یہ اصول صحیح ہیں (اور یقیناً وہ صحیح ہیں)
تو غور کیجئے کہ اس معلم کا کام کتنا بڑا اور مشکل ہے جو تعلیم کا ایک صحیح نظام قائم کرنا اور پھر اُسے موثر اور کامیاب
طریقے سے جاری بھی کرنا چاہتا ہے۔ درحقیقت اس میں شک ہے کہ آیا کامل ماہر تعلیم کا کبھی وجود تھا بھی یا نہیں
شاید ایسا ماہر تعلیم آہستہ آہستہ اسی طرح وجود میں آ رہا ہے جیسا کہ شاید کامل انسان یا مافوق الانسان۔

نیا زمانہ اور نئی سائنس

جس زمانہ میں میں نے اس کانفرنس کے اجلاس پونا کی صدارت کی تھی اس کے بعد سے انسان
کے خیالات میں انقلاب عظیم واقع ہو گیا ہے درحقیقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک بالکل ہی نئے زمانہ میں پہنچ گئے
ہیں اس انقلاب کا خاص سبب وہ سریع ترقی ہے جو سائنس سے گزشتہ چوتھائی صدی کے اندر قوائے
قدرت پر قابو حاصل کرنے میں کی ہے اور دوسرے وہ اجتماعی اور اقتصادی تموّج ہے جو گزشتہ جنگ عظیم
سے پیدا ہوا ہے۔ میں نے اپنی اسکول اور یونیورسٹی کی تعلیم (وکٹورین ایج، Victorian age)
میں پائی تھی لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی علم کیمیا، طبیعات وغیرہ وغیرہ کے
مبادی بھی نہیں سیکھے۔ یعنی خواص مادّہ یا زندگی کے طبعی حالات کے متعلق مجھے کبھی کچھ نہیں پڑھایا گیا
اس قسم کی تعلیم اس زمانہ میں کیسی ناقص و ناکافی اور مہمل معلوم ہونی چاہیئے۔ جب کہ موٹر کار، لاسلکی،
ہوائی جہاز اور سینما وغیرہ روزانہ زندگی کے عام عنصر ہو گئے ہیں۔ جب کہ سیارۂ مریخ کے ساتھ
نامہ و پیام کی واقعی کوشش ہو رہی ہے اور لوگ اُڑ کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جانے کے خواب دیکھ رہے
ہیں۔ جب کہ برقیہ سے ناقابلِ تصور قوت حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے جب کہ لاکھوں بچے مصنوعی
غذا پر پرورش پا رہے ہیں اور کبر سنی و فنا کو مغلوب کرنے کے متعلق تجربے ہو رہے ہیں۔ جب کہ
نامور سائنس داں اس کام تک میں مصروف ہیں کہ بقائے حیات بعد ممات کو ثابت کریں، یہی نہیں
بلکہ وہ مُردوں کی روحوں کے ساتھ براہ راست تعلقات وابستہ کرنے کے درپے ہیں اور جب کہ

اسی کے ساتھ ایسے قوی آلات ہلاکت ایجاد کیے جا رہے ہیں جو چند گھنٹے کے اندر پورے شہروں کو غارت اور ہزاروں نوع انسان کا صفایا کر سکتے ہیں تو غور کرنے والے لوگ اپنے دل میں سوچ رہے ہیں کہ آیا ہم اس نئے زمانہ کی سرحد پر تو کھڑے ہوئے نہیں ہیں جب کہ انسان مثل دیوتاؤں کے ہو گئے یا آیا وہ قومیں جو ذہنی لحاظ سے زیادہ پیش پیش ہیں ان کے اندر اب بھی چنگیز خاں، نپولین اور کلائیو اور اُن کے نئے اوتاروں یعنی اس زمانہ کے غلاموں کے تاجر اور دوسروں سے سونا چھیننے والوں کی روح اس درجہ موجود ہے کہ وہ نوع انسان کی ترقی کو روکنے کے لئے یہ طریقہ استعمال کر رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو ہلاک کریں اور خود غرضی اور کوتاہ نظری کو کام میں لا کر اُن قوموں کو دبائیں جو عملی شائستگی میں ان سے کم درجہ ہیں۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ہر تعلیمی تجویز میں آپ کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ نوع انسان کی قدر و قیمت حقیقی معنی میں سمجھی جائے اور تنہا خوری، تنگ دلی یا مذہبی تعصب اور قومی منازعت کے تمام کمینہ اور بزدلانہ خیالات کو پس پشت رکھا جائے افسوس ہے کہ یہ وہ خیالات ہیں جس کے شکار کبھی کبھی بڑے بڑے شاعر اور موّرخ اور فلاسفر بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ تعلیم کے معنی اُس وقت بہت تنگ ہو جاتے ہیں اگر علم کے قلم رو کو فتح نہ کیا جائے جہاں صرف سائنس ہی کی مدد سے پہنچ سکتے ہیں۔ اس امر کا پورے طور پر اعتراف کرنا پڑے گا کہ سائنس جس نے ڈارون اور ملیلے کے زمانہ سے اتنی ترقی کی ہے کہ دوسرے علوم پر حاوی ہو رہی ہے اُس کو بعض مفکر بہت شبہ اور بدگمانی سے دیکھ رہے ہیں جو نتیجہ اُس خوفناک مظاہرہ کا جو کہ جنگ عظیم نے اپنے غیر متناہی قوائے ہلاکت کا کیا تھا جیسی کہ امید تھی سائنس کے موخر الذکر پہلو نے موجودہ تہذیب کے مادہ پرستانہ رجحانات سے مل کر ہندوستان میں بعض سیاسی اور غیر سیاسی فلاسفروں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ نفس کش اور جنگل باشی سنیاسیوں اور فقیروں کی دنیا میں جا کر پناہ گزیں ہوں لیکن اگرچہ جامد و حساس قلوب شاید ردّ عمل کا پتہ دیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے زمانہ کے ناگزیر واقعات، رجحانات یا فطرت انسانی کی ضروریات و خواہشات سے چشم پوشی کریں۔

اول اس امر کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اگر سائنس نے اپنے پیدا کیے ہوئے نئے خطرات سے ہمیں دو چار کر دیا ہے تو یہ بھی سائنس ہی ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے آپ کو ہلاکت و تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ یہ ماننا بھی ناممکن ہے کہ ایسی حالت میں کہ ہندوستان کے اندر اور دنیا کے دوسرے حصوں کے اندر، لاکھوں انسان زندگی کی معمولی ضروریات پر قابض نہ ہونے کے سبب سے مصیبت اُٹھا رہے ہیں اور ان کو وہ آسانیاں اور فراخ دستیاں حاصل نہیں ہیں جن کے بغیر جماعت کی ترقی لازماً مسدود ہو جاتی

ہے۔ سائنس ہی ایک ایسی چیز ہے جو قدرت کے لامتناہی ذرائع سے بیش از بیش فائدہ حاصل کر کے اس حالت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

تعلیم میں مذاہب

ماہر تعلیم کو اس پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہے کہ آیا اس کی اسکیم میں مذہب کے لئے بھی کوئی جگہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس شکل میں اور کس حد تک۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ معاد و عباد کے اصول اور معتقدات کا لوگوں کے خیالات و عمل پر وہ اثر نہیں رہا ہے جو اگلے زمانہ میں تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوائے شاذ افراد کے مذہب اب بھی نہایت قوی اور محیط کل ذریعہ عمل ہے۔ لیکن یہ امر کہ مذہبی تعلیم کو آزاد تعلیم کے مقاصد کے ساتھ کس طرح منطبق کیا جائے بالکل ہی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن میں یہ تجویز کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ مذہب کے اصول کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور مذہبی اعمال کے متعلق اپنی توجہ کو صرف ان اصول تک محدود رکھا جائے جن کو کسی خاص مذہب کا رکن سمجھا جاتا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو تمام غیر ضروری اور مختلف فیہ معاملات کو یک قلم خارج کر دیا جائے۔ اس طرح ہم ان تمام مستعدی بخش روحانی قوتوں کو کام میں لا سکتے ہیں جو انسان کے راہ ترقی پر گامزن ہونے میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ اسلام میں ایمان یا عقیدہ جس کے معنی ہیں قادر مطلق کی اطاعت (وہ قادرِ مطلق جو حیات و کائنات کا خالق ہے، عادل اور رحمٰن و رحیم ہے) روحانی زندگی کا مرکزی اور ضروری جزو ہے۔ اُس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کل نوع انسان کو خدمتِ خلق کی عام برادری میں منسلک کر دے۔ اسلام کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ صرف اس زندگی کے اعمال سے نہ کہ الفاظ و جملوں کے اعادہ یا ترک دنیا و رہبانیت، کے ذریعہ سے ایک مسلمان اپنا روحانی مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن میں جابجا محسنین یعنی اعمال حسنہ کرنے والوں کی تعریفیں ہیں۔ لہذا سب سے زیادہ اہمیت مذہبی ضرورت کے لحاظ سے مسلسل سعی و کوشش کی ہے اور یہ امر واقعہ سے ثابت ہے کہ دو قسم کے لوگ ہیں جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ محترم و واجب التعظیم سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی (۱) مجتہد (۲) مجاہد۔ اور ان دونوں لفظوں کا مادّہ جہد ہے جس کے معنی سعی و کوشش کے ہیں۔ ہمیں اقرار کرنا چاہیئے کہ اعلیٰ درجہ کی کوشش جس نے ایک زمانہ میں مسلمانوں کو ایک عظیم الشان قوم بنا دیا تھا۔ وہ قوم سے ایک عرصہ دراز سے علانیہ مفقود ہے۔ اس لئے ایک ماہر تعلیم کو اس پر لحاظ کرنے کی ضرورت ہے کہ مستحکم عقیدہ خدمتِ خلق، جرات و استقلال، یہ ان خصائص

وحسنات میں سے ہیں جن کی اشاعت و ترقی ہر سچی اسلامی تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے

قوم کے اندر نظم و ترتیب

قوم کے اندر نظم و ترتیب کا عام احساس بھی اجتماعی ترقی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ ہم سب کو اسلام کی جمہوری روح اور اخوت و مساوات پر بجا فخر و ناز ہے۔ لیکن یہ روح ترقی کا ذریعہ اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ قوم کسی نظم و قانون کے ذریعہ سے باہم پیوست ہو لیکن مسلمانوں کی تاریخ اور خود ہمارا روزمرہ کا تلخ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ پیوست کن قوت عرصہ سے مفقود و معدوم ہے اور اس کے تباہ کن نتائج ہمارے ہر چہار طرف نمایاں ہیں جب تک کہ مسلم ماہر تعلیم حیات اجتماعیہ اور ترقی کے اس اصلی اصول کو از سر نو زندہ نہ کر دے اس وقت تک یہ محض بے سود ہے کہ ہندوستان کے نظام سیاسی میں مسلمانوں کے لئے کسی معزز درجہ کا تصور بھی کیا جائے۔ اور اس صورت میں ہم سیاسی اور اقتصادی غارت گری کا ہمیشہ شکار رہیں گے۔ اس لئے اے حضرات ماہران تعلیم! میں یہ امر آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ نوخیز نسل کے اندر نظم وضابطگی کا قوی احساس پیدا کرنے کے لئے تدبیر و کوشش کا کوئی تجربہ اٹھا نہ رکھئے تاکہ ایک تندرست قوی اور متحدہ مسلم جماعت ہندوستان کی دوسری اقوام کے ساتھ اپنے وطن کے لئے ایک اعلیٰ تر منزل مقصود حاصل کرنے میں ممد و معاون بن سکے۔

تبدیلِ اصول

صنعت و حرفت

اجتماعی اضطراب و تموج جو ہمارے زمانہ میں اس درجہ نمایاں ہے اُس نے تعلیمی اصول کے اندر ایک بین تبدیلی کر دی ہے۔ یہ خیال کہ امراء و رؤساء کے لئے ایک قسم کی تعلیم درکار ہے اور باقی لوگوں کے لئے ایک بالکل ہی مختلف قسم کی تعلیم اس کی تائید اب صرف چند ہی ماہران تعلیم کرتے ہیں۔ ایٹن اور ہیرو اور آکسفورڈ و کیمبرج اب اعلیٰ ترین قسم کی تعلیم گاہیں نہیں سمجھی جاتیں۔ درحقیقت ایسے بہت سے لوگ ہیں جو یہ پیشین گوئی کرنے میں تامل نہیں کرتے کہ جب تک یہ درسگاہیں اپنے مقصد اور مطمح نظر کو یک قلم تبدیل نہ کر دیں اور اپنے نظام عمل کو زمانۂ حال کی جمہوری اجتماعی نظام کی ضروریات کے ساتھ اور زیادہ مطابق نہ کر لیں تو وہ بہت جلد بھولی ہوئی چیزوں کے انبار میں داخل ہو جائیں گی۔ بہر حال اس میں بہت کم شبہ ہے کہ اب تمام دنیا کا رجحان ایک طرف تو یہ ہے کہ ان اوصاف و خصائص کو مبالغہ آمیز اجتماعی

اہمیت نہ دی جائے جو کبھی نام نہاد سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے اور دوسری طرف یہ کہ ہاتھ پاؤں کی محنت بھی ہر قسم کی عزت و احترام کی مستحق ہے اور یہ کہ اس کی اقتصادی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہونی چاہئے جتنی کہ اس وقت ہے۔ ہم مسلمانوں کو انسانوں کے اجتماعی خیالات کے اندر اس انقلاب عظیم کا دل سے خیر مقدم کرنا چاہئے۔ کیوں کہ یہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے بہت سے رجال کبار کے عمل اور ارشادات کے مطابق ہے۔ اس واقعہ سے بڑی کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی کہ اکثر وہ اصحاب جنھوں نے تمام وہ تعلیم حاصل کی ہے جو ہندوستان کے اسکول اور کالج اور یونیورسٹیاں دے سکتی ہیں وہ معقول روزگار نہ پاسکیں حتیٰ کہ کسی قسم کی معاش تک حاصل نہ کر سکیں اس سے کل نظام کے اندر کسی بہت بڑے نقص کا ہونا ثابت ہوتا ہے اور میرے نزدیک اور کوئی سوال ایسا نہیں ہے جس پر ہندوستان کی عام رائے اس درجہ متحد و مصر ہو۔ تاہم اس میں تبدیلی کے لئے کچھ نہیں کیا جا رہا ہے اور بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے ماہران تعلیم بھی آپ کو یہی بتائیں گے کہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اس فتوے کو قبول نہیں کر سکتا۔ اور میں بلا تامل کہتا ہوں کہ جس بات کی ضرورت ہے وہ عزم کا رہے۔ اس لئے جو مسئلہ میں آپ کے سامنے پورے تیقن کے ساتھ پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے۔ ہر تعلیمی منزل (ابتدائی ثانوی اور کالجی) کے بعد اُن کو کسی ایسے پیشے اور حرفے کی تعلیم دی جائے جس سے فوراً روزگار مل سکے یا جس سے طالب علم کم از کم انسانی ضروریات بہم پہنچانے کے قابل ہو سکے۔ یا اپنی فنی یا ذہنی رجحان کو پورا کر سکے۔ آپ سب واقف ہیں کہ خود ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی پیروی میں اُن کے اکثر اصحاب رضوان اللہ علیہم اور بڑے بڑے ائمہ اور فقہا رحمۃ اللہ علیہم حتیٰ کہ شہنشاہ ہاتھ پاؤں کی محنت کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھنا یا ناپسند کرنا کجا ان کاموں کو خود ذریعہ معاش بنا گئے اور یہ روایت قائم کر گئے کہ جو کچھ اپنے ہاتھ سے پسینہ گرا کر کمایا جائے وہ ہر قسم کی دوسری کمائیوں سے مبارک تر ہے۔ نہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس قسم کا کاروبار طلب علم کے کچھ بھی خلاف سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ اسلامی شائستگی کی تاریخ کا یہ واقعہ ہے کہ بڑے بڑے علما اور صوفیہ اور فیلسوف اس حال میں علمی تحقیقاتیں کرتے اور بڑی بڑی کتابیں لکھتے تھے کہ اپنی روزی بھی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے۔ بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی محنت اور ایسے اعلیٰ درجہ کے ذہنی کام ایک دوسرے کے لئے ممد و معین ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں ایسے مفید صنائع اور حرفے ایجاد کئے جن کی مثال اب تک نہیں ہے اور اب بھی ہماری قوم ہندوستان کے بہترین اور مفید ترین پیشہ

پیدا کرتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ہر نوجوان کی اس کے رجحان طبیعت اور ماحول کی ضروریات
کے مطابق کسی مفید پیشے یا حرفے میں جیسے (زراعت، باغبانی، آہن گری، نجاری۔ پارچہ بافی
خیاطی، جفت سازی، نقشہ کشی، مصوری، معماری، زمینداری، انجنیری وغیرہ وغیرہ) میں تعلیم و
تربیت نہ کی جائے اور اسی کے ساتھ حفظان صحت، طبیعات، کیمیا وغیرہ جیسے علوم کے مبادی
سے واقف نہ کیا جائے۔ جب تک ہم یہ امر مرکوز خاطر نہ کرلیں۔ عوام الناس کی تعلیم ممکن ہے۔ جماعت
کے لئے اس سے زیادہ خطرناک اور بار ہو جائے جتنا کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا موجودہ نظام اس
ملک میں اس سبب سے ہے کہ بڑی حد تک اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ صنعت و حرفت
کی اعلیٰ تعلیم کی بھی زبردست مانگ ہو۔ اس کے بغیر ملک کی اقتصادی ترقی خاطر خواہ طور پر ہرگز نہیں ہوسکتی
ماہران فن ہمیں بار بار بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کے لئے جو موجودہ زمانہ کے صنعت و حرفت میں اعلیٰ درجہ
کی تعلیم حاصل کریں۔ کافی میدان عمل موجود نہیں ہے۔ میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایسے اصحاب مشکلات
پر تو نظر رکھتے ہیں لیکن ان پر غالب آنے کے وسائل و ذرائع شاذ و نادر ہی بتاتے ہیں بظاہر اس کا
جواب یہ ہے کہ تعلیم و تربیت یافتہ لوگوں کا وجود ہی ایسی حرفتوں کو جاری کر دے گا جن کے لئے
ایسے لوگ درکار ہوتے ہیں اور بہر حال کسی پیشہ کی تعلیم و تربیت پائے ہوئے لوگ کہیں نہ کہیں اس سے
زیادہ اور خوبی کے ساتھ کما سکیں گے۔ جتنا کہ وہ لوگ جنھوں نے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں صرف
آرٹ یا سائنس کی درسیات کی تعلیم حاصل کی ہو۔

خیال آفرینی اور استاد

ہمارے طریقۂ تعلیم پر یہ ایک بہت سخت اور جائز الزام ہے کہ اس سے فقط اخذ و نقل کی
قابلیت ترقی کرتی ہے اور خیال آفرینی اور بداہت کو ترقی دینے سے بے پرواہی کی جاتی ہے اس میلان
کو اس بات سے بہت زیادہ قوت ہوتی ہے کہ ہم زمانہ گزشتہ کی اندھا دھند پرستش کرتے ہیں اور
ہر بات کو جو پرانے لوگوں نے کہی ہے بے چون و چرا مان لیتے ہیں اور اس کو حد درجہ کی دانائی کی بات
سمجھتے ہیں۔ اس عام اعتقاد میں بڑی غلطی ہے کہ اختراع و ابتدا کرنے کی قوت ذہن انسانی کا گویا ایک
بالکل جداگانہ صیغہ ہے اور یہ ممکن ہے کہ ایک شخص میں قوت قبول بہت زیادہ ہو مگر قوت اختراع کم و بیش
مفقود ہو۔ اصل یہ ہے کہ مادہ اختراع اصلی دماغی قوت کی دلیل اور اس کا معیار ہے اور محض مادۂ قبول و تقلید
ایک کمزور اور ناقص ذہن کی علامات ہیں۔ اب کسی قدر کوشش کی جاتی ہے کہ خود سوچنے اور ابتدا کرنے

کے مادہ کو ترقی ہو مگر ابھی اس باب میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ماہر تعلیم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ بچوں کا دماغ گزشتہ کے اثر سے ترقی کرے اور ٹھٹھر نہ جائے۔

جو کچھ میں نے اب تک کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہرین تعلیم کا بہت زیادہ ضروری کام (ٹرینڈ) فن تعلیم اپنے مقصد والے اور ٹھیک قسم کے استادوں کا بہم پہونچانا اور یہ جاننا ہے کہ اُن سے کس طرح پر کام لیا جائے۔ آپ صاحبوں کو میرے ساتھ اتفاق ہوگا کہ ہر جگہ اور بالخصوص ہندوستان میں استاد بہت کم یاب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری خواہش کے خلاف اس ملک میں تعلیم کی ترقی اس قدر سست رفتار سے ہو رہی ہے۔

تربیت جسمانی

میں اس موقعہ پر آپ صاحبوں کو اس بات کی طرف بھی پوری توجہ دلاتا ہوں کہ تربیت جسمانی ایک ضروری چیز ہے اور تعلیم کی ہر اسکیم کا وہ جزو لاینفک ہے۔ تمدن انسانی کی ترقی کے واسطے دماغی قابلیت کی کتنی ہی قدر و قیمت کیوں نہ ہو اور اس وجہ سے وہ ہمارے لئے کتنی ہی قابل احترام کیوں نہ ہو مگر یہ ماننا پڑے گا کہ جسمانی خوب صورتی اور قوت نہ فقط قدرتی طور سے ہر ایک کو حیرت میں ڈالتی ہیں بلکہ ہر شئے سے زیادہ ہر زن و مرد کو خوش کرتی ہیں اور جسمانی تندرستی سب سے بڑی برکت ہے علاوہ ازیں اس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جسم میں بھی کم از کم اس قدر ترقی کی قابلیت ہے جس قدر کہ دماغ میں اور ایک طرف کی توجہ کرنے اور اس کو ترقی دینے کی اسی قدر ضرورت ہے جس قدر کہ دوسرے کی طرف۔ علاوہ ازیں صحت دماغی اور صحت جسمانی میں گہرا تعلق بطور علوم متعارفہ کے ہے اور بعض بڑی اخلاقی خوبیاں مثلاً جرات و استقلال لازمی طور سے جسمانی بنیاد پر قایم ہیں۔ ہم فی الحقیقت اپنی ذات اور سوسائٹی کے متعلق نہایت بڑی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں یعنی اپنی ذات۔ مقبوضات عزت اور آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتے ہیں تاوقتیکہ ہمارے پاس کافی ذخیرہ جسمانی طاقت جرات و ہمت و برداشت کا نہ ہو۔ بہت مدت سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک قوی انفرادی اور اور تمدنی زندگی کے ضروری اوصاف میں انحطاط ہو رہا ہے اور ہندوستان کے بعض حصوں اور بالخصوص میرے صوبہ بنگال میں یہ جسمانی انحطاط ایک بڑے خطرہ کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ باایں ہمہ کس قدر کم اشخاص ہیں جو تربیت جسمانی کو ماہرین تعلیم کے اصلی فرائض میں داخل سمجھتے ہوں۔ میں اپنے ماہرین تعلیم سے نہایت خلوص کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ وہ مسلمان نوجوانوں کی جسمانی نشو و نما میں پوری کوشش کریں

خواہ اس کی وجہ سے امتحانات میں کم طلبہ پاس ہوں اور اچھا درجہ نہ حاصل کر سکیں۔ اگرچہ مجھ کو یقین ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔ بہرحال امتحانات میں کمی کی زندگی میں کامیابی سے جو یقینی ہے کافی تلافی ہو جائیگی۔

عوام کی تعلیم

عام لوگوں میں تعلیم پھیلانے کے متعلق ہر شخص مانتا ہے کہ مفت اور جبریہ ابتدائی تعلیم ہی اس مسئلہ کا حل ہے اور یہی ترقی یافتہ ملکوں کے تجربہ سے ثابت ہوا ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑیگا کہ گو اس سے ملک کی گورنمنٹ پر الزام آتا ہے جس کو عوام کی خصوصیت کے ساتھ محافظت کا بڑا دعویٰ ہے کہ اس نے اس باب میں دل سے کچھ نہیں کیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ بنگال کی حالت اس باب میں سب سے بدتر ہے۔ ہر شخص کو جو ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے اور بالخصوص ہندوستان کے حکمرانوں کو اس خیال سے تکلیف ہونی چاہئیے کہ محاصل گورنمنٹ کا ایک نہایت حقیر حصہ مزدوری پیشہ لوگوں کی تعلیم پر بلکہ یوں کہو کہ ہر ایک ایسے کام پر صرف ہوتا ہے جس سے اُن کے نفع کا احتمال ہو حالانکہ محاصل ملک کا زیادہ تر حصہ اُن ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ درحقیقت گورنمنٹ بنگال نے عوام کو جن میں سے اکثر کاشتکار ہیں مفت ابتدائی تعلیم دینے کی تجویز کی ہے اور یہ حصہ خرچ کا بار اُن ہی کے سر پر رکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بنگال کے مالکان جائداد جن میں زیادہ تر پاٹیسٹین داخل ہیں اس پر بڑبڑا رہے ہیں میں نہیں جانتا ہوں کہ ہمارے منتخب ممبران لیجسلیٹو کونسل ملک سے ناخواندہ ہونے کا دھبہ دور کرنے کا عزم بالجزم کب کریں گے اور اس بات کو کب قبول کریں گے کہ صرف یہ اُسی وقت قابل عمل ہے جب کہ صرف وہی لوگ بار اٹھائیں جن میں برداشت کرنے کی قابلیت ہے۔

چند دن ہوئے کلکتہ میں یورپین ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ نے ہندوستان میں ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کی توسیع کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیا کہ رائے دہندوں کی ایک بڑی جماعت ناخواندہ ہے اور اس وجہ سے جماعت رائے دہندگان کی توسیع ناقابل عمل ہے اور اُن کی رائے میں بغیر اس کے پارلیمنٹ کی قسم کے انسٹی ٹیوشنوں کو ہندوستان میں موافق زمین نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بڑے پولٹیکل مسئلہ پر جس کی نسبت بہت اختلاف آرا ہے بحث کرنا نہیں چاہتا گو مجھ کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ اصلاحات کے بانیوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو خصوصیت کے ساتھ سفارش کیوں نہیں کی کہ عوام کی تعلیم کو بہت جلد ترقی دینا اُن کی اسکیم کا بڑا جزو ہے۔ بہرحال مجھ کو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ دولتمند اور طاقتور یورپین تاجر لوگ جن کی خوش حالی زیادہ تر رعیت اور مزدوروں کی وجہ سے

ہے گورنمنٹ آف انڈیا پر اپنا بڑا اثر کیوں نہیں ڈالتے تاکہ موجودہ "ناقابل اطمینان حالت درست ہو۔

زبانِ اردو اور مدرسہ

مجھ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تعلیم بڑے پیمانہ پر بلا امداد ایک وسیع لٹریچر کے نہیں ہو سکتی ہے جو عام آبادی کی دسترس میں ہو اس سے ہم فوراً ذریعہ تعلیم کے اور ایک مشترک زبان کے مسئلہ پر پہونچ جاتے ہیں جو ساری آبادی کی ایک ہو اور اگر یہ ابھی ناممکن ہو تو کم از کم ہندوستان کی آبادی کے اس حصہ کی مشترک ہو جس کو ہم مسلمان کہتے ہیں اور جن کی تعلیم کے واسطے ہماری خاص ذمہ داری ہے۔ سال گزشتہ میں نے علی گڑھ کی اپنی اسپیچ میں بتایا تھا کہ عربی رسم الخط کو اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ سے ایک مشترک زبان ہونا ممکن ہے جس میں ایک مرکب لغت ہو جو سنسکرت عربی اور فارسی سے ماخوذ ہو ایسی زبان فی الحقیقت اردو ہے جس کو ہم خواہ اس نام سے یاد کریں یا ہندی کہیں اس سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کو ایک مشترک قومی لٹریچر کو ترقی دینے کا بڑا موقع ملے گا۔ مگر یہ خیال ایسا ہے کہ جس کو فی الحال ہندو پولیٹیشن قبول نہ کریں گے۔ لہذا میں اس پر زیادہ گفتگو نہ کروں گا۔ با ایں ہمہ یہ ہمارا سب سے بڑا فرض ہے کہ فی الحال ہم اپنی ساری قوت کو اردو کی ترقی میں صرف کریں کیوں کہ فقط اس کے ذریعہ سے اسلامی روحانی قوتوں اور نیز اسلامی تاریخ اور شائستگی کی اعلیٰ روایتوں کو بغرض تعلیم استعمال کرنا ہمارے لئے ممکن ہے۔ اس کانفرنس کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ روشن خیالی کے ساتھ ترقی کرنے کے لئے ہم کو اپنے علماء سے بھی امداد لینی چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے ہندوستان کے بڑے مدرسوں کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے تاکہ وہ دیگر تعلیمی ذرائع کے ساتھ ساتھ اپنے مناسب فرائض ادا کر سکیں۔ متمدن زندگی مثل ایک قالب کے ہے اور اس میں میلان علیحدگی سے زیادہ کوئی چیز بربادکن نہیں ہو سکتی۔

مہذب گھر

چوں کہ تعلیم کا ایک ضروری جزو گھر میں شروع ہوتا ہے اور خود قدرت نے اُس کو ماؤں کے سپرد کیا ہے تعلیم کے طرق و ذرائع پر بحث کرنے میں ہماری توجہ لازمی طور سے ایسی سمت میں پھرتی ہے کہ جہاں ایک بھاری اور ناقابل گزار پردہ ہماری نظروں کے سامنے پڑا ہوا ہے جب تک کہ مسلمان عورتیں اُس قسم کی تعلیم حاصل نہ کر لیں جو میں نے بتانے کی کوشش کی ہے اس مشکل کو کسی قدر حل کرنے

کا صرف یہ طریقہ ہے کہ ہم اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو جہاں تک ممکن ہو ابتدائی عمر میں کسی مناسب مدرسہ میں بھیجیں اور کم از کم جہاں تک کہ ہمارے لڑکوں کا تعلق ہے ہم کو اُنھیں جس قدر زیادہ عرصہ تک ممکن ہو زنان خانہ کے کمزور کرنے والی ہوا سے دور رکھنا چاہیئے۔ اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم برابر ترقی نہ چلی جائے تو ہم کو جس طرح بھی ہو سکے اپنی لڑکیوں کو اچھی اور مناسب تعلیم دینی چاہئے تا کہ جہالت ناقابلیت اور مسلسل جسمانی اور دماغی انحطاط لاعلاج ہونے سے پیشتر رک جائے یقین کیجئے کہ ہماری لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ایسا ہی اشد ضروری اور ہماری فوری اور دلی توجہ کا محتاج ہے جس قدر کہ لڑکوں کی تعلیم کا۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اُس باپ میں اپنے فرائض پدری اور انصاف کے احساس کا فقدان ہے جو اپنے لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے مگر اپنی لڑکیوں کو تعلیم کی برکتوں سے محروم رکھتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس باب میں عام رائے کو پورے طور سے آمادہ کرنے میں دیر نہ کیجئے تا کہ آئندہ نسل میں ایک غیر تعلیم یافتہ مسلمان گھر اسلام کے واسطے ذلت سمجھا جائے۔

کام کی عظمت

حضرات! ۳۰ کروڑ انسانوں کو جو عمر کے مختلف مدارج طے کر رہے ہیں۔ مناسب اور موزوں تعلیم دینا ایک بڑا بھاری، بلکہ دل ہلانے والا کام ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک جماعت کثیر تنخواہ دار و آنریری سرگرم اور قابل کام کرنے والوں کی موجود ہو جو اُس پر اپنا دماغ اور وقت صرف کرے ان تیس کروڑ انسانوں میں سے ایک جزو یعنی سات کروڑ کی مشکلات اور ضرورتوں سے ہم خصوصیت کے ساتھ واقف ہیں اور یہ جزو اس تعلیم کے باب میں اور بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے ایک بہت ناقابل اطمینان حالت میں ہے۔ تعلیم اب ایک منتقل شدہ مضمون ہے یعنی اُس کا انتظام رعایا کے نمائندے کرتے ہیں۔ لہذا اب ہم کو توقع ہے کہ گورنمنٹ پر اثر ڈالیں بلکہ اُس کو مجبور کریں کہ ہندوستان کی تعلیمی سطح زیادہ اور زیادہ بلند ہو اور ہماری قوم کی خاص مشکلات اور رکاوٹیں دور ہوں ایک تجویز جو میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کانفرنس با خبر ماہرین تعلیم کی ایک مستقل کمیٹی یا کمیٹیاں بنائے جو تعلیم کے مختلف شعبوں کے واسطے خوب سوچ سمجھ کر ایک پالیسی اور کام کا پروگرام تجویز کریں اور اُس کو عمل میں لاویں اور وزیر تعلیم سے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں اور مشورہ اور تجاویز سے اُس کی مدد کریں۔ اگر اس قسم کی کمیٹیاں مختلف صوبجات میں قایم ہو جاویں تو مجھ کو یقین ہے کہ وہ بہت مفید ثابت ہوں گی۔ ہم کو زمانہ کے میلان اور ضرورتوں کو دیکھتے رہنا اور اُن مختلف طریقوں اور انتظامات کا مطالعہ کرنا ہے جو دوسرے ملکوں میں

پیدا ہوئے ہیں اور یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان کی خاص حالت اور مسلمانوں کی تعلیم کے مخصوص مسائل کے لحاظ سے کون سا طریقہ موزوں ہوگا اور پھر مشکلات پر غالب آنے کے واسطے طرق اور ذرایع تجویز کرنا ہیں۔ ان سب باتوں کے واسطے ایک مستقل انتظام کی ضرورت ہی جیسا کہ آپ کا ہی۔ آپ کو اپنا کام کرتے رہنا ہوگا جب تک کہ گورنمنٹ کا صیغہ تعلیم رفتہ رفتہ اس قدر ترقی نہ کرلے کہ اس کو بیرونی مدد کی ضرورت نہ رہے۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا ہی کہ اور آپ یقین کریں کہ ابھی بہت برسوں تک آپ کو سخت محنت کرنی ہوگی۔ اُس وقت ایسی حالت پیدا ہوگی کہ صحیح طریقوں پر ترقی یقینی ہو۔ جو کام آپ صاحبوں نے اپنے ذمہ لیا ہی اُس کی مقدار کا خاکہ میں نے آپ صاحبوں کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ قوم کو معلوم ہو کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے کیوں کہ تعلیم کی ضرورت جدید حالات کے مطابق مسلّم ہونے اور صیغہ تعلیم کا انتظام منتخب شدہ کونسلوں کے سپرد ہونے سے کانفرنس کا کام بجائے گھٹنے کے بڑھ گیا ہے۔ ابھی وسیع میدان تعلیم کے ایک مختصر حصہ کی سطح پر ہلکے ہاتھ سے عمل کیا گیا ہی۔ اور بہت کچھ باغ کی ترتیب، قطعات کا تعیّن، اُن کو کھودنا، کھاد ڈالنا اور آب پاشی کرنا ابھی باقی ہے اور جب تک یہ سب کام پورے نہ ہوں ایک سدا بہار باغ جس میں قوت نمو مالا مال بار آور درخت اور خوشبودار پھولوں کے پودے ہوں اور جس کا خواب ماہر فن تعلیم دیکھ رہا ہے مکمل نہیں ہو سکتا۔

اجلاس چہلم

(منعقدۂ مدراس سنہ ۱۹۲۷ء)

صدر سر شیخ عبدالقادر خان بہادر کے سی آئی ای

حالات صدر

شیخ عبدالقادر قصور (ضلع لاہور) کے خاندان شیوخ سے جس کے ممبر سلطنت مغلیہ، حکومت سکھ، اور انگریزی عملداری میں مقتدر عہدوں پر مامور رہے ہیں نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین صاحب مرحوم صیغۂ مال میں لدھیانہ میں سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں اقامت گزیں تھے۔ یہاں سنہ ۱۸۷۴ء میں شیخ عبدالقادر پیدا ہوئے۔ چوں کہ آپ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ لہٰذا شروع سے عمدہ تعلیم و تربیت دینے پر توجہ کی گئی۔ جب وہ وقت آیا کہ آپ اسکول میں داخل ہوں تو آپ نے اپنی ذہانت اور شوق علم کا ثبوت اس طرح پر دیا کہ ہمیشہ اپنی کلاس میں بہترین طلبہ کی صف میں نظر آتے تھے۔ مدرسہ کی تعلیم کے علاوہ شفیق باپ جو فارسی زبان سے خاص مناسبت اور ذوق رکھتے تھے فارسی کے سبق خود پڑھاتے تھے لیکن اس عمر میں اور اسی زمانہ میں جب کہ لڑکوں کی دماغی اور عقلی نشو و نما اور اخلاقی تربیت کی نگہداشت کے لئے ایک پختہ کار محافظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ (۱۶) برس کی عمر میں آپ کے سر سے شفیق باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ اور آپ حقیقی رہ نمائی سے محروم ہو گئے۔ زندگی کی دشوار گزار اور کٹھن منزلوں میں جن لوگوں کو اس قسم کے مصائب سے مقابلہ کرنا پڑا ہے اس کے درد آشنا وہی قلوب ہو سکتے ہیں جن پر یہ بیتا پڑی ہے۔ یہ تکلیف اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب کہ آگے پیچھے کوئی

خان بہادر سر شیخ عبدالقادر
صدر اجلاس چہارم (مدراس سنہ ۱۹۲۷ ع)

دوسرا یگانہ ڈ بیگانہ دیکھنے بھالنے اور سہارے کے لئے موجود نہ ہو۔ لیکن مبارک بادی کے قابل ہیں وہ لوگ اور فخر کے لایق ہیں وہ سپوت بیٹے جو اس قسم کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اپنے وجود سے اپنے اسلاف کا نام روشن کرتے ہیں۔ اور اپنی ہستی سے ملک اور قوم کی ناموری اور عزت میں چار چاند لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیخ عبد القادر کا نام اور کام انھیں جواں ہمت لوگوں کی فہرست میں لکھا جائے گا جن کی سلیم الطبعی اور استقامت نے ان کی ہمت اور جوش کو ایسی مصیبت کے وقت میں نہ فقط متزلزل ہونے سے روکا بلکہ خودداری اور شرافت نفس کے جوہر فطری نے ذوق علم کی تشنگی کو تیز کرنے کے ہمت اور کوشش کے قدم بڑھانے میں مدد کی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے پرخطر زمانہ میں تن تنہا اپنی ذاتی کوشش، اعتماد علی النفس اور بہترین خیالات کے ذریعہ سے اپنی پر متانت شخصیت، سنجیدہ طبیعت اور جمال علمیت کو اس شان کے ساتھ پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی جو سوسائٹی کی جان اور ملک و ملت کا محبوب سرمایہ ہے۔

شیخ عبد القادر نے فورمین کرسچین کالج لاہور میں تعلیم پائی اور فن تعلیم کے مشہور ماہر ڈاکٹر سر جے سی آر ایونگ کی شاگردی سے بہرہ اندوز ہوئے۔

اسکول اور کالج کی ڈبیٹنگ سوسائٹیوں سے ان کو ہمیشہ دلچسپی رہی جن کے بحث و مباحثہ میں وہ دلی شوق سے شریک ہوتے اور حصہ لیتے تھے۔ اردو ادبیات اور اس زبان کی شاعری سے ذوق سخن لینا انھوں نے اسکول کلاسوں ہی میں شروع کر دیا تھا اور یہ چسکا کالج کلاسوں کی آخر منزل تک جاری رہا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ ایک زمانہ میں خوش بیان مقرر فصیح و بلیغ لکچرر نامور ادیب اور کامل انشا پرداز بن کر اٹھیں گے۔ چنانچہ گریجویٹ ہونے سے پہلے ان کی خوش تقریری اور اسپیکری کی شہرت وسعت پکڑنے لگی تھی۔ جس وقت وہ انڈر گریجویٹ تھے انھوں نے مشہور اردو مصنفین کی نظم و نثر کے متعلق انگریزی میں متعدد لکچر دیئے جن کی علمی اور ادبی حلقوں کی طرف سے حوصلہ افزائی کے ساتھ داد سخن دی گئی۔ ان لکچروں کا مجموعہ ۱۸۹۸ء میں بعنوان "نیو اسکول آف اردو لٹریچر" شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ کتابی شکل میں اس قدر مقبول عام ہوا کہ ۱۹۲۱ء میں دوسرا اڈیشن نکالنا پڑا۔ آپ نے ۱۸۹۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ جوں جوں علم کے ساتھ عمل کی حلاوت سے لذت آشنا کرنا شروع کیا۔ آپ کے دل میں قوم اور ملک کی خدمت کا ولولہ پیدا ہوتا گیا۔ بی اے ہونے کے بعد اور اردگرد کے حالات کے مطابق بجائے اس کے کہ آپ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کی کوشش کرتے، اخبار نویسی اختیار کی اور ۱۸۹۵ء میں اخبار "آبزرور" کی اسسٹنٹ ایڈیٹری

قبول کرلی۔ ۱۸۹۸ء میں اسی اخبار کے چیف ایڈیٹر ہوگئے اور ۱۹۰۲ء تک کامل دس برس اخبار نویسی کے اہم فرائض پوری قابلیت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ "آبزرور" اس زمانہ کے مشہور اور باخبر اخباروں میں شمار ہوتا تھا، بنگال، بمبئی، مدراس وغیرہ میں برادران وطن کے بیسیوں مشہور روزنامے جاری تھے لیکن اس وقت تمام ہندوستان میں اگر مسلمانوں کا کوئی ترجمان تھا تو فقط آبزرور جو اپنی اصابت رائے سنجیدہ خیالات سے ملک اور قوم کی رہنمائی میں کسی سے کم نہ تھا۔ شیخ عبدالقادر بحیثیت ایڈیٹر آبزرور نہ صرف اچھی انگریزی لکھنے میں شہرت حاصل کرچکے تھے بلکہ ان کی اردو تحریریں بھی نہایت دلچسپ اور بامزہ ہوتی تھیں اور ان کے قلم کی قوت اور خیالات کا زور عام طور پر مان لیا گیا تھا۔ اُردو ادب کے ذوق نے ۱۹۰۱ء میں ایک ماہوار رسالہ جاری کرنے کے لئے ان کو آمادہ کیا جو "مخزن" کے نام سے پیدا ہوکر آسمان شہرت پر چمکا۔ اس رسالہ نے اردو زبان کی خدمت گزاری میں بڑا حصہ لیا اور بالآخر کئی سال کی پربہار زندگی کے کامیاب نشان چھوڑنے میں کامیاب ہوا، اور مالک رسالہ کے انتقال سے رسالہ مذکور کی عمر بھی ختم ہوگئی۔

شیخ عبدالقادر نے مخزن کے ذریعہ سے نہ صرف بہترین قسم کا بہترین لٹریچر مرتب کیا بلکہ اس ذریعہ سے بہت سے نوخیز مصنفین کو چمکنے اور ابھرنے کا موقع دیا۔ اس کے مضمون نگاروں کی صف میں اعلےٰ پایہ کے ناثر و ناظم شامل نظر آتے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر سر اقبال، چودھری خوشی محمد خاں ناظر، جسٹس شاہ دین، سید غلام بھیک نیرنگ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی ظفر علی خاں، سید سجاد حیدر، مولٰنا حسرت موہانی، منشی دیا نراین نگم وغیرہ۔ وہ مخزن کے ایڈیٹر ۱۹۱۱ء تک رہے۔ اس کے بعد آنریری اڈیٹری کے فرائض ۱۹۲ء تک انجام دیتے رہے۔

مرحوم مخزن کے مضامین کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں چنانچہ انتخاب مخزن کا حصہ اول و دوم شائع ہوکر سرکاری اسکولوں اور دولت آصفیہ کے مدارس میں بطور نصاب تعلیم داخل ہے۔

شمس العلماء مولوی محمد یوسف رنجور نے کلکتہ میں مضامین مخزن کا ایک اور مجموعہ کلام اُردو کے نام سے چھاپا جس کو بورڈ آف اگزامنرز کلکتہ نے سول و ملیٹری افسروں کے کورس میں داخل کیا۔

۱۹۰۲ء میں ان کو اخبار آبزرور کے مالک سے بعض اختلافات پیش آجانے کے باعث قطع تعلق کرنا پڑا۔ اس غیر متوقع واقعہ کی بدولت وہ اخبار نویسی کے بجائے دوسرے مشاغل اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور پیشۂ وکالت اختیار کرنے کی غرض سے ۱۹۰۴ء میں انگلستان گئے اور ۱۹۰۷ء میں بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے۔ دوران قیام میں انگلستان میں انھوں نے تین سال کا زمانہ

مفید مشاغل میں بسر کیا۔ انھوں نے نہ صرف قانون پڑھنے اور سند لینے کی کوشش کی بلکہ پڑھنے، دیکھنے سننے کے بعد ہر چیز پر غور کیا اور ہر قسم کے خیالات کو دے کر اس کی حقیقت سے واقفیت بہم پہونچائی۔ وہ تعلیمی سیاسی اور سوشیل غرض ہر مجلس سے اور اس کے لیڈروں سے مسائل حاضرہ پر گفتگو کرکے دماغی تربیت کی اصلاح پیش نظر رکھتے تھے انھوں نے دادا بھائی نوروزجی مسٹر گوکھلے آں بھائی سے پولٹیکل معاملات پر عبور حاصل کرنے کی غرض سے ملاقاتیں کرکے دوستی پیدا کی۔ قومی اور اسلامی خدمات کے جذبے نے رائٹ آنریبل سید امیر علی اور مشہور آفاق بلگرامی برادران سے مراسم اخوت پیدا کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ وہ بارہا لندن میں مختلف انجمنوں میں ایک بلیغ لکچرار کی صورت میں تقریریں کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک بڑی تعطیل محض فرانسیسی زبان سیکھنے کے شوق میں صرف کی۔ دوسری تعطیل قابل دید مقامات کے سفر میں گزاری جن میں پیرس، میلان، اتھنس، قسطنطنیہ، شام بوڈاپسٹ، وائنا برلن، وغیرہ شامل ہیں۔ سفر قسطنطنیہ کے سلسلہ میں ترکی حکومت، ان کی معاشرت تعلیمی اخلاقی کیفیت اپنے تجربات اور مشاہدات کو ہندوستان میں واپسی کے بعد سفرنامہ کی صورت میں بزبان اُردو شائع کیا جس کا نام "مقام خلافت" ہے۔ مقام خلافت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں تو کس گہری نظر سے دیکھتے ہیں جس سے ان کی مطالعہ کی قوت اور وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب پر اخبارات نے نہایت عمدہ تبصرے کئے اور پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے انعام دیا ہے۔

اُنھوں نے یورپ سے واپس آکر دہلی میں وکالت شروع کی پھر دو سال بعد دہلی سے لاہور منتقل ہوگئے ۱۹۱۱ء میں آپ لائل پور کے گورنمنٹ پلیڈر اور پبلک پراسیکیوٹر مقرر ہوئے اور اس عہدہ پر آٹھ سال تک یعنی ۱۹۱۹ء تک کام کیا۔ لائل پور میں آپ نہ صرف فوجداری کے مشہور وکیل سمجھے بلکہ نہایت دیانت دار وکیل سرکار تصور کئے جاتے تھے ۱۹۲۰ء میں آپ نے اس ملازمت سے استعفاء دے دیا اور لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کردی جہاں آپ کو اپنی قانونی قابلیت کے اظہار کا موقع ملا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں آپ عارضی جج کی حیثیت سے ہائی کورٹ لاہور کی بنچ میں بیٹھے اور بعد ازاں ایک سال کے لئے ایڈیشنل جج ہائی کورٹ کی معزز خدمت پر آپ کا تقرر کیا گیا۔

۱۹۲۳ء کے آخر میں مغربی اضلاع کی طرف سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور اس خدمت کو خوش اسلوبی کے ساتھ آخر ۱۹۲۶ء تک انجام دیا۔ کونسل میں داخل ہوتے ہی آپ کونسل کے وائس پریسیڈنٹ اور دسمبر ۱۹۲۵ء میں پریسیڈنٹ منتخب ہوئے اور اس منصب پر آپ سب سے

پہلے منتخب شدہ ہندوستانی پریسیڈنٹ تھے ۱۹۲۵ء میں گورنمنٹ پنجاب کے وزیر تعلیمات کی عارضی جگہ خالی ہونے پر آپ ہی کا تقرر گورنمنٹ نے مناسب سمجھا اور پریسیڈنٹ کونسل اور وزیر تعلیم کی دونوں اہم خدمات نہایت دانشمندی اور حسن تدبیر کے ساتھ اس انداز سے ادا کرنے میں کامیاب ہوئے کہ اگر ایک طرف کونسل کا ہر ممبر آپ کا مداح رہا تو دوسری طرف پبلک ثناخواں رہی۔

۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بمنظوری وزیر ہند شیخ عبدالقادر کو اپنا نمائندہ مقرر کر کے انجمن اقوام عالم میں بمقام جنیوا روانہ کیا اور جنیوا سے واپس ہونے کے بعد لوکل گورنمنٹ نے لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر منتخب ہوئے۔

جون ۱۹۲۷ء میں سر کے معزز خطاب سے سرفراز کئے گئے اور جولائی ۱۹۲۷ء میں جب میاں سر فضل حسین ریونیو ممبر ایگزیکٹیو کونسل گورنمنٹ پنجاب ہندوستان کے نمائندہ مقرر ہو کر انجمن اقوام عالم کے اجلاس میں شرکت کے لئے مامور ہوئے تو ان کا مہتم بالشان عہدہ سر عبدالقادر کو دیا گیا اور اس خدمت سے نومبر ۱۹۲۷ء میں سبک دوش ہوئے۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں سر شیخ عبدالقادر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چالیسویں سالانہ جلسہ کے صدر بمقام مدراس قرار پائے۔ جن کے نامور کام اور عالمانہ خطبہ پر سلسلۂ خطبات کا اختتام ہے۔

خطبۂ صدارت

حضرات!

میں آپ کی خدمت میں اپنا دلی شکریہ پیش کرتا ہوں کہ آپ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے مجھے دعوت دی اور میری عزت افزائی فرمائی۔ اس کانفرنس کا اجلاس صوبۂ مدراس میں دوسری مرتبہ ہو رہا ہے۔ پہلا اجلاس ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا جسے اب ایک صدی کے چوتھے حصے سے زیادہ ہو لیا ایسی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت فی الحقیقت موجب افتخار ہے جس کی بنا سر سید احمد خاں مرحوم جیسے سرپرست قوم مسلمان نے رکھی تھی۔ زمانۂ حال میں ہماری قوم نے جو کچھ بھی ترقی کی ہے یہ سب سید موصوف کی سرگرم مساعی کا نتیجہ ہے۔ مرحوم اس کانفرنس کے اولین بانی اور آنریری سکرٹری تھے اور اس سے انھوں نے یہ کام لیا کہ مسلمانوں میں تعلیم سے دلچسپی

پیدا ہو۔ اور وہ اپنی مدد آپ کرنے کا بلند خیال پیش نظر رکھیں۔ اس اہم مقصد کی اشاعت اس مرحوم رہ نمائے قوم کی زندگی بھر جاری رہی ہے۔ اور اُن کے انتقال کے بعد اس کام کا بیڑا اُن کے دوست اور رفیق نواب محسن الملک مرحوم نے اٹھایا۔ اور اُن کے بعد اُن کے دوسرے ان تھک رفیق نواب وقار الملک مرحوم نے اس مفید کام کو جاری رکھا۔ یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس جماعت کی کارگزاریوں اور اس کے دلچسپ دور ترقی کا ذکر بہ تفصیل آپ کے روبرو کیا جائے۔ یا ان سب بزرگانِ ملت کے نام لئے جائیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً کانفرنس کی کامیابی میں مدد دی ہے اس قدر عرض کردینا کافی ہے کہ گزشتہ چالیس سال جس قدر بھی بڑے بڑے آدمی مسلمانان ہند میں ہوئے ہیں یا جنھوں نے اچھی خدمات قومی انجام دی ہیں۔ اُنھیں بالعموم اس کانفرنس سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔ کئی سال تک اس کی عنانِ نظم ونسق میرے واجب الاحترام دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ہاتھوں میں رہی اور جب وہ صاحب وزیر ہند کی کونسل کے رکن ہوکر انگلستان چلے گئے تو اس کی ذمہ داری کا قرعۂ فال ہمارے قابل سیکرٹری نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی کے نام نکلا۔ ان کی اسلامی محبت، اور مسلمانوں کی مذہبی علمی ترقی سے ان کی گہری دلچسپی آپ صاحبان سے پوشیدہ نہیں۔ انہی کی کوشش سے وہ روایات جو اس کانفرنس سے مخصوص تھیں قائم رہیں۔ وہ اعلیٰ تخیل جو کانفرنس کے ممتاز بانی نے پیش کیا تھا قوم کی نگاہ میں جچا رہا۔ جنگ عظیم کے حوصلہ فرسا زمانے میں اور ان متغیر حالات میں جو جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوئے۔ کانفرنس جیسی محض ایک تعلیمی جماعت کی مشعل کو روشن رکھنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ۱۹۱۹ء کے واقعات کے بعد جو سیاسی جوش ملک ہند میں پیدا ہوا۔ اس کی موجودگی میں لوگ سوائے سیاسیات کے کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور ہماری قوم اس قاعدہ کلیہ سے کچھ مستثنےٰ نہ تھی۔ دیگر ابنائے وطن کی طرح اُن میں بھی ہیجان تھا اور ان کے دماغ بھی سیاسی امور کے متعلق کوئی فوری تغیر پیدا ہونے کے خواب لے رہے تھے۔ کوئی مشورہ جو دور اندیشانہ ہو سنا نہیں جاتا تھا۔ اگر کوئی اُن سے کہتا تھا کہ تعلیم وسیع پیمانے پر پھیلانی چاہیئے۔ اور بہت گہری ہونی چاہیئے اور اس کے بعد سیاسی ترقی کی امید رکھنی چاہیئے تو اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں کرتا تھا بلکہ بعض لوگ اس رائے پر ہنستے تھے اور اُسے دقیانوسی اور پارینہ بتاتے تھے۔ مگر ہمارے باہمت سیکرٹری صاحب ان نامساعد حالات سے خوف زدہ نہ ہوئے اور انھوں نے خاموشی، مگر استقلال کے ساتھ اُس کام کو جو اُن کے سپرد تھا جاری رکھا۔ اور کئی جگہ بہت کامیاب اجلاس اس کانفرنس کے ہوتے رہے۔ چنانچہ اُن میں ۱۹۲۵ء کا اجلاس

علی گڑھ کالج (جو اب مسلم یونیورسٹی ہے) کی جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوا، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں دہلی میں اجلاس ہوا اور اس سال ہم آپ کی پرشوق دعوت پر دوسری مرتبہ مدراس میں جمع ہوئے ہیں۔

صاحبان! کچھ عرصہ سے بعض لوگوں کی رائے کا یہ میلان ہے کہ اب اس تعلیمی کانفرنس کی یہ حیثیت ایک ایسی جماعت کے جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی علم بردار ہو ضرورت نہیں رہی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پرزور مخالفت جو ایک زمانے میں تعلیم جدید اور انگریزی پڑھنے سے متعلق تھی اور جس کا مقابلہ سر سید مرحوم کامیابی سے کرتے رہے اب باقی نہیں بلکہ حضرات علماء بھی موجودہ تعلیم یا کم از کم تعلیم جدید اور تعلیم مذہبی کو یک جا کرنے کے موافق ہو گئے ہیں اور اس لئے ہمیں اس کانفرنس کے مقاصد کی اشاعت پر خرچ کرنے کی اور اس کے لئے تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اب ملک کے مختلف حصوں میں صوبہ وار تعلیمی کانفرنسیں پیدا ہو گئی ہیں اور وہ اپنے اپنے صوبے کی تعلیمی ضروریات کی اچھی طرح خبر گیری کر سکتی ہیں اور اس صورت میں آل انڈیا اجتماع کی اور اس کے مصارف کثیر برداشت کرنے کی حاجت نہیں رہی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ دونوں وجوہات خاصی پُرزور ہیں مگر میں ان حضرات سے جو یہ رائے رکھتے ہیں۔ بہ ادب اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ گو یہ درست ہے کہ تعلیم جدید کے خلاف جو تعصب تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ ملک کے کئی حصوں میں یہ تعصب اب تک موجود ہے اور خاص کر اُن علاقوں میں زور دار ہے جہاں اُن صاحبان کا اب تک زیادہ اثر ہے جو مولویت کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ وہ تعلیم جدید کو برا کہتے ہیں اور اس کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور مذہبی اور دیگر وجوہات سے کم اس کا اثر زائل کرتے ہیں۔ رہیں صوبہ وار کانفرنسیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مفید کام کر رہی ہیں۔ مگر اُن کی مساعی کم و بیش غیر مسلسل ہوتی ہیں اور اُن کے باوجود ایک آل انڈیا جماعت کی ضرورت باقی رہتی ہے جو اُن مساعی کی کمی کو پورا کرے۔ اور ان کا تتمہ اور تکملہ ہو۔ علاوہ بریں یہ بھی قابل تسلیم ہے کہ اس قسم کی تحریک مسلمانانِ ہند کے اجتماع کے خیال سے اور اُن میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے بہت کارآمد ہے۔ اس زمانہ میں جب سیاسی خیالات میں بہت اختلاف ہو اور مختلف افراد قوم اور اسلامی فرقوں کے اغراض میں باہم تصادم ہو رہا ہو۔ یہ غنیمت ہے کہ اس کانفرنس کے زیر سایہ مختلف فرقوں کے مسلمان یکجا بیٹھے ہیں۔ اور شیعہ سُنی۔ مقلد غیر مقلد۔ احمدی غیر احمدی سب مل کر قوم مسلمانان کی ذہنی اور مادی ترقی کی تدابیر سوچتے اور مشترکہ منزل مقصود کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں گزشتہ اجلاس کانفرنس منعقدہ مدراس میں جو سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا، شریک تھا۔ اس صوبے میں وہ جلسہ مسئلہ تعلیم کے حل کرنے کی کوشش کا گویا آغاز تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ نے "انجمن تعلیم مسلمان جنوبی ہند" کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً آپ کی انجمن تعلیمی کے جلسے ہوتے رہے اور یہ انجمن مختلف قسم کے مفید کام سرانجام دیتی رہی اس نے مسلمان طلبہ کو وظائف دینے کے لئے چندہ جمع کیا تاکہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اس نے کئی نئے مدرسے قایم کئے اور پہلی تعلیم گاہوں کو تقویت دی یہ انجمن کئی دفعہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل کی طرف اور خاص کر ما پلا قوم کی تعلیم کی طرف توجہ دلاتی رہی۔ مدرسہ اعظم مدراس جس میں پہلے انٹرنس کے درجہ تک تعلیم ہوتی تھی اسی کانفرنس کی تجاویز کی بدولت اور بعد میں آپ کی انجمن کے مسلسل اصرار سے بی اے تک کی تعلیم دینے والا کالج بن گیا۔ بلکہ ایک مرتبہ اسے گھٹا کر ایف اے تک کی پڑھائی والا کالج بنانے کی تجویز ہوئی تھی مگر آپ کی انجمن اس تنزل کو روکنے کے لئے کامیاب ہوئی۔ ایک اور مدرسہ ہیرس اسکول نامی پہلے عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھا اور پھر سرکاری مدرسہ ہو گیا تھا۔ اسے بھی آپ کی انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور انجمن کے سپرد ہونے کے بعد اس میں معقول ترقی ہوئی ہے۔ غرض آپ کی انجمن کے کارنامے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ استقلال کے ساتھ برابر بڑھتی رہی ہے گو اس کی رفتار ترقی کسی قدر سست رہی ہو اور بہرحال جو کام اس نے انجام دیا ہے اُس کے لئے مبارک باد کی مستحق ہے۔ اگرچہ ہماری قوم کی بے شمار ضرورتوں کے لحاظ سے جو کچھ ہوا ہے کم ہے۔ اس داد میں آل انڈیا کانفرنس بھی بجا طور پر حصہ دار ہے۔ آپ کی انجمن کا قیام اور اس کے قیام سے جو فوائد تعلیم مسلمانان جنوبی ہند کو پہونچے ہیں وہ کانفرنس کے مفید ہونے کی بہترین شہادت ہیں۔

جب کانفرنس یہاں پہلے پہل آئی۔ اُس وقت مسلمانان صوبۂ مدراس کی جو حالت تعلیم کے بارے میں تھی اس کا اندازہ آپ کو فقرات ذیل سے ہو سکے گا۔ جو مسٹر جسٹس بدرالدین طیب جی؟ — جو مسٹر جسٹس باڈم آں جہانی کے پُر مغز خطبۂ صدارت سے لئے گئے ہیں۔ جو اُنھوں نے سنہ ۱۹۰۱ء کی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے پڑھا تھا۔

"پبلک ابتدائی مدارس میں مسلمان لڑکوں کی تعداد ستاون ہزار سات سو چار ہے (۵۷۷۰۴) مگر یہ تعداد لوئر ثانوی درجہ میں جا کر یک دم ایک ہزار پانسو انتیس (۱۵۲۹) رہ جاتی ہے۔ بی اے کی ڈگری صرف گیارہ آدمیوں نے لی۔ ڈاکٹری۔ انجنیری اور معلمی کے امتحان میں ماسٹر کی ڈگری والوں میں ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ یونیورسٹی کے کیلنڈر سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری یونیورسٹی میں جس میں میسور، ٹراونکور حیدرآباد بھی شامل ہیں۔ سات ہزار دو سو تیس (۷۲۳۰) گریجوایٹ ہیں جن میں صرف ستاون (۵۸)

مسلمان ہیں۔ اور ڈاکٹری میں ڈیڑھ سو لائسنشیئٹ امتحان پاس کرنے والوں میں فقط سات مسلمان۔"

مندرجہ بالا اعداد کا مقابلہ اگر حال سے کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس نے جو بیداری پیدا کی اور اس کے بعد آپ کی انجمن اس کوشش میں مصروف رہی۔ اس کی بدولت اس صوبہ کے ثانوی مدارس میں طلبہ کی تعداد ۲۶-۱۹۲۵ء میں نو ہزار تین سو بیس (۹۳۲۰) تک پہنچ گئی اور صیغۂ آرٹس کے کالجوں میں اُن کی تعداد دو سو ستانوے (۲۹۷) اور مختلف پیشوں کے کالجوں میں پچپن (۵۵) ہوگئی۔ وہ درسگاہیں جو مسلمانوں سے مخصوص تھیں دو ہزار نو سو چھیاسی تھیں۔ اور اُن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ تہتر ہزار ایک سو ستاون (۱۷۳۱۵۷)۔ یہ بات مزید اطمینان کی موجب ہے کہ تازہ ترین رپورٹ کی رو سے اس سے بھی زیادہ ترقی مسلمانوں کی تعلیم میں ظاہر ہوتی ہے۔ میں گورنمنٹ مدراس (وزارت تعلیم) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے تازہ اطلاعیں ۲۶-۱۹۲۵ء کی رپورٹ کی اشاعت سے پہلے بہم پہنچا دی ہیں۔ اسلامی درس گاہوں کی تعداد اب چار ہزار چھتیس (۴۰۳۶) ہے اور اُن کے طلبا کی تعداد دو لاکھ اکیس ہزار چار سو آٹھ (۲۲۱۴۰۸) ہے اور سب قسم کی درس گاہوں کو ملا کر تعداد دو لاکھ بیالیس ہزار چھ سو اسّی (۲۴۲۶۸۰) ہوتی ہے۔ گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس (سابق مدرسۂ اعظم) میں جماعتوں کے لئے کمرے اور علم کیمیا کی تعلیم کے لئے نئی لیبوریٹری کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس میں طلبہ کی تعداد پچپن ہے جن میں چھ طالب علم اُردو اور فارسی کی تعلیم جو بی۔ اے کی جماعت میں حاصل کر رہے ہیں۔ صیغۂ آرٹ کے کالجوں میں مسلمانوں کی تعداد تین سو پچپن (۳۵۵) ہے جن میں چار لڑکیاں ہیں اور پیشوں کے کالجوں میں تہتر (۷۳) مسلمان طلبہ اور ہیں۔ یہ اضافہ گو بہت غنیمت ہے تاہم بمقابلہ ہندو صاحبان کے بعض ترقی یافتہ صوبوں کی ترقی سے کم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو جنھوں نے اس تعلیم کا آغاز نا مساعد حالات میں شروع کیا ابھی بہت سی ترقی کرنی باقی ہے۔ بیشتر اس کے کہ اپنے بہتر تعلیم یافتہ ہموطنوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو چل سکیں اسی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کی انجمن نے آل انڈیا کانفرنس کو اس مرتبہ پھر یہاں بلایا ہے۔ اور ذاتی طور پر میرے لئے یہ مقام مسرت ہے کہ ۱۹۰۱ء میں تحریک کے آغاز کے وقت بھی مجھے آپ سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ اور اب جبکہ آپ ایک نئے دور ترقی میں قدم رکھنے کو ہیں تو پھر آپ کی سوچ بچار کی رہبری میرے سپرد ہوئی۔

حضرات! آپ نے جو کچھ اب تک کیا ہے۔ مقابلۃً ابتدائی مرحلہ سمجھنا چاہئے بلکہ آپ کے صوبے کے ایک حصے یعنی مالابار میں تو گویا تعلیم اصلی معنوں میں ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔ مگر مالابار کا مسئلہ ایک مستقل جداگانہ بحث کا محتاج ہے۔ اور میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ فی الحال عام مسئلہ تعلیم پر

بحث کرتے ہوئے میں یہ جتانا چاہتا ہوں کہ کم از کم ثانوی تعلیم میں چوں کہ آپ معتدبہ ترقی کر چکے ہیں۔
آپ کو اب سب سے پہلے تعلیم کی نوعیت میں ترقی کی فکر لازم ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ
نوشت و خواند اور حساب سے معمولی واقفیت اور تھوڑی سی انگریزی جاننا حصول روزگار کے لئے اچھا
خاصہ ذریعہ ہے اور اس قدر پڑھائی سے لوگ دفتروں میں کلارک چھوٹے مدرسوں کے معلم اور مختلف
سرکاری محکموں میں ماتحت ملازموں کی حیثیت سے نوکری حاصل کر سکتے تھے۔ آپ گورنمنٹ سے استدعا
کرتے رہے ہیں کہ اُنھیں سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصّہ ملے۔ یہ دعوٰے بہت حد تک حق بجانب
ہے نہ صرف بطور ترغیب تعلیم بلکہ اس بنا پر بھی کہ ہر قوم کو حق ہے۔ کہ ملک کے انتظام میں اپنا متناسب حصّہ
لے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اگر آپ کا دعوٰے حق بجانب بھی مان لیا جائے اور گورنمنٹ آپ کو پورا وہ حصّہ
ملازمتوں میں دیدے جس کے آپ مستحق ہیں، تب بھی ہزاروں مسلمان ایسے ہوں گے جو تعلیم کا ہوں یا
دس دس سال صرف کرنے کے بعد صرف بے روزگاروں کی تعداد میں ہر سال اضافہ کریں گے۔
اور اگر آپ کے ہاں تعداد طلبہ ترقی کرتی جائے۔ جیسا کہ اغلب ہے۔ کہ ہوگا۔ اور آپ اپنی تعلیم کی نوعیت
میں کوئی ترمیم یا اصلاح نہ کریں تو تھوڑے عرصہ تک بے روزگاروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔
یہ ایک ایسا خوفناک مستقل ہے کہ کوئی ملک اس کا خیال بے فکری سے نہیں کر سکتا۔ لہذا اب ایسا وقت آگیا
ہے کہ آپ ایسی تعلیم پر قناعت نہ کریں جو رسمی نوشت و خواند اور عام واقفیت کے لئے ایک معمولی درجہ کی
تحصیل پر ختم ہو جاتی ہے بلکہ آپ کو چاہیئے کہ اپنے مدارس میں نصاب کو اس طرح بدلیں کہ طلبہ اپنی روزی
آپ کمانے کے قابل ہو جائیں۔ خواہ اُنھیں کوئی سرکاری ملازمت ملے یا نہ ملے۔ میرے اس کہنے
سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں اس امر کے حق میں نہیں ہوں کہ آپ گورنمنٹ کے دفاتر سے کافی حصّہ حاصل کریں یا
یہ آپ کا حق ہے اور آپ کو اس پر مُصر ہونا چاہیئے۔ آپ نے بارہا اپنی سیاسی مجالس میں اس امر پر زور
دیا ہے اور لازم ہے کہ آپ برابر زور دیتے رہیں جب تک آپ کو اتنا حصّہ نہ مل جائے جس کے آپ
مستحق ہیں۔ مگر اس تعلیمی منبر سے میں یہ مشورہ آپ کو دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا
ہونا چاہیئے اور اپنی اقتصادی ترقی کے لئے زیادہ تر بھروسہ اپنے آپ پر کرنا چاہیئے۔ آپ کو یہ سمجھنا چاہیئے
کہ جو شخص نوشت و خواند کے علاوہ کسی حرفت یا فن سے واقفیت رکھتا ہے وہ زندگی کی کشمکش کے لئے
بمقابلہ اُس شخص کے بہتر استعداد رکھتا ہے جو ان دونوں اوصاف میں سے صرف ایک وصف رکھتا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ گزشتہ تجربہ یہ ہے کہ جو سال مدرسے میں بسر ہوتے ہیں وہ آدمی کو کاشتکاری
کے کام کا یا دستکاری کے مطلب کا نہیں رہنے دیتے۔ مگر یہ قصور نوشت و خواند کا نہیں بلکہ اس

طریق تعلیم کا ہی جو مروج ہے۔ تاحال ہمارے مدرسے ایسی تعلیم دیتے رہے ہیں جس کا مقصد صرف قلم چلانے والے پیدا کرنا تھا۔ اور یہی ایک بڑا سبب اُس بے پروائی کا ہے جو زراعت پیشہ لوگوں کو تعلیم کے متعلق رہی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ تعلیم ہر دل عزیز ہو اور دور و نزدیک پھیلے اور اگر یہ مطلوب ہو کہ سب جماعتیں مع اُن لوگوں کے جو دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں اس سے فائدہ اٹھائیں تو لازم ہے کہ تعلیم کی نوعیت بدلی جائے اور ایسی صورت اختیار کی جائے کہ طلبہ ایسی طرز زندگی کے لئے تیار ہوں جو اُن کے گرد و پیش کے حالات کے لئے مناسب ہو۔ اگر وہ زراعت پیشہ لوگوں میں سے ہیں۔ تو انھیں لکھائی پڑھائی اور حساب کے ساتھ زراعت کی تعلیم۔ اصولی اور عملی، دونوں طرح کی دی جائے۔ اگر وہ شہری باشندے ہیں تو نوشت و خواند کے ساتھ صنعت و حرفت سے اُنھیں بہرہ ور کیا جائے۔ آج کل اُن ممالک میں بھی جو تعلیم اور دولت دونوں کے اعتبار سے ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ طریق عمل موجود ہے۔ اس لئے ہماری موجودہ حالت میں اس قسم کی اصلاح کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے۔ یورپ کے کئی ملکوں یعنی فرانس اور ڈنمارک میں نیز امریکہ میں زراعتی تعلیم کے متعلق نئے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ اور انگلستان میں دیہاتی تعلیم کے طریق میں تبدیلی سرعت کے ساتھ جاری ہے۔ صوبۂ پنجاب کی گورنمنٹ نے کچھ عرصہ ہوا اپنے محکمہ تعلیم کے دو تجربہ کار افسر یعنی مسٹر سینڈرسن صاحب اور مسٹر پارکنسن صاحب کو اس غرض سے انگلستان بھیجا تھا کہ وہاں جا کر وہاں کی دیہاتی تعلیم کے طریقے ملاحظہ کریں تاکہ پنجاب کو اُن کی حاصل کردہ اطلاع سے فائدہ ہو۔ اور تعلیم کے نئے طریقے اپنے ہاں اختیار کئے جائیں۔ مسٹر سینڈرسن صاحب جو آج کل پنجاب میں قایم مقام ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ہیں اور اُن کے فاضل رفیق کار نے انگلستان سے واپس آ کر ایک نہایت دلچسپ رپورٹ لکھی ہے۔ اور اس میں انگلستان اور پنجاب کی دیہاتی تعلیم کا مقابلہ کیا ہے۔ اُنھوں نے مہربانی سے اپنی غیر مطبوعہ رپورٹ کی ایک نقل پیشگی مجھے عنایت فرمائی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کچھ اقتباسات اُس رپورٹ میں سے آپ کے سامنے پیش کروں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ انگلستان کے اُن دیہاتی مدارس میں جنھیں ان دونوں صاحبوں نے دیکھا۔ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

حرفت و صنعت سکھانے کے تجربے ہو رہے ہیں اور طریق عمل یہ ہے کہ مدرسے کے معمولی مضامین کے ساتھ اس تعلیم کو پیوست کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مدرسے میں ہم نے دیکھا کہ دستکاری سکھانے کے مرکز میں کپڑا بننے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ جو کپڑا بنتے تھے لڑکے اُس کا نقشہ نقشہ نویسی کے وقت میں بناتے تھے۔ اور کوٹھڑی۔ ترکھان کا کام سیکھنے کے وقت میں۔ بعض دوسرے مدارس میں ہم نے

بچوں کو جلد سازی کرتے۔ ٹوکری بناتے۔ گلی برتن بناتے۔ جوتیاں بناتے اور دھات کا کام بناتے دیکھا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ دستکاری کے ساتھ باغ میں کام کرنا بھی سکھایا جاتا تھا اور لڑکے ہاتھ سے چلانے کی چھوٹی گاڑیاں۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے اور درختوں پر لگانے کے چیٹ بناتے تھے اور کہیں کہیں باغوں کی باڑھی بناتے تھے۔ کہیں لڑکے ٹیلیفون اور بجلی کی گھنٹیاں بنانے میں مصروف تھے اور کہیں گھر کے اسباب کی مرمت کا کام سیکھتے تھے۔ اور بید کی کرسیوں کی مرمت کرتے تھے سیکھانے والوں کا مقصد یہ تھا کہ اُنھیں کارآمد آدمی بنا کر مدرسے سے باہر بھیجیں۔

میرا یہ خیال ہے کہ مندرجۂ بالا فقرے کے آخری دو لفظ اس تخیل کو نہایت عمدہ پیرایہ میں پیش کرتے ہیں جو ہمیں اس ملک کے نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ہمیں لازم ہے کہ ہم انھیں کارآمد آدمی بنائیں جو مدرسے سے گھر واپس جائیں تو پہلے ماں باپ کے گھر میں کارآمد ہوں پھر جب اپنی علیحدہ زندگی شروع کریں تو اپنے گھروں کو آرام دہ اور خوبصورت بنائیں غرض ایسے آدمی ہوں جو اپنے غریبانہ مساکن میں مفید ثابت ہوں اور اس ذریعہ سے اپنے ملک کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوں۔

مسٹر سینڈرسن اور مسٹر پارکنسن اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ اسکول کے ساتھ باغ لگانے اور کھیتی باڑی کرنے کے شوق کو انگلستان میں آج کل کس قدر اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ بیان کرتے ہیں:۔

”گزشتہ جنگ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ فن باغبانی مدرسے کے مضامین میں شامل ہو گیا۔ یوں تو سنہ ۱۹۱۴ء میں بھی مدرسے کے ساتھ باغ وجود میں آگیا تھا۔ چوں کہ چند سرگرم معلم اور انسپکٹر اس خیال کے حامی تھے اور کہیں کہیں اس سے اچھے نتائج بھی پیدا ہوئے۔ مگر جو عمومیت اب ہے پہلے نہ تھی جب آب دوز کشتیوں کے ذریعہ سے جہازوں کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اور باہر سے میوے اور سبزی کی آمد بند ہوئی تو ملک کو ضرورت پڑی کہ زمین کا ہر ٹکڑا جس میں زراعت ہو سکے اس میں باغ لگایا جائے۔ بڑے تو سب جنگ میں مصروف تھے۔ اس لئے ان نئے باغوں کی خدمت بچوں کے سپرد ہوئی۔ یک دم ہزاروں باغ پیدا ہو گئے۔ اور اُن کے ننھے خادم اچھے خاصے کامیاب باغباں بن گئے جنگ کے ختم ہونے پر تعلیم کی انتظامی جماعت نے فن باغبانی کی اہمیت بہ حیثیت تعلیم کے ایک مضمون کے محسوس کی اور انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جنگ کے زمانہ میں تو لڑکے ایک غرض خاص سامنے رکھ کر باغبانی کرتے تھے اور اس سے تعلیمی مطلب نہیں نکلتا تھا اس لئے انھوں نے باغبانی کے متعلق معلم کا زاویہ نگاہ بدلنے کی کوشش کی سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۶ء کے درمیان مدرسہ کے باغ کا مقصد بہت کچھ بدل گیا۔ ابتدا میں تو باغ میوے اور سبزی پیدا کرنے کے لئے لگائے جاتے تھے۔ مگر سنہ ۱۹۲۶ء میں اکثر اچھے مدارس میں وہ دیہاتی لیبوریٹری بن گئے یعنی جو کام سائنس کی تعلیم میں لیبوریٹری سے لیا جاتا ہے جہاں طبیعات اور

علم کیمیا کے تجربے ہوتے ہیں اس طرح مدرسے کے باغ سے لڑکوں کی عقل دماغی و اخلاقی نشو و نما کا کام لیا جانے لگا۔

اس اقتباس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دیہاتی تعلیم انگلستان میں کس راستے پر چل رہی ہے۔ جو خیالات اوپر ظاہر کئے گئے ہیں وہ ہمارے لئے بالکل نئے ہیں۔ بلکہ ہمارے ملک کے بعض حصوں میں خاص کر پنجاب میں ان کا تھوڑا سا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ انگلستان میں اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ مدرسے کے ساتھ باغ ہونا چاہیئے تو ہزاروں باغ پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ہماری کوشش کہیں کہیں چھوٹے پیمانے پر تجربے کے طور پر آغاز کرنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ مجھے اپنے دوست سر تھیوڈور ماریسن صاحب کا ایک قول بہت پسند آیا۔ جب میں اُن سے انگلستان میں ملا جس زمانہ میں کہ وہ علی گڑھ کالج کے پرنسپل کے عہدے سے مستعفی ہو کر اپنے وطن کو واپس گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہندوستان میں ہمارا تعلیمی لباس اُن اُترے ہوئے کپڑوں سے بنتا ہے جنھیں انگلستان کا محکمۂ تعلیم بیکار سمجھ کر پھینک دیتا ہے یعنی جب کوئی تجربہ کامیابی کے ساتھ انگلستان میں چل رہا ہوتا ہے۔ اس وقت ہم اس کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ لیکن جب انگلستان ترقی کرتے کرتے کسی اُس سے بہتر تدبیر پر عمل شروع کرتا ہے تو ہم اُس کے پرانے طریق پر چلنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ آج کل کے زمانہ میں جب قوموں میں باہم مقابلہ ہے تو ہم کیوں کر یہ گوارا کر سکتے ہیں کہ اور قوموں کے پیچھے رہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ دوسرے ممالک کے تجربات سے فوراً مستعدی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور دیہاتی اور شہری دونوں حصص آبادی کی تعلیم کے نئے سے نئے اور ترقی یافتہ طریق استعمال کریں۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس ملک میں بیشتر مدارس محکمۂ تعلیم کے زیر اثر ہیں اور امداد کی شرائط اور تسلیم کئے جانے کے قواعد کے پابند ہونے کے باعث کوئی ایسی ترقی نہیں کر سکتے جس پر محکمۂ تعلیم اپنی مہر اجازت ثبت نہ کر دے۔ یہ درست ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انگلستان میں بھی سرکاری انسپکٹر اکثر مدارس پر نگرانی کا حق رکھتے ہیں اور وہ نگرانی مفید بھی ہوتی ہے۔ ہم یہاں بھی یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ محکمۂ تعلیم کسی مناسب اصلاح کی مخالفت نہیں کرے گا اور اگر پبلک اس قسم کی اصلاحوں کی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ضرورت کو تسلیم کر کے گورنمنٹ کی توجہ ان کی طرف مبذول کرے گی اور اپنے نائبین کی معرفت کونسلوں کے ذریعہ سے وزارتوں کو اس طرف متوجہ کرے گی تو ایسی تبدیلیاں جن کی خواہش ہے بآسانی ہو سکیں گی۔ اس کے علاوہ کسی قوم کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایسی درس گاہیں جاری کرے جو حکومت کے اثر یا امداد کے بغیر چل سکیں اور ان کے ذریعے سے

تعلیم کے جدید طریقوں کے مفید ہونے کا ثبوت دے۔

اعلیٰ تعلیم کی طرف آئیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں مسلمانوں کی حالت ثانوی تعلیم سے بھی زیادہ کمزور ہے مسلمانوں کی تعداد صیغہ آرٹس کے کالجوں میں بمقابلہ دوسری اقوام کے ان صوبوں میں بھی کم ہے جن کی نسبت یہ گمان ہے کہ وہاں وہ خاصی ترقی کر رہے ہیں۔ مثلاً پنجاب اور صوبجات متحدہ میں بحساب فی صدی وہ کالجوں میں نہ اپنی آبادی کے تناسب میں نہ ان کی تعداد دوسری قوموں کی رفتار ترقی کے مقابلہ میں کافی سمجھی جا سکتی ہے۔ عام طور پر ان کے افلاس کو اس حالت کا ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے۔ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ اور بھی اسباب اُن کے اعلیٰ تعلیم میں پیچھے رہنے کے ہوں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ناداری سب سے بڑی وجہ ہے۔ لیکن اب تو یہ ممکن نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے رہیں، اور کہیں کہ جب تک قوم کی مالی حالت بہتر نہ ہو جائے ہمیں انتظار کرنا چاہئے۔ بلکہ علمی اور عقلی ذرائع فوراً تلاش کرنے چاہئیں۔

مدت ہوئی تجربہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نادار مگر ہوشیار طلبہ کو وظائف دینا قوم کی تعلیم پورا کرنے کے لئے مفید ہے۔ خود سرکار نے تعلیم مسلمانان کے ابتدائی مراحل پر اس ذریعہ سے کام لیا چنانچہ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے جشن جوبلی کی یادگار میں مسلمانوں کے لئے مختص وظائف بنام جوبلی وظائف قائم کئے گئے تھے۔ مگر وہ ایک خاص مدت تک ملتے رہے اور اب عملی طور پر بہت شاذ کوئی ایسے وظائف ہوں گے جو مسلمانوں کے لئے مختص ہوں بعض سرکاری حلقوں میں یہ خیال موجود ہے کہ کسی ایک قوم کو خاص وظائف دینا دوسری قوموں کے افراد کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مگر مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ ہر حکومت کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ باشندگان ملک کا کوئی حصہ اگر ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے پستی میں ہو۔ اور ترقی کی چلتی گاڑی میں روڑے کی طرح اٹکتا ہو تو اس کی ترقی کے لئے کوشش کرے۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کو اس قسم کی امداد کی ضرورت ہے اور وہ گورنمنٹ مدراس کو اس طرف متوجہ کرتے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ آپ کی استدعا پر توجہ کرے گی۔ مگر آپ کو یہ یاد رہے کہ اگر گورنمنٹ آپ کے دعوے کو تسلیم کرلے۔ اور آپ کو معقول امداد مصارف تعلیم کے لئے دے دے تب بھی آپ کی اپنی کوشش کی ضرورت باقی رہے گی۔ مسلمان حاجت مند طلبہ کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑی ہے۔ اور آپ کو غیر معمولی ضرورتوں کے لئے غیر معمولی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ جب مسلمان جنوبی ہند کی تعلیمی انجمن کی بنیاد آپ لوگوں نے ڈالی اور وظائف دینے شروع کئے تو آپ نے قدم تو صحیح راستہ کی طرف اُٹھایا۔ مگر آپ تھوڑی

دور حل کر رہ گئے۔ آپ کی انجمن ہر سال کچھ وظیفے نادار طلبا کو دیتی رہی ہے۔ مگر ضروریات کے لحاظ سے ان وظائف کی تعداد بہت قلیل ہے۔ مدراس جیسے بڑے صوبے میں چند ہزار روپیہ سال مسلمانوں کے وظیفوں پر خرچ کرنا ایسا ہے جیسا کہ کسی ایسے مریض کو جس کے واسطے ڈاکٹر نے ایک اونس دوائی تجویز کی ہے۔ آپ ایک ڈرام کی مقدار میں دوائی مہیا کر دیں۔ جب ہم مرض سے بھی واقف ہیں اور اس کی دوائی سے بھی اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ دوا مفید ہے تو خلاف عقل ہے کہ ہم دوائی مقدار کے متعلق کوتاہی کریں۔ اور جتنی درکار ہے وہ مہیا نہ کریں خواہ کتنا ہی خرچ کیوں نہ ہو۔ جو روپیہ تعلیمی کاموں میں صرف ہوتا ہے وہ بے کار نہیں ہوتا اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کی تحریک روپیہ جمع کرنے کے لئے باضابطہ اور مسلسل طور پر مصروف کار رہے۔ تو آپ کو زیادہ خاطر خواہ امداد مسلمانوں سے ملے۔ اور یہ جو کچھ آج تک آپ کر سکے ہیں اس سے زیادہ کام ہو۔ مسلمان طلبہ کے لئے امداد صرف صیغہ آرٹس کے کالجوں ہی میں درکار نہیں۔ بلکہ مفید پیشوں ڈاکٹری اور انجنیری میں امداد کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ ان فنون کے جاننے والے نری علمی تعلیم سے زیادہ آمدنی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے ملک اور قوم کے لئے زیادہ کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ان فنون کے حاصل کرنے پر محض علمی تحصیل سے زیادہ صرف آتا ہے۔ لیکن جو فوائد ان سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کے لحاظ سے وہ صرف برداشت کرنے کے قابل ہے اور جہاں کوئی ہونہار طالب علم اپنے مصارف خود نہ ادا کر سکے تو اس کی قوم پر واجب ہے کہ وہ اس کی مدد کرے۔ ہر صوبہ میں ایک سرمایہ ایسا ہونا چاہیے جس سے لائق طلبا کو بیرونی ممالک میں ایسے مضامین کی تحصیل کے لئے بھیجا جائے جن کے لئے سائنس کی معلومات یا صنعتی کاریگری درکار ہیں۔ کیوں کہ ان چیزوں کے بغیر کسی قوم یا ملک کے لئے اس زمانہ میں جدید ترقی کی رفتار کے ساتھ ہم قدم رہنا ممکن نہیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ تعلیم اور مکمل تربیت پائے ہوئے نوجوان کثرت سے موجود ہوں تو ہماری ترقی کی رفتار کس قدر تیز ہو سکتی ہے۔ جاپان کے حالات سے آپ سب واقف ہیں کہ کیوں کر نصف صدی سے کم عرصہ میں وہ ملک کہاں سے کہاں پہونچ گیا ہے۔ یہ اس کے ہمت ور باشندوں کی فداکاری کا نتیجہ ہے۔ ان کی کثیر تعداد دریا ستہائے متحدہ امریکہ اور دیگر ممالک غیر میں پھیل گئی اور اُن کے ہاں جو کچھ سیکھا جا سکتا تھا سیکھ کر وہ اپنے وطن میں آئے اور جاپان کی زندگی پر ثروت اور پُر طاقت بنا دی۔ اس محنت کا ثمر یہ ملا کہ اب وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ اُن کا وطن ایشیا کے ایک دور افتادہ گوشے کی ایک معمولی طاقت کے درجے سے ابھر کر دنیا کی سب سے طاقتور اور ترقی یافتہ قوموں کی صف اول میں موجود ہے۔

وظائف کے سرمائے کا ذکر کرتے ہوئے خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ اگر بعض وسائل کا بھی ذکر کیا جائے جن سے سرمایہ بہم ہو سکتا ہے۔ آپ کی انجمن نے اس قسم کی دیگر مجالس کی طرح یہ قاعدہ تو اچھا نکالا تھا کہ جو غریب طلبہ آپ سے امداد لیں۔ وہ رقم امداد کو اپنے ذمّے قرضِ حسنہ سمجھیں اور جب خود برسرکار ہو جائیں اور پچاس روپئے ماہوار یا اس سے زیادہ کمانے لگیں تو قسطوں سے قرضِ حسنہ ادا کریں تاکہ اس سے ان غریب بھائیوں کو امداد مل سکے۔ جو اسی تکلیف میں مبتلا ہیں جس میں وہ خود ایک زمانے میں تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ آپ سے وظائف پانے کے بعد ملازمت میں داخل ہو چکے ہیں۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے۔ ان میں سے بعض تو اپنا قرضِ حسنہ باقساط ادا کر رہے ہیں۔ مگر بعض ابھی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ میں اُن سب صاحبان سے جو اپنے اس بوجھ سے سبکدوش نہیں ہوئے پُر زور درخواست کرتا ہوں کہ انھیں خواہ اپنی ضروریات کم کرنی پڑیں۔ وہ اپنے غریب بھائیوں سے ہمدردی کریں۔ کیوں کہ وہ سب سے زیادہ اس درد کو محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک طالب علم پڑھنے کا خواہشمند ہو مگر ناداری کی وجہ سے پڑھ نہ سکے۔

ایک اور ذریعہ جس سے آپ کی انجمن اپنی آمد میں کچھ اضافہ کر سکتی ہے۔ وہ ممبروں کی تعداد کا بڑھانا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کے ممبروں کی تعداد کچھ عرصہ پہلے پانچ سو ساٹھ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ اس تعداد میں ترقی معکوس ہوئی اور اب اس کے نصف کے قریب ممبر اس لئے کم ہو گئے ہیں کہ انھوں نے سالانہ چندہ کی قلیل رقم دیر سے ادا نہیں کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم میں یہ نقص ہے کہ جو فرائض اپنے ذمّہ لیں اُن کو مسلسل ادا نہیں کرتے۔ بالکل ممکن ہے کہ ہمارے افراد میں مسلسل سرگرمی نہ ہونے کے سبب سے یہ کوتاہی ہوئی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمارے محصّل جن کے ذمّے چندہ وصول کرنے کا کام تھا کچھ وقت کے لئے سو گئے ہوں اور اس طرح بقایا بہت سا جمع ہو گیا ہو۔ دونوں میں سے خواہ کوئی سبب ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہماری حالت ایسی نہیں کہ ہم اس پر صابر رہیں۔ لازم ہے کہ ہمارا ہر رکن جس کا نام اب زیبِ فہرست ہے آج ہی فوراً یہ کوشش شروع کرے کہ اس مفید انجمن کے لئے اپنے دوستوں میں سے ممبر بنائے تاکہ اتنا تو ہو جائے کہ ہم اس سال کے اجلاس سے منتشر ہونے سے قبل کچھ نہیں تو ایک ہزار کی تعداد تو اس تعلیمی انجمن کے ارکان کی دیکھ لیں۔ اب چاہے یہ حضرات نئے ممبر ہوں یا اُن میں وہ پُرانے بھی دوبارہ شامل ہو جائیں جو چندہ ادا نہ کرنے کے سبب باہر نکل گئے تھے۔ اس طرح نہ صرف کارکن اصحاب کی تعداد میں معقول اضافہ ہو جائے گا بلکہ اتنے آدمیوں کی دلچسپی آپ کے مقصد کے ساتھ پیدا ہونے سے آپ بہت سا روپیہ

جمع کر سکیں گے اور بہت سے وظائف دے سکیں گے۔

کچھ عرصہ ہوا ہمارے دوست آنریبل مسٹر ہارون جعفر صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ نے ایک بہت مفید تجویز پیش کی تھی جس کے عمل میں آنے سے ہمارے تعلیمی سرمایے میں بہت تقویت آسکتی ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ امپیریل بنک آف انڈیا اور اس کی شاخوں میں جہاں کہیں ایسے مسلمانوں کی رقوم بمد امانت جمع ہوں جن پر وہ اپنے مذہبی اعتقادات کی وجہ سے سود نہیں لیتے تو جو رقم اس سود کی وہیں بنک میں جمع رہتی ہے اور بنک جن اغراض کے لئے چاہے اسے صرف کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی جماعتوں اور درس گاہوں کو دے دی جائے تاکہ اس سے مسلمانوں میں تعلیم بڑھے۔ ملک کی مختلف انجمنیں اس مطالبہ کی تائید کر رہی ہیں۔ ہماری کانفرنس اور آپ کی انجمن کو بھی چاہیئے کہ ممکن کوششیں اس کی تائید کے لئے کریں۔ میرے خیال میں اگر کافی اصرار ہندوستان کے مختلف حصّوں سے اس استدعا کے متعلق کیا گیا تو گورنمنٹ اس معقول تجویز کو منظور کرے گی۔ گورنمنٹ کو ایک دو شکوک اس تجویز کے بارہ میں ہیں۔ مگر مسلمانان ہند کو چاہیئے کہ وہ ان شکوک کو رفع کر دیں۔ اور گورنمنٹ کو اطمینان دلا دیں کہ مشکلات کچھ ایسی سخت نہیں ہیں گورنمنٹ کو ایک اندیشہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان جو مذہبی خیال سے خود سود لینا پسند نہیں کرتے۔ شاید اس بات کو بھی پسند نہ کریں کہ اسلامی خیراتی کام اس سود سے متمتع ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس انتہائی درجے تک جائیں۔ مگر اغلب ہے کہ بیشتر حصّہ ان اصحاب کا یہ تسلیم کرے گا کہ جب انھیں موجودہ صورت میں سود کی رقم سے کچھ سروکار نہیں رہتا اور وہ بنک سے نہیں پوچھتے کہ وہ کس مصارف میں لاتا ہے تو انھیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ بنک اُن کی وہ رد کردہ رقم اُن کے غریب مسلمان بھائیوں کی مدد کے لئے اسلامی انجمنوں اور تعلیمی کاموں کے حوالے کر دے جو قلت سرمایہ کی وجہ سے مبتلائے فاقہ کشی ہیں۔ اگر آپ کی انجمنیں پوری طرح کوشش کریں اور اُن صاحبوں سے ملیں جن کی نسبت معلوم ہو کہ اُن کی رقوم بنک میں بلا سود رکھی ہوئی ہیں تو عجب نہیں کہ بہت سے لوگ تحریر دیدیں یا دستخط کر دیں کہ انھیں کچھ اعتراض نہیں۔ اگر رقوم سود تعلیمی انجمنوں کو مل جائیں۔ ایک اور احتمال جو گورنمنٹ کو ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہو کہ انجمنیں روپیہ ملنے کی امید سے ایسی سرگرمی دکھلائیں کہ ان مسلمانوں کے پاس بھی پہنچیں جو اپنی جمع شدہ رقوم پر بنک سے سود لیتے ہیں اور اُن پر دباؤ ڈالیں کہ تم بھی سود کی رقم انجمنوں کو دیدو اور اس کا یہ نتیجہ ہو کہ وہ لوگ بنک میں روپیہ رکھنا بند کر دیں اس خیال سے کہ سود کی رقم سے وہ اس دباؤ کے سبب محروم ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں ایسی بات کا کوئی واقعی خطرہ نہیں۔ اول تو مانگنے والے

ایسے نامعقول نہیں ہوں گے کہ ان لوگوں سے جو بنکوں سے سود نخود لے رہے ہیں یہ کہیں کہ سود کی رقم ہمیں دے ڈالو اور اگر کوئی ان سے کہے بھی تو وہ ماننے کیوں لگے ہیں۔ پس سرکار کو یہ خطرہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ایسی رقوم کے بنک میں آنے میں کمی آجائے گی۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ جنوبی ہند کی انجمن تعلیمی نے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے اور امید ہے کہ وہ باقاعدہ کوشش کرے گی کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی رائے کو اس معاملہ کے متعلق ایک مرکز پر لائے اور پھر گورنمنٹ تک مسلمانوں کی مجموعی رائے پہنچائے۔ یہ سن کر آپ خوش ہوں گے کہ شمالی ہند میں لاہور کی مشہور انجمن "حمایت اسلام" بھی اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔

اس بارہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ سرمایہ کیوں کر فراہم کیا جائے صرف یہ تاکید کافی ہے کہ قوم اگر چاہتی ہے کہ دماغی ترقی کے اعتبار سے وہ درجہ حاصل ہو جس کے بغیر اس کے لئے اپنی وہ اہمیت قایم رکھنی دشوار ہے جو اس وقت تک اُسے حاصل ہے تو اسے تیار رہنا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ پر تعلیمی اغراض کے لئے بھاری ٹیکس لگائے۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے بہت مختصر طور پر فیس کی رعایت کے مسئلے کا ذکر ضروری ہے۔ ابتدا میں جو ذرائع مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لئے اختیار کئے گئے۔ ان میں فیسوں کی معافی یا نصف شرح فیس بھی تھی۔ اور یہ طریقہ صوبہ مدراس میں بھی ایک عرصہ تک مروج رہا۔ مگر اب عملاً بند ہو گیا ہے گو خاص صورتوں میں اور غریبی کی سند پیش کرنے پر بعض لوگوں کو اب بھی نصف فیس پر پڑھایا جاتا ہے۔ آپ کی انجمن یہ مطالبہ کرتی رہی ہے کہ ایسی سند کا پیش کرنا خودداری کے خلاف ہے۔ اور سند کا پیش کرنا موقوف کیا جائے اور رعایت جو پہلے دی جاتی تھی جاری رکھی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ رعایت کی ضرورت تاحال باقی ہے اور خرچ جو اس ضرورت کے جاری رکھنے پر ہوتا ہے اتنا زیادہ نہیں کہ گورنمنٹ کے لئے آپ کی اس درخواست پر عمل کرنا کچھ مشکل ہو۔ اس لئے امید ہے کہ وہ اس پر ہمدردانہ توجہ کرے گی۔ لیکن میں آپ سے یہ کہوں گا کہ خواہ گورنمنٹ آپ کی بات منظور کرے یا نہ کرے۔ آپ کو اس بات کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ فیس کی رعایت میں رکاوٹ ہونے سے جو نقصان ہوا ہو اس کی تلافی خود فیس کی رعایت کے لئے سرمایہ بہم پہنچا کر کردیں یا چھوٹے چھوٹے وظائف ایسے دیں جن سے طلبہ فیس ادا کر سکیں۔

تاحال ہم نو عمر لڑکوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے رہے ہیں۔ اور اب بالغوں کی تعلیم کا کچھ ذکر ضروری ہے۔ جب سے آئینی اصلاحات شروع ہوئی ہیں اور قانونی کونسلوں میں توسیع ہوئی ہے۔ بالغوں کی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ انتخابات کے موقع پر دانشمندانہ شرکت یا جو طرح طرح کے

سیاسی مسئلے اُس وقت پیش ہوتے ہیں اُن کے سمجھنے کی قدرت ممکن نہیں تاوقتیکہ عوام اتنے پڑھے لکھے نہ ہوں۔ کہ کم از کم اخبارات کے ذریعہ سے واقعاتِ عالم کے میلان کو سمجھ سکیں۔ علاوہ بریں وہ بالغ عمر کے لوگ جو پڑھ جاتے ہیں وہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں بھی لکھنے پڑھنے کو مفید پاتے ہیں اس لئے ہندوستان کے مختلف حصوں میں بجا طور پر بلغا کی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے اور یہ مقام مسرت ہے کہ ہمارے صوبہ پنجاب نے اس بارے میں بہت سرگرمی سے سعی کی ہے۔ پنجاب کی سال رواں کی تعلیمی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو پنجاب میں تین ہزار دو سو ساٹھ (۳۲۶۰) مدرسے بلغا کے لئے تھے جن میں پچاس ہزار چار سو بائیس (۵۰۴۲۲) طلبہ تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مدراس پریسیڈنسی میں اس بارے میں پنجاب سے زیادہ کام ہو رہا ہے یا کم۔ مگر مسلمانوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی ہند کی تعلیمی انجمن کی رپورٹ سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ اس پر کوئی خاص زور دیا جا رہا ہے اور ان لوگوں کو جنھیں اوائل عمر میں لکھنے پڑھنے کی تحصیل کا موقع نہیں ملا اب اس سے مستفید کیا جائے۔ میری رائے ہیں آپ کو اس تعلیم کی ہمسایہ قوموں سے زیادہ ضرورت ہے۔ اور میں آپ کو اس طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہوں۔ آپ کے مدرسوں میں جو معلم ہیں انھیں چاہیئے کہ تعلیم کی اس شاخ کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کے کامیاب بنانے کے بہترین طریقے سوچیں۔ پنجاب میں جن ماہرانِ فن نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے۔ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ " بالغ عمر کے آدمیوں کو پڑھانے کے طریقوں میں نوعمر لڑکوں کی تعلیم کے طریقوں کی محض نقل نہیں ہونی چاہیئے بلکہ جہاں تک ہو سکے بالغوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ جن چیزوں سے انھیں دلچسپی ہو۔ اور جو اُن کے کام آنے والی ہوں اُن کے ذریعہ سے ان کو تعلیم دی جائے اور ہر ایک کو موقع دیا جانا چاہیئے کہ اپنے میلانِ طبع کے موافق اور اپنی پسند کی رفتار سے ترقی کرے گویا ہر فرد کے لئے حتی الوسع ایسی تعلیم ہونی چاہیئے جو اُس کے لئے موزوں ہو اور اُستاد کا کام زیادہ تر شاگرد کی طبیعت میں شوق پیدا کرنا اور رہنمائی کرنا ہونا چاہیئے۔

لڑکوں اور بالغ آدمیوں کی تعلیم کی بابت اس قدر باتیں بیان ہو چکی ہیں۔ اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مختصر سا ذکر تعلیمِ نسواں کا بھی کیا جائے۔ یعنی اس قدر جس سے یہ نہ مفہوم ہو کہ میں اپنے دوست آنریبل جسٹس سید سلیمان صاحب کے احاطۂ تقریر میں مداخلت کر رہا ہوں۔ کیوں کہ تعلیم نسواں کے شعبہ کانفرنس کی صدارت اُن کے حصہ میں آئی ہے۔ اگر یہ خیال مانع نہ ہوتا تو یہ مضمون تو ایسا اہم ہے کہ میں اس پر بہت کچھ کہتا۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی قوم اپنے پورے اوجِ ترقی تک نہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کی آبادی کا حصۂ نسواں ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ حاصل نہ کرے۔ ہندوستان میں

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے گزشتہ سالوں میں بہت کچھ غفلت کی گئی ہے۔ خاص کر مسلمانوں میں۔ مگر پچھلے دس سالوں میں پہلے سے کچھ زیادہ توجہ ادھر ہوئی ہے۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں لڑکیوں نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم میں اور سائنس دانی والے پیشیوں میں بھی مردوں کے برابر قابلیت دکھا سکتی ہیں مگر پایاں ہمہ اُن کی تعلیم کو نہ گورنمنٹ سے نہ پبلک سے اس قدر امداد ملتی ہے جتنی لڑکوں کی تعلیم کو حاصل ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ تعلیم کی نوعیت اور مقدار دونوں کی ترقی کے مسئلہ کا مکمل جائزہ لیا جائے آپ لوگوں نے کانفرنس کا ایک جداگانہ شعبہ تعلیم نسواں کے لئے قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ اس تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اب یہ اس شعبے کے صاحب صدر کا کام ہوگا کہ وہ اس کی اشد ضرورت کا یقین بھی آپ کو دلائیں اور اُن طریقوں کی بھی تفصیل بیان کریں جن کے مطابق اس تعلیم کی ترقی ہونی چاہیئے مگر کسی دوسرے حصۂ مضمون کی طرف جانے سے پہلے میں ایک دو باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہیں کہ سیاسی اصلاحات نے عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک بڑا تغیر پیدا کیا ہے اور اب انھیں ہندوستان قانونی مجالس کے انتخاب کے لئے رائے دینے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ حق جو انھیں دیا گیا ہے کام میں لایا جائے اور وہ اپنے ملک کے مشوروں میں مناسب حصہ لیں تو آپ کو چاہیئے کہ تعلیم نسواں کے متعلق پُر زور تدبیریں اختیار کریں۔ اور جو خرچ اب تک اس کے لئے آپ کرتے رہے ہیں اس سے بہت زیادہ خرچ برداشت کریں۔

اب میں ایک ایسے صیغۂ تعلیم کی طرف آتا ہوں جسے مسلمان ہمیشہ خاص طور پر اہم سمجھتے رہے ہیں اور وہ مذہبی تعلیم ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی وجہ جس کے سبب سے ابتدا میں مسلمان جدید تعلیم سے الگ رہے۔ یہ تھی کہ اُس میں مذہب کا جزو شامل نہ تھا۔ آخر جب اُنھوں نے اپنے لڑکے لڑکیوں کو سرکاری مدرسوں میں بھیجنا شروع کیا۔ تو وہ یہ چاہتے تھے کہ انھیں اپنے بچوں کو اوقات مدرسہ کے بعد مذہبی تعلیم دینے کی اجازت دی جائے کہیں کہیں یہ اجازت مل جاتی تھی اور کہیں اس بنا پر انکار کر دیا جاتا تھا۔ کہ اس میں آسانی نہیں اس لئے وہ اس انتظام سے مطمئن نہ تھے پھر مسلمانوں نے قومی درس گاہوں کی بنیاد ڈالی۔ جہاں وہ مدرسہ کے وقتوں میں مذہبی تعلیم دے سکیں۔ یہ خیال بہت معقول ہوا اور اس کی بدولت کئی کامیاب اسلامی درس گاہیں ملک میں پیدا ہوگئیں۔ سب سے پہلے علی گڑھ میں ایک کامیاب مسلم کالج بنا جو اب مسلم یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد لاہور کا اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ جو اب خاصہ بڑا کالج ہے اور اُس میں سات سو کے قریب طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور ایک اور بڑی درس گاہ ہے جس نے تھوڑے عرصہ میں بہت سی ترقی کی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں شیعہ مسلمانوں کے

فائدہ کے لئے ایک کالج قایم ہوا جو اچھی طرح چل رہا ہے۔ اس کے سوا اور بھی کالج ہیں۔ اور ثانوی تعلیم کے بہت سے اچھے اچھے مدرسے ہیں جو ملک کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کو تعلیم دیتے ہیں اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر میں اس قسم کی تمام درس گاہوں کے متعلق دو پہلوؤں سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ آیا انھوں نے اپنی ہستی کے مفید ہونے کا ثبوت دیا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ آیا وہ اُس مقصد کو پورا کر رہی ہیں یا نہیں جس کے لئے ان کی بنا ڈالی گئی تھی۔

میری رائے میں ان درس گاہوں نے اپنے طریق پر بہت مفید کام کیا ہے۔ انھوں نے پہلے اُس ابتدائی تعصب کو دور کیا جو مسلمانوں میں جدید دنیوی تعلیم اور اُس کے میلانِ مادّہ پرستی کے متعلق تھا۔ اگر یہ کالج نہ ہوتے تو ہم میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جو موجود ہے نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک اور کام جو مذہبی اور دنیوی تعلیم کو ملانے کے بعد ان درس گاہوں نے انجام دیا ہے یہ ہے کہ بہت سے ایسے طلبہ جنھیں سرکاری کالجوں میں جگہ نہیں ملتی ان کے زیر سایہ پناہ لیتے ہیں۔

پس اس میں تو شک نہیں کہ انھوں نے اپنے وجود کو کارآمد ثابت کیا ہے لیکن ان پر اور اسی قسم کی دوسری درس گاہوں پر جو ہندوؤں نے جاری کی ہیں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے وہ خلیج جو ان دو بڑی قوموں کے درمیان حائل ہے اور بڑی ہو گئی ہے۔ میں نے بعض ہندوستانی سیاست دانوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر قومی اتحاد قایم کرنا چاہو تو سب ایسی درس گاہوں کو بند کر دو۔ مگر میں اس رائے سے متفق نہیں۔ اس وقت اس بات کا محل نہیں کہ ان مختلف اسباب سے بحث کی جائے جو ہندو مسلمانوں کے موجودہ اختلافات کا باعث ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہ قومی درس گاہیں اگر سب کی سب کل بند کر دی جائیں تو اختلافات پھر بھی باقی رہیں گے۔ اگر کوئی درس گاہیں ایسی ہیں جن میں تعصب اور تنگ خیالی کی تعلیم دی جاتی ہے تو یقیناً وہ اُن طالب علموں پر جو اُن میں تعلیم پاتے ہیں مضر اثر کریں گی مگر مسلمانوں کے کالجوں میں عموماً رواداری اور باہمی ہمدردی پر زور دیا جاتا ہے۔ اُن کے دروازے اصولاً اور عملاً ہندو طالب علموں اور ہندو اُستادوں کے لئے کھلے رہے ہیں۔ اور تلخی آمیز جذبات سے مبرّا رہے ہیں۔ اگر ان اصولوں پر قومی کالج چلائے جائیں تو اُن سے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں۔
بہر حال سرِ دست اُن کی اس قدر مانگ ہے کہ اصلی سوال جو قابل غور ہے۔ وہ ان کے وجود سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ ہے کہ آیا وہ اپنی ہستی کا مقصد پورا کر رہے ہیں یا نہیں جو چیز عموماً مذہبی تعلیم کے نام سے نامزد کی جاتی ہے وہ اس نام کی مستحق نہیں کسی مذہبی کتاب کا سبق دن میں ایک گھنٹے کے لئے پڑھا دینا مذہبی تعلیم نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی اس کو مذہبی تعلیم کہتے ہیں کہ کبھی کبھی اس قاعدے پر مجبوری عمل

کرایا جائے کہ طالب علم کالج کی مسجد میں جا کر نماز ادا کریں۔ علی گڑھ کالج کے کسی ایسے ہی قاعدے کی طرف مرحوم اکبر الٰہ آبادی نے مندرجہ ذیل شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کس قدر سچی حقیقت ہے۔ جو ان چند لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس تعلیم کا ہماری قومی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم نام رکھا جاتا ہے۔ وہ صرف ایک طفل تسلی ہے جس سے ایک طرف لڑکوں کے ماں باپ اپنی ضمیر کو بہلاتے ہیں کہ ہم بچوں کو مذہبی تعلیم دینے سے سبک دوش ہو گئے اور دوسری طرف کالجوں اور مدرسوں کے منتظم یہ سوچتے ہیں کہ اس طرح بہت سے لڑکے ہمارے ہاں کھنچ آئیں گے جنہیں ان کے والدین اس تعلیم کے بغیر مدرسوں میں نہ بھیجتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان درس گاہوں میں کوئی خاص کوشش ذاتی مثال کے اثر سے لڑکوں کے مذہب کے سنوارنے کی نہیں کی گئی جس سے کہ صحیح مذہبی تخیل اُن کے اندر پیدا ہوتا۔ اور مذہب اُن کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کرتا کہ اُن کی روزمرہ زندگی کے تار و پود کا جزو بن جاتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو ہمارے کالجوں کی کایا پلٹ ہو جاتی۔ نہ صرف مسلمان کالجوں سے بہتر مسلمان اور ہندو کالجوں سے بہتر ہندو پیدا ہوتے۔ بلکہ ملک ہند کے بہتر شہری ہر ایسے کالج سے نکلتے۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے ہمسایہ کو اُس کے حق سے محروم کرنا گناہ سمجھتے اور بلا تفریق مذہب اپنے ہمسائے کی خدمت کرنا کارِ ثواب جانتے۔ ہماری مذہبی تعلیم مفید نتائج سے اس لئے خالی رہی ہے کہ رسمی طور پر مذہبی پڑھائی کے باوجود نقطۂ نگاہ دراصل دنیاوی رہا ہے اور کیا معلّم اور کیا متعلم صرف اس بات کے قائل رہے ہیں کہ ظاہری طور پر قواعد مذہبی کی پابندی کی جائے اور مذہب کو موقع نہیں دیا گیا کہ وہ نوجوانوں کے دلوں میں گھر کرے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لفظ مذہب سے درگزر کر کے روحِ مذہب کی طرف توجہ کی جائے۔ اور اس غلط احساس غرور مذہبی کی جگہ جو اب پیدا کیا جاتا ہے شوق خدمت دلوں میں پیدا کیا جائے تب ہم مذہبی تعلیم سے وہ فوائد پوری طرح حاصل کر سکیں گے۔ جو اس کے اصلی مقصود ہیں۔

مذہبی تعلیم سے ملتا جلتا ایک مضمون جس سے مسلمانوں کو خاص دلچسپی ہے۔ وہ ایشیائی زبانوں میں عربی فارسی اور ہندوستانی زبان کی تعلیم ہے۔ آپ قدرتی طور پر عربی کی تعلیم کو پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ آپ کی مقدس مذہبی کتاب اس زبان مبارک میں نازل ہوئی۔ فارسی کا آپ کو شوق ہے کیونکہ اس میں بھی آپ کی اکثر مذہبی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور اس کی نظم اور شاعری نہایت شیریں اور پُر ترنم ہے۔ ان دو

زبانوں میں ایک اور نفع ہی کہ یہ ہمارے بعض ہمسایہ ممالک میں اس وقت بولی جاتی ہیں۔ اور اُن ملکوں سے ہماری آمد و رفت اب بھی ہے اور آئندہ باہمی تجارتی تعلقات زیادہ ہونے کا امکان ہی اس لئے آپ اسلامی درس گاہوں میں تو ان کی تعلیم پر خاص زور دیتے ہیں اور آپ کی یہ بھی خواہش ہی کہ سرکاری مدارس میں بھی ان کے پڑھانے کا مناسب انتظام ہو۔ چنانچہ اندھارا یونیورسٹی کے متعلق جو حال میں قایم ہوئی۔ آپ کو بڑی شکایت یہی تھی کہ اس میں مشرقی علوم کی ان شاخوں کی پڑھائی کا کچھ انتظام نہ تھا۔ ہم یہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ جنوبی ہند میں ہمارے ہند و ہم وطن ان زبانوں سے کیوں بے پروا ہیں۔ اُن کے ہاں اول تو دیسی زبانیں کئی ہیں اس پر ان کو قدرتی طور پر شوق ہی کہ وہ زبانِ سنسکرت کی تحصیل کریں جس میں قدیم ہندوستان کے ادب و فلسفہ کے بہترین خزائن موجود ہیں اس سبب سے اُنھیں فارسی عربی کے لئے وقت مشکل سے مل سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس مسئلے کو زیادہ وسیع اور عالمانہ نگاہ سے دیکھیں تو انھیں ماننا پڑے گا کہ مشرقی ممالک میں کوئی یونیورسٹی ان دو اعلیٰ تربیت دینے والی زبانوں سے مستغنی رہ کر یونیورسٹی کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ جب کہ مغربی دنیا میں فرانس انگلستان اور جرمنی کی یونیورسٹیاں ان کی تعلیم کے لئے وقت نکالتی ہیں۔ اب رہی ہندوستانی زبان جسے عموماً اردو کہتے ہیں اس کی پڑھائی کی جتنی تاکید کی جائے۔ کم ہے۔ شمالی ہند میں اور جنوبی ہند کے کئی حصوں میں یہ فی الحقیقت جمہوری زبان ہی۔ اور سب زبانوں سے زیادہ استعمال ہوتی ہے اس کا علم ادب روبہ ترقی ہے اور اس کی تربیت آموز خوبیاں ہندوستان کی کسی دوسری زبان سے کم نہیں۔ چوں کہ اردو عموماً فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمان ہر حصۂ ملک میں اس کو اپنے نوعمر اور بالغ عمر طلبہ کی تعلیم کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اسی لئے آپ بھی ساعی رہے ہیں کہ جنوبی ہند کی درس گاہوں میں اور خاص کر مسلمانوں کے مدرسوں میں یہ رواج پا جائے۔ اگر اُردو کے مفید ہونے میں کوئی گنجائش شبہ کی تھی بھی تو اس عظیم الشان اور کامیاب تجربے نے جو آپ کے قریب ہی اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے علاقہ میں کیا گیا ہے۔ ان شکوک کو رفع کر دیا ہی۔ اُنھوں نے اپنی دوربینی اور فیاضی سے عثمانیہ یونیورسٹی قایم کی ہی۔ جو سب سے پہلی درس گاہ ہے جس میں ہندی قومیت کا سچا تخیل پیش کیا گیا ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم او رسائنس وغیرہ کی تعلیم ایک دیسی زبان کے ذریعہ سے دینی شروع کی ہے اور یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ جو کامیابی عثمانیہ یونیورسٹی کو حاصل ہو رہی ہی اس سے ہندوستان بھر میں اردو کی ترویج میں ترقی ہوگی۔ اور دوسری یونیورسٹیاں اور آپ کی یونیورسٹیاں اس احاطۂ مدراس میں اردو کو تسلیم کرنے میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں گی۔ اس مضمون پر مفصل بحث کانفرنس کے شعبۂ اُردو میں ہوگی جس کی صدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی جیسے ممتاز عالم

حصہ میں آئی ہے۔ اس لئے مجھے اس پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

ہماری تعلیمی ضروریات کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اگر تربیت جسمانی کا ذکر نہ کیا جائے گو مدت سے یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ صحتِ دماغی اور صحت جسمانی عموماً ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور اگر کسی کا دماغ اعلیٰ ہو۔ مگر جسمانی قوےٰ کمزور ہوں تو اس کے کام ادھورے رہتے ہیں اور جو کچھ کام اس دماغ سے وہ لے سکتا تھا اس کا بہت سا حصہ ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ تاہم اس واقعہ سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اب سے تھوڑا عرصہ پہلے جسمانی تربیت کو تعلیم کا ضروری جزو نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں طالب علموں کے اس گروہ میں سے ہوں جنھوں نے ایسے وقت تعلیم پائی جب ورزش جسمانی پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا۔ جتنا کہ اب دیا جاتا ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس لطف زندگی سے جو جسمانی قوےٰ کی مکمل ترقی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ محروم رہا اور بہت سی باتیں مجھے حاصل نہیں ہوئیں جو حاصل ہوتیں۔ اگر ورزش جسمانی کے متعلق وہ سرگرمی ہمارے زمانے میں موجود ہوتی جو اب ہر اچھے مدرسے میں نظر آتی ہے۔ پہلے بھی ورزش اور کھیل کی تعریف کی جاتی تھی مگر ہر شخص جانتا تھا کہ یہ صرف اعلیٰ الصحت ہے اور اس وقت یہ میلان تھا کہ جو طالب علم کتاب کے شائق تھے وہ کتاب چھوڑ کر کھیل کے میدان میں نہیں جاتے تھے اُن دنوں پڑھنے کے شوقین اور کھیلنے کے شوقین گویا دو جُدا فریق تھے۔ مگر اب خیالات بالکل بدل گئے ہیں اور بجا طور پر بدلے ہیں اور دونوں باتیں جمع کرنے کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ اب نرا کتابی کیڑا زیادہ نفع نہیں پاتا۔ اگر امتحانوں میں کچھ نمبر زیادہ پالے تو بھی جب کسی ملازمت کے لئے کسی انتخاب کنندہ کمیٹی یا پبلک سروس کمیشن جیسی جماعت کے روبرو پیش ہوتا ہے تو ایسے طالب علم کے مقابلہ میں جو پڑھائی میں اس کے برابر اور جسمانی نشوونما میں اس سے بہتر ہوتا ہے۔ ترجیح نہیں پا سکتا۔ اگر کسی کے متعلق یہ معلوم ہو کہ جب وہ مدرسے میں تھا تو ورزشی آدمی تھا یا کرکٹ فٹ بال۔ ہاکی وغیرہ میں کپتان تھا تو ان صفات کے اُسے علیحدہ نمبر ملتے ہیں۔ یہی نہیں کہ ایسے آدمی کو ملازمت پانے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ جب وہ زندگی کے عملی پہلو سے بھی جانچا جاتا ہے تو دوسروں سے اچھا رہتا ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ تعلیم جدید کے اس مسلم اصول کی طرف اپنے مدارس میں کافی توجہ رکھیں گے خواہ وہ مدرسے لڑکوں کے لئے ہوں خواہ لڑکیوں کے لئے۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر میں کچھ ذکر دو مفید تحریکوں کا کرنا چاہتا ہوں جن میں بوائے اسکاوٹ اور گرل گائڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تحریکیں چند سال ہوئے پیدا ہوئیں۔ مگر جس سرعت کے ساتھ وہ دنیا بھر میں پھیلی ہیں وہی ان کے حق میں ایک اچھی گواہی ہے۔ جن لوگوں نے دیکھا ہے کہ جو لڑکے اسکاوٹ بنتے ہیں اُن کے خیالات میں کس قدر مفید تبدیلی ہو جاتی ہے۔ وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ طرز تربیت

اُن لڑکوں کو مردانہ باتیں سکھاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے دوستی کرنا فرقہ بندی کے اختلافات کو نظرانداز کرنا اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنا سیکھتے ہیں بعض قسم کی سختیاں جھیلنا بھی انہیں سکھایا جاتا ہے۔ اور ضرورت کے وقت اپنا کھانا خود پکانا اور اپنی ضروریات کے لئے خود انتظام کرنا بھی سیکھ جاتے ہیں۔ اس لئے یہ طریق تربیت گویا ایک موثر ذریعۂ تعلیم ہے۔ خاص کر اگر تعلیم سے یہ مُراد لی جائے کہ جو چیز ان ممکنات کو ظہور میں لائے جو انسان کے اندر پوشیدہ ہیں پس آپ کو اپنی تعلیم گاہوں میں اس تحریک سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

حضرات! میں اب زیادہ آپ کی صبر آزمائی نہیں کرنا چاہتا اور اپنے اس خطبہ کو جلد ختم کرنا چاہتا ہوں۔ گو تعلیم کا مضمون ایسا وسیع ہے کہ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کے سب پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے تاہم اسے ختم کرنے سے پیشتر چند لفظوں میں مابلا قوم کی تعلیم کے بارہ میں کچھ عرض کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اُس کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ مئی ۱۹۲۶ء میں بمقام تیلی چیری جو تعلیمی کانفرنس مسلمانوں کی بنام کرالہ کانفرنس ہوئی اس کے صدر ہمارے دوست مسٹر عبدالحمید حسن صاحب تھے جو آپ کی کمیٹی استقبالیہ کے سرگرم سیکرٹری اور آپ کی تعلیمی انجمن کے ناظم ہیں اُنھوں نے تعلیم مابلا سے اپنے خطبۂ صدارت میں بحث کی تھی۔ انھیں اس بارے میں مجھ پر فوقیت حاصل تھی یعنی ان کو مقامی حالات کا علم تھا۔ میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصود اُن معلومات پر اضافہ کرنا نہیں ہوگا جو انھوں نے بیان کی تھیں لیکن میرے لئے اس مضمون کا تذکرہ اس خیال سے ضروری ہے کہ یہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اہم ہے اور بعض پہلوؤں سے یہ سارے ہندوستان کے لئے ایسی اہمیت رکھتا ہے جس کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ قوم مابلا کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے اور وہ مالابار میں آباد ہے۔ احاطۂ مدراس میں مسلمانوں کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ یہ قوم ہے۔ جس علاقے میں یہ رہتے ہیں اُسے جنوبی ہند کے خوب ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے اگر اس کو فردوس سے تشبیہ دیں تو اس کی یہ خوبی کس کی محنت کا نتیجہ ہے؟ انھیں جفاکش۔ غریب مابلاؤں کی مشقت نے وہاں یہ خوبصورتی پیدا کی ہے مگر وہ خود صرف مزدور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے پاس نہ زر ہے نہ زمین اور نہ ہی وہ دولت تعلیم سے بہرہ ور ہیں۔ وہ ایسے مزدور ہیں جنھیں موروثی مزارع ہونے کا بھی حق حاصل نہیں۔ اور جیسا کہ حمید حسن صاحب نے اپنے خطبہ میں بیان کیا تھا "لیکن جو جماعتیں خاص طور پر پست حال سمجھی جاتی ہیں ان کی مشکلات ان سے بھی زیادہ ہیں۔ کیوں کہ اُن کے پاس بھی کہیں نہ کہیں چھوٹے ٹکڑے زمین کے ہوتے ہیں" ابتدائی تعلیم میں گو صوبۂ مدراس کے دوسرے مسلمانوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ مگر مابلا لوگ اس میں بھی بہت پیچھے ہیں۔ ثانوی تعلیم میں ان کے صرف دو ثانوی

مدرسے ہیں - اور ۱۹۲۶ء میں ان میں صرف ۲۳۲۴ طالب علم تھے - ابتدائی تعلیم کے لئے ان کو ۲۰۳۰ وظیفے دیئے گئے ہیں جو ایک روپیہ فی کس کے حساب سے ہیں اور ساٹھ وظیفے ڈیڑھ روپے والے آپ ہی فرمائیے کہ ان کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس قلیل مدد سے کیا ہو سکتا ہے - میری رائے میں مسلمانان مدراس حق بجانب ہیں - اگر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ وظائف تو قوم ماپلا کی آبادی کے حاشیہ کو بھی نہیں چھوتے اور ان کا یہ مطالبہ بجا ہے کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ ماپلاؤں کے لئے کافی تعداد مدرسوں کی قائم کرے اور ایک کالج کھولے - جو اُن کے لئے مخصوص ہو - اور جس کے ساتھ ایک دار الاقامہ (ہوسٹل) بھی ہو - تیلی چری کی کانفرنس میں ان مطالب کے متعلق کئی تجاویز پیش ہو کر پاس ہوئی تھیں - میں انھیں دہرا کر آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا - مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اس کانفرنس میں ان سب پر دوبارہ زور دیں گے تاکہ وہ تجاویز گورنمنٹ مدراس کے پاس مسلمانان ہند کی تائید مزید لے کر پہنچیں - مجھے معاف رکھا جائے اگر میں یہ کہوں کہ اس صوبہ کی گورنمنٹ نے اس مسئلہ کی اہمیت پر پوری توجہ نہیں کی - اور کسی قدر تنگ نظری سے اُسے دیکھا ہے - جہاں سوال یہ ہو کہ جہالت کی قوتوں کا سامنا ہے اور ان کا مقابلہ کرنا ہے - وہاں خرچ سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے - مالابار ہندوستان کے ان علاقوں میں سے ہے جہاں اب تک نہایت تاریکی اور جہالت پھیلی ہوئی ہے - پس ہر سرگرم حامی تعلیم کی عملی کوششوں کے لئے وہ بہترین میدان ہے - گزشتہ دنوں میں جو افسوس ناک ہنگامہ وہاں ہوا - اور جس سے اس قدر تباہی وہاں پھیلی - اور جس کے سبب ماپلا لوگ اس وقت سخت مصیبتیں جھیل رہے ہیں - اس کا سب سے بڑا سبب اُن کی جہالت تھی - بیشک جو کچھ اُنھوں نے کیا اس کے لئے وہ مورد الزام ہیں مگر میں بطور ایک دور سے مشاہدہ کرنے والے شخص کے اتنا کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ الزام کے مستحق محض وہی نہیں بعض لوگ جن کی معلومات بہتر تھیں - اور جو یہ سمجھ سکتے تھے کہ ماپلا آسانی سے بھڑک اُٹھنے والی قوم ہے اُنھوں نے اس بھُس میں چنگاری ڈال دی - یہ قوم فطرتی طور پر جوشیلی واقع ہوئی ہے اور اس وقت کے جوش کا شکار ہو گئی اوروں کو بھی ایذا دی - اور اپنے آپ کو بھی بگاڑ لیا - مسٹر حمید حسن صاحب نے اُنھیں بہت معقول نصیحت کی تھی - کہ اُنھیں اب یہ لازم ہے کہ جن لوگوں کے ہاں وہ کام کرتے ہیں ان سے پھر مل جائیں اور اُنھیں کہیں کہ گزشتہ را صلواۃ آئندہ را احتیاط - صاحب موصوف نے اُنھیں یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے ہندو ہمسایوں کے متعلق ایسا رویہ اختیار کریں جس سے گزری ہوئی تکالیف کی یاد محو ہو جائے اور اسی طرح برٹش گورنمنٹ سے بھی اچھے مراسم پیدا کریں - امید ہے کہ قوم ماپلا اس نصیحت پر عمل کرے گی اور جو تغیر ان کے رویہ میں ہندو صاحبان اور گورنمنٹ کے متعلق پیدا ہو گا اس کا ان دونوں کے دلوں پر اچھا اثر ہو گا - اور وہ ان کی ترقی سے ہمدردانہ دلچسپی لیں گے -

اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے شاید یہ بیجا نہ ہو۔ اگر میں ایک اسلامی انجمن یعنی جمعیت دعوت تبلیغ اسلام کا ذکر کروں جس کا مرکز کالی کٹ (مالابار) میں ہے۔ اور جس نے پچھلے پانچ سال میں ماپلاؤں کی بہت مدد کی ہے۔ یہ جمعیت مالابار میں اس وقت آئی جب وہاں کے مسلمان بہ سبب فسادات کے اور اس کے بعد بوجہ سیلاب کے بہت مصیبت زدہ اور محتاج امداد تھے۔ اس جمعیت نے عام چندہ کیا۔ اور یہ امر خاص قابل ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے پچاس ہزار روپیہ کے فیاضانہ عطیہ سے امداد دی۔ اس جمعیت نے امدادی کاموں پر ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان ۸۵۳۵۹ روپئے خرچ کئے تعلیم پر ۸۰۰۵ روپیہ اور مذہبی اشاعت پر ۲۷۰۱ روپیہ اور یتیم خانہ پر ۳۶۹۸۰ روپیہ صرف ہوا۔ ان رقوم کے علاوہ ۱۶۴۱۷ روپے خرید جائداد پر لگائے۔ اور کل ایک لاکھ پچاس ہزار ایک سو بانوے روپیہ اس عرصے میں خرچ کیا۔ اس مفید کام کے لئے سب سے زیادہ داد کے مستحق اس جمعیت کے سیکرٹری مولوی محی الدین صاحب بی اے ہیں۔ جنھوں نے یہ اعداد مجھے بہم پہونچائے۔ مجھ کو اس امر سے خاص طور پر مسرت ہے کہ مولوی محی الدین صاحب ہمارے صوبۂ پنجاب کے رہنے والے ہیں جو کام انھوں نے بحیثیت ایک مشنری کے اپنے سے اتنی دور آکر جہاں ان کا کوئی خاص ذاتی اثر بھی نہ تھا۔ انجام دیا ہے۔ اس کے لئے وہ مبارکبادی کے مستحق ہیں۔ یہ جمعیت سب خیر خواہان قوم کی توجہ اور امداد کی مستحق ہے۔ اور اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر کوئی پورے طور پر پبلک کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہو تو کیا کچھ کر سکتا ہے۔

حضرات! میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لیا۔ اور اب اپنے معروضات کو ختم کرتا ہوں میں ایک مرتبہ پھر صدق دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری عزت افزائی فرمائی اور مزید موجب تشکر یہ ہے کہ آپ نے اس قدر تحمل اور توجہ سے میرے خطبہ کو سنا۔ مسلمانوں کے تعلیمی اغراض و مقاصد پر جو سرسری نظر میں نے ڈالی ہے اور جو چند عملی اشارات کئے ہیں اگر ان سے آپ کو اس بارے میں کچھ مدد ملے کہ جنوبی ہند اور دیگر اطراف ہند میں مسلمانوں کی تعلیم ترقی کرے تو مجھے شمالی ہند سے یہاں تک آنے اور آپ کے سامنے کچھ عرض کرنے کا کافی صلہ مل جائے گا۔ اور اگر کانفرنس کا اجلاس اس قسم کی پائدار تحریک پیدا کر دے جو ۱۹۰۱ء کی کانفرنس نے پیدا کی تھی، تو جو زحمت آپ سب نے اس بڑے مجمع کے انعقاد کے لئے گوارا فرمائی ہے وہ بیکار نہ جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کا عروج اس کا کافی معاوضہ ہوگا۔

باالخیر

وقار حیات

یعنی

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی حاجی محمد مشتاق حسین صاحب سابق ریونیو سکرٹری گورنمنٹ نظام آنریری

سکرٹری محمڈن کالج و بانی آل انڈیا مسلم لیگ

کی

نہایت مفصل مکمل دلچسپ و پُر از معلومات سوانح عمری جو ایجوکیشنل کانفرنس نے

علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی

یہ سوانح عمری درحقیقت مسلمانوں کی گزشتہ پنجاہ سالہ زمانہ کی تعلیمی سیاسی اور قومی تاریخ اور عجیب و غریب

واقعات کا مرقع ہے۔ حیدرآباد، علی گڑھ تحریک اور اسلامی پالیٹکس کے متعلق بہت سے پُراسرار و

مخفی حالات اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں جو کسی دوسرے طریقہ سے نہیں معلوم ہو سکتے

معہ مقدمہ

نوشتہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

کاغذ سفید تقطیع ۲۰×۲۶ کتابت طباعت عمدہ ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحے معہ فوٹو نواب صاحب

قیمت پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ:- صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ